Page Missing Book Only

DAMAGE BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222257

UNIVERSAL
LIBRARY



OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵۴۳۳ Accession No. ۱۵۱۲۷

Author ملک رج م - ق

Title قلی

This book should be returned on or before the date last marked below.

پہلا باب

گجری نے جھونپڑے کے برآمدے سے آواز دی

"منو ہے منو! او منوڑے!"

یہ نیچا سا جھونپڑا گاؤں سے کوئی سو گز ہٹ کر پہاڑ کے دامن والی وادی میں بالکل الگ تھلگ کھڑا تھا۔ گجری کی عقابی آنکھیں گاؤں کے مکانوں کی بھیگی بھیگی چھتوں سے گزرتی ہوئی پہاڑ سے نیچے ریت کی گھومتی ہوئی پگڈنڈی پر دور دور تک نگاہیں دوڑا رہی تھیں، کانگڑا کانپتا ہوا سورج اپنی ظالم کرنیں برسا رہا تھا۔ اور منو کا کہیں پتہ نہ تھا۔

"منو! ہے منو! او منوڑے! کہاں مر گیا۔ کدھر غائب ہو گیا کم بخت! چل ادھر۔ تیرے چاچا کو جانے کی جلدی ہے اور تجھے بھی ان کے ساتھ جانا ہے۔" وہ کرخت آواز میں زور سے پھر چلائی۔ اس کی نگاہیں آم کے باغ کے بھی پرے، دریائے بیاس کے چمکیلے چاندی ایسے کنارے تک پہنچیں اور پھر غصہ میں بھری ہوئی اس جھاڑ جھنکاڑ میں الجھ کر رہ گئیں جو پانی کے

دونوں جانب ہریالی مائل بھینی پہاڑیوں کے سامنے اُگا ہوا تھا۔

"منو! او منو!" ۔ اس نے عاجز ہو کر پھر پکارا۔ نفرت اور غصہ کے اس عالم میں وہ اپنی آواز کو جتنا بھی بلند کر سکتی تھی اتنا بلند کر کے اس نے آواز دی۔

"ارے کہاں مر گیا؟ کمبخت منحوس ماں باپ کو کھا کر بیٹھا ہے، چل ادھر آ اور کسی طرح جا بھی چک" ۔ وادی میں یہ زبردست چیخ اپنی پوری قوت کے ساتھ گونجی اور اپنی تمام تلخی سمیت منو کے کانوں سے ٹکرائی۔

اس نے سنا تو مگر جواب نہیں دیا۔ اس نے بس سایہ دار درخت کی آڑ سے ذرا جھانک کر دیکھ لیا کہ سورج لہنگا اب جھونپڑی میں غائب ہو چکا ہے۔ وہ بیاس کے کنارے جانور چرا رہا تھا۔ اس کی بھینسیں اور گائیں کنارے کے گدلے چھچھلے پانی میں اتر کر صبح کے تپتے ہوئے سورج کی گرمی سے بچنے کے لئے ٹھنڈے پانی میں بیٹھی جگالی کرنے لگی تھیں اور وہ کھیل میں لگ گیا تھا۔

گاؤں کے زمیندار کا لڑکا جے سنگھ، جس کے کپڑے اور ہاتھ منھ ہمیشہ صاف ستھرے رہا کرتے تھے، منو کے ننگے بدن میں کہنی سے ایک ٹھوکا مار کر بولا۔ "تمہاری چچی آواز دے رہی ہے نا تمہیں سنائی نہیں دیتا۔ کچھ تمیز بھی ہے گنوار کہیں کے۔ چچی ہے کہ چلا چلا کر حلق پھاڑ رہی ہے اور تم ہو کہ جواب تک نہیں دیتے" ۔ جے سنگھ دو حاصل گاؤں کے لونڈوں لشٹا، بشمبر وغیرہ کی سرداری کے لئے ہمیشہ منو کے مقابلے پر تیار رہتا تھا۔ اُسے یہ بات بھی معلوم ہو گئی تھی کہ منو آج گاؤں سے شہر چلا جائے گا اور اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد اسے اپنے رستے سے ہٹا دے۔

موٹا لشٹن بولا "ارے ابھی سے جا کر کیا کرے گا۔ ضرور تیری چچی تجھے

کسی کام سے کہیں بھیجنا چاہتی ہوگی۔" پھر وہ تمسخرانہ انداز میں جے سنگھ کی طرف مڑا اور کہنے لگا۔ "اچھا تو وہ اپنی چچی کے پکارنے پر گھر نہیں گیا تو تم اُسے گنوار ہی کہنے لگے، اور اپنی تو کہو۔ جب تمہاری ماں تمہیں دوپہر کو باہر کھیلنے کو منع کرتی ہے اور گھر میں بیٹھنے کو کہتی ہے تو تم اسے کیوں بُرا بھلا کہتے ہو؟ تمہارا باپ تو تمہیں دو آنے روز خرچنے کو دیتا ہے پھر بھی تم اسکول جانے سے جان چُراتے ہو اور ہم تو اسکول بھی جاتے ہیں اور چھٹیوں میں جانور بھی چراتے ہیں۔ اب یہی بتا دو کہ یہاں بیٹھے بیٹھے تم اینڈ نہیں رہے ہو تو اور کیا کر رہے ہو۔ تم میں تو اتنی ہمت بھی نہیں کہ دو چار آم ہی چرا لاؤ۔ اب منو نے یہ آم توڑے ہیں تو جانے سے پہلے اسے دو چار تو چوس لینے دو"

"میں آم چرایا نہیں کرتا" جے سنگھ بولا۔ "میں خریدتا ہوں"۔ اور پھر وہ ٹیانیک بن کر کہنے لگا۔ "میں تو صرف اس لئے کہتا تھا کہ اُسے جانا چاہئے کیونکہ اس کی چچی بڑی چڑچڑی ہے وہ ہم سب کو بُرا بھلا کہے گی کہ منو کو کیوں روکے رکھا، اسے اپنے چچا کے ساتھ شہر جانا ہے نا؟"

"تو کیا یہ بات سچ ہے کہ تم شہر جا رہے ہو؟" ننھے بشمبر نے پوچھا وہ بڑا جوشیلا تھا

"ہاں بس آج جا رہا ہوں"، منو نے جواب دیا۔ اس کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے تھے

"لیکن تم تو ابھی چودہ ہی برس کے ہو اور اسکول میں بھی پانچویں ہی کلاس تک پہنچے ہو" بشمبر نے زور سے کہا

"میری چچی چاہتی ہے کہ میں پیسے کمانے شروع کر دوں"۔ منو بولا "میرا چچا کہتا ہے اب میں بڑا ہو گیا ہوں مجھے اپنی روزی خود پیدا کرنی چاہئے

شام پور میں میرا چچا جس بینک میں کام کرتا ہے وہاں کے ایک بابو کے گھر اس نے میرے لئے نوکری ڈھونڈ لی ہے۔"

"شام پور میں رہنا تو بڑا ہی پُر لطف ہوگا" جے سنگھ بولا۔ "اے اب منو سے حسد سا ہوتا جا رہا تھا کیونکہ منو کی آنکھوں میں اب بڑائی جھلک رہی تھی۔ اب وہ شہر میں رہے گا ——— جہاں کھانے کے لئے عمدہ چیزیں پہننے کے لئے عمدہ کپڑے اور کھیلنے کے لئے خوبصورت کھلونے ملتے ہیں۔

منو مسکرا دیا۔ مگر اس کی مسکراہٹ زبانِ حال سے کہہ رہی تھی "اگر آج اس گاؤں میں یہ میرا آخری دن نہ ہوتا تو تمہارے جبڑے پر ایسا مکا رسید کرتا کہ آئندہ کبھی تم گاؤں کے لونڈوں کی سرداری کا خیال بھی نہ کرتے"

منو اگرچہ کمسن تھا مگر وہ اچھی طرح معلوم تھا کہ جے سنگھ کا باپ ہی اس کی تمام مصیبتوں اور بدبختیوں کا ذمہ دار ہے۔

اس نے سنا تھا کہ کس طرح زمیندار نے اس کے باپ کی پانچ ایکڑ زمین پر قبضہ کر لیا تھا کیونکہ بارش کی کمی کی وجہ سے فصل خراب ہوئی تھی اور لگان پر پہلے سے جو سود تھا وہ ادا نہ ہو سکا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کس طرح اس کا باپ مایوسی اور تلخی کے عالم میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر آخر چل بسا اور اس کی ماں کو ایک کمسن دیور اور ایک گود کے بچے سمیت، پیسے کا محتاج چھوڑ گیا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ کس طرح اس کی ماں چکی پیسا کرتی تھی اور اس چکی کے پاٹ کتنے بھاری اور کمر درد سے تھے اور کس طرح وہ رات دن اسے چلاتی رہتی تھی کبھی دہنے ہاتھ سے کبھی بائیں ہاتھ سے۔ یہ نقشہ اس کے ذہن میں اچھی طرح جم چکا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور نقشہ بھی تھا جب اس نے اپنی ماں کو زمین پر مرا ہوا پڑا دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک غمگین وحشت طاری

روئی خریدی، کپڑا بنایا اور پھر زیادہ منافع لے کر بیچ دیا۔ ان میں سے کتنے ہی بابو ہیں جو دفتروں میں کام کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک بابو کے گھر تجھے نوکری کرنی ہے،،

"کیسا عجیب لگتا ہے،، منو بولا۔ اور پھر پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اور اس کا دھیان دانا بائیوں کی دکانوں کی طرف لگ گیا جہاں بڑی بڑی دیگچیاں کھدبدا رہی تھیں اور ان میں سے ایسی لذیذ خوشبو نکل رہی تھی جیسی منو نے عمر بھر نہ سونگھی تھی۔ مٹھائیوں کی دکان میں رس بھری مٹھائیاں نیچے سے اوپر تک گنجی ہوئی تھیں۔ عام دکانوں میں بر کے غبار سے بنتھی منی گلابی گڑیاں اور پھولے پھولے کھلونے کے خرگوش سجے ہوئے تھے۔ ایک دکان دار زور زور سے آواز لگا رہا تھا "ٹھنڈا میٹھا برف،، اور چھوٹی چھوٹی خرطومی شکل کی قلفیاں ٹین کے سانچوں سے پتوں پر الٹ الٹ کر گاہکوں کو دیتا جا رہا تھا۔ سامنے لکڑی کے بنچوں پر گاہک قطار دار بیٹھے تھے۔ منو کا بھی دل چاہنے لگا کہ ایک قلفی چکھی جائے مگر اس کی ہمت نہ پڑی کہ اپنے چچا سے کہے کہ مجھے لے دو۔ اور پھر اس کا دھیان ایک ٹین کے بکس کی طرف ہو گیا جس میں سے کچھ بجنے گانے کی صدا آ رہی تھی۔ اس بکس پر ایک کالے رنگ کا گول پہیہ گھومتا جا رہا تھا۔ گانے کی آواز سن کر ایک مرتبہ تو وہ ذرا سکڑ گیا۔ لیکن جب آواز جانی پہچانی پڑنے لگی تو ڈر کر ذرا پیچھے کھسکا اور پھر ہمت کر کے ذرا آگے بڑھا۔

"چل چل۔ نہیں یہاں کہیں بھیڑ میں کھو جائے گا،، اس کے چچا نے دور سے پکارا

"یہ کون گا رہا ہے؟ اس بکس میں آدمی کیسے گھس گیا،، منو نے پوچھا

دکان دار ہنس پڑا اور منو کی طرف حقارت سے دیکھا۔

"اوئے۔ جلدی چل جلدی اُلو کہیں کا،، دیا رام چیخا۔ "یہ فونوگرام ہے

بکس میں کوئی آدمی تھوڑا ہی بیٹھا ہے مشین ہی گا رہی ہے "

اب منو میں بھلا اتنی ہمت کہاں کہ یہ بھی پوچھے کہ مشین کیسے گانے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو بادل ناخواستہ اس عجیب و غریب چیز سے جدا کیا اور چچا کے پیچھے ہو لیا۔ ابھی وہ چند گز ہی گیا ہوگا کہ اس کی نگاہیں ایک عجیب و غریب منظر پر جم کر رہ گئیں۔ ایک آدمی کچھ چھوٹے چھوٹے کھلونے کے کتے لئے بیٹھا تھا۔ اور جب وہ ان کتوں کے پہلو میں کچھ جھن جھن کر کے انھیں سڑک پر چھوڑتا تھا تو وہ ناچنے اور دوڑنے لگتے تھے۔ یکایک منو کے بالکل پیچھے گھنٹی کی آواز "ٹن ٹن ٹن" جب تک منو ہشیار ہوا اور دیکھے، ایک دو پہیوں والا گھوڑا بڑی تیزی سے جھپٹتا ہوا اس کی طرف آیا۔

"ابے دیکھتا نہیں ہے لاٹ کے بچے" اس دیو پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے چیخ کر کہا۔ اور پھر اس کے چچا نے جو دوڑ کر واپس ہوا تھا، اس پر گالیوں کی بوچھار کر دی۔ "ابے مرے گا گیا حرامی۔ گدھے کہیں کے"

اتنے میں کھلونے بیچنے والا آ پہنچا اور منو کو بچاتے ہوئے کہنے لگا۔ "اٹھ وہ تو چاہتا تھا کہ اپنی بائیسکل میرے کتوں سے آگے نکال دے۔ لیکن اس نے مجھ سے کہا کہ ریس شروع ہو گئی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں آپ کچھ خیال نہ کیجئے، آخر ہوا ہی کیا؟ کسی کا کچھ نہیں گیا۔ اور سبھی رہی گالی کی بات تو گالی کے ساتھ تو بس یہ کرنا چاہیے کہ اس کان سے سنی اور اس کان سے نکال دی" یہ بات سن کر منو کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لیکن اس کے چچا نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ دیا اور چیخ کر بولا "جلدی نہیں چلا جاتا بدمعاش! دیکھ کے نہیں چلے گا تو یاد رکھنا مرتے دیر نہیں لگے گی"

منو رونے لگا۔ اور منہ بنائے بایوس اپنے چچا کو دل ہی دل میں کوستا

اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ وہ شخص جو اس لوہے کے گھوڑے پر سوار تھا اور جس کی بدولت منو نے مار کھائی تھی کوئی پچاس گز آگے جا کر ایک گائے کے بچھڑے سے ٹکرا گیا۔ بچھڑا مزے سے چوراہے پر پھلوں کی ٹوکریوں کے آس پاس لوگوں کی بھیڑ میں گھوم رہا تھا کہ وہ حضرت جا کر اس سے ٹکرائے اور گرے۔ اب منو کو کسی قدر اطمینان ہو گیا اور وہ سب کچھ بھول کر آگے بڑھنے لگا البتہ اب وہ کسی قدر محتاط ضرور ہو گیا تھا۔ اب وہ ایک آنکھ اپنے چچا پر رکھتا تھا جو آگے آگے چلا جا رہا تھا، اور ایک آنکھ سے دکانوں کی قطاروں کو دیکھتا جاتا تھا اور کبھی کبھی پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لیتا تھا کہ پھر تو کہیں ویسا ہی لوہے کا گھوڑا نہیں آ رہا ہے جسے کھلونے والے نے بالکل کہا تھا۔ پتلی پتلی سڑکوں پر دونوں طرف دکانوں کا جمگھٹ تھا۔ اور یہ سلسلہ اسی وقت ٹوٹتا تھا جب کہیں کہیں کوئی اندھیری گلی یا تنگ و تاریک محلہ پڑ جاتا تھا۔ کہیں کہیں، کسی کسی حصہ پر دھوپ بھی چمکتی ہوئی نظر آ جاتی تھی۔ اور منو کو خاص دلچسپی تو اس وقت ہوتی تھی جب کوئی مرد ریشمی قمیص اور دھوتی اور زری کا مدار کے جوتے پہنے گذرتا تھا یا عورتوں کا کوئی غول ہاتھ ہلاتا، کمر لچکاتا، سیر، گلابی اور بسنتی رنگ کے ریشمی برقعے پہنے گذرتا تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ خواب کی دنیا میں چل پھر رہا ہے۔ جہاں تمام چیزیں شاندار اور آب و تاب والی ہیں۔ یہ دنیا، پہاڑوں کی دنیا سے کس قدر مختلف تھی ابھی اسے اس دنیا کی اہمیت اور اس کے ـــــ حال کی بھلا کیا خبر تھی۔ اس کا چچا ایک بڑی سی شاندار سنگ مرمر کی عمارت کے دروازہ پر رک گیا کہ منو بھی آ جائے اور منو کا تو دل اس عمارت کو دیکھ کر ہی دھڑکنے لگا تھا کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے!

امپریل بینک کے بڑے سے ہال میں چاروں طرف بڑے بڑے

شاندار ستون کھڑے تھے، اور جب وہ دونوں اس ہال میں داخل ہوئے تو منو نے اپنے چچا کو کہتے سنا "سلام پیردین"

"سلام۔ سلام۔ تم دیر سے آئے۔ بابو صاحب خفا ہو رہے تھے کہ ان کا دن کا کھانا لانے کے لئے کوئی نہیں ہے" پیردین نے کہا اور پھر وہ کھانے لگا جیسے اُسے دمہ ہو اور اپنی مہندی سے رنگی ہوئی داڑھی اور زردوزی کے سرخ کوٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ بھی منو کے چچا کا سا لال زردوزی کا کوٹ پہنے تھا۔ منو نے پہچان لیا کہ یہی وہ چپراسیوں کا جمعدار ہے جس کا ذکر اس کا چچا گھر پر کیا کرتا تھا۔

"تو بابو صاحب دفتر آ گئے ہیں؟" دیا رام نے کہا تھا۔ اب اس کے لہجے میں کافی اعتماد تھا کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ بابو کو نوکر کی سخت ضرورت ہے اور اس کے بھتیجے کو یقیناً نوکری مل جائے گی۔

"ہاں ہاں آ گئے ہیں" پیردین نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔ "لیکن آج روپیہ کی تھیلیاں پلٹن پہنچائی ہیں۔ ولایت کی ڈاک بھی آ رہی ہے اور لالہ لوگوں کو اپنے کام کی الگ جلدی پڑی ہے۔ اس لئے ذرا جلدی کرو"

"بہت اچھا میاں صاحب" دیا رام نے جواب دیا۔ وہ اپنے ساتھی کو میاں صاحب کہہ کر خوش کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ عام طور پر شریف مسلمانوں کو میاں صاحب کہا جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے بھتیجے کی طرف مڑا اور بولا

"چل میرے ساتھ آ"

منو اپنے چچا کے پیچھے ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرہ میں کافی ٹھنڈک تھی اور ہر طرف پیتل کے چمکدار جنگلے لگے تھے۔ ان جنگلوں کے

چاروں طرف بہت سے لوگ کھڑے تھے اور بڑے شوق سے چاندی کے سکوں کی کھنکھناہٹ اور صاف ستھرے نوٹوں کی سرسراہٹ سن رہے تھے پھر یہ دونوں ایک اور کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں چھت کے بیچوں بیچ سے ایک لمبی سی لوہے کی سلاخ لٹکی ہوئی تھی اور اس میں دو پنکھے لگے ہوئے تھے۔ جو بڑی تیزی سے گھوم رہے تھے۔ اس کے نیچے ایک بڑی سی میز کے پیچھے ایک کرسی پر ایک چھوٹا سا آدمی بیٹھا تھا۔ جس کرسی پر وہ بیٹھا تھا وہ اس کے لئے ضرورت سے زیادہ بڑی تھی۔ اس آدمی کا چہرہ کچھ عجیب ٹیڑھا میڑھا تھا، سانولا رنگ، بشرہ سے کچھ ظاہر نہ ہوتا تھا۔ البتہ چپٹی ناک کافی واضح تھی، کلوں پر سفید سفید داغ سے تھے۔ پتلی سی کالی مونچھ نیچے کو لٹکی ہوئی تھی اور اس کا ایک ایک بال الگ الگ جان پڑتا تھا۔ دیارام نے پہلے پائدان پر اپنے پاؤں پونچھے اور پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "بابو جی سلام"۔ بابو جی نے اپنے سامنے رکھے ہوئے کاغذوں پر سے گردن اٹھائی مگر کچھ بولے نہیں۔

دیارام نے منو کے کان میں کہا "ابے بابو جی کو رام رام کر یا سلام کر"، اگرچہ یہ بات کان میں کہی گئی تھی مگر سنائی دے سکتی تھی۔ منو نے دھیرے سے دونوں آداب بڑبڑا کر ایک ساتھ کہہ دیئے۔ وہ بوکھلا گیا تھا۔ کھنکھناتے روپوں، سرسراتے نوٹوں، پیتل کے کٹہروں، کرسیوں، میزوں، قالینوں اور تیزی سے گھومتے ہوئے پنکھوں والی یہ دنیا اس کے لئے کیسی عجیب تھی۔ اس کا دماغ چکرا سا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے سر اٹھا کر اس شخص کو نہیں دیکھا جسے اس نے مخاطب کیا تھا۔ کچھ دیر ایک عجیب پریشان کن سی خاموشی طاری رہی۔ بابو جی کے چہرے پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جو فوراً ہی حقارت میں بدل گئی۔ مگر منو نے اس مسکراہٹ کو دیکھ لیا اور گھبراہٹ اور ڈر کے مارے سر جھکا لیا۔

"مہاراج" رام نے خوشامدانہ لہجے میں حضور عالی کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ "میں اپنے بھتیجے کو آپ کے یہاں نوکری کے لئے لایا ہوں"

اور بابو جی منو کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ "اچھا تو یہ ہے تمہارا بھتیجا؟"

"جی جناب" منو نے اپنے چچا کو کہتے سنا، اور پھر حکم صادر ہوا "ہاتھ جوڑ کر بابو جی کو سلام کرو گنوار کہیں کے"

لیکن منو تو بابو جی کے جوتے دیکھ رہا تھا جن کی نوکیں میز کے نیچے سے نکلی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ اور جب وہ نہایت عجز و انکساری سے دوہرا جھکا کھڑا تھا تو دراصل وہ یہ سوچ رہا تھا کہ شاید کبھی میں بھی ایسے جوتے لے سکوں گا۔

"رام رام" وہ ایک دم بول اٹھا۔ لیکن اسے ذرا دیر ہو گئی۔ بابو جی نے اس کا یہ مودب سلام دیکھا ہی نہیں کیونکہ میز پر داہنی طرف جو سیاہ مشین سی رکھی ہوئی تھی اس میں سے گھنٹی کی ٹرن ٹرن ہونے لگی تھی اور بابو جی ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"یس سر، یس سر" وہ اس چونگے میں بول رہے تھے جو ایک بل کھائی ہوئی رسی میں بندھا تھا۔ "گٹ پٹ۔ گٹ پٹ۔ یس سر۔ یس سر" بابو جی وہ چونگا اپنے بائیں کان کے پاس لگائے ہوئے تھے۔ منو سوچنے لگا کہ شاید یہ زبان جو اس کے ہونے والے مالک بول رہے ہیں یہی وہ زبان ہے جس کا ذکر گاؤں کے ماسٹر صاحب کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جو لوگ بابو بننا چاہیں ان کے لئے اس زبان کا جاننا ضروری ہے۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر اسے یاد آگیا ٹھیک ہے یہ انگریزی زبان ہے۔

پھر بابو جی کی باتوں سے ہٹ کر اس کا دھیان ان کے کپڑوں کی طرف

گیا اور وہ دل ہی دل میں ان کے کپڑوں کو سراہنے لگا۔ ان کا وہ اونچا سفید اور سخت کالر، سر پر رکھی ہوئی میناز نما لال مخمل کی زریں کلاہ اور اس کے چاروں طرف بندھا ہوا بڑا سا صافہ، خاکی کوٹ اور کوٹ کی وہ بڑی بڑی جیبیں مانو روپیہ رکھنے کے تھیلے ہوں، چوڑی موہری کا سفید پاجامہ اور جوتے ——— وہ جوتے ——— وہ سیاہ جوتے!

منو دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اگر میرے پاس بھی ایسے جوتے ہوتے تو میں کتنی جلدی چل کر یہاں پہونچ سکتا اور میرے پیروں میں چھالے بھی نہ پڑتے!

"اچھا" بابو جی کی آواز پھر سنائی دی "اسے میرے گھر لے جاؤ اور [illegible] کے حوالے کر دو"

دیا رام ہاتھ جوڑ کر دوہرا ہو گیا۔ پھر اس نے منو کو گھسیٹ کر بابو جی کے سیاہ جوتوں کے خیال سے چونکایا اور امپیریل بینک آف انڈیا کے صاف ستھرے باقاعدہ سجے ہوئے احاطے سے باہر ایک لمبی گھومتی ہوئی سڑک پر لے چلا۔

اب وہ ایک ایسے محلہ میں داخل ہوئے جو شہر کے نواح ہی میں تھا۔ یہاں بہت سے چھوٹے چھوٹے گھر بلکہ کوٹھریاں اور کوارٹر تھے جن میں اکثر میں کھڑکیاں بھی نہ تھیں۔ کوئی بڑا تھا کوئی چھوٹا اور سب ایک دوسرے کے پاس پاس لگے ہوئے تھے۔ بہرحال شہر کے نواح کے لئے یہ گھر بھی غنیمت تھے۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ کہیں کہیں ٹوٹی ہوئی بوتلیں، ٹین کے زنگ لگے ڈبے، اور ٹپکتی ہوئی چھید دار بالٹیاں پڑی لڑھک رہی تھیں، کہیں مینڑی کے چھلکے اور کاغذ پڑے سڑ رہے تھے تو کہیں اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر تھے جن پر جا بجا کائی جم گئی تھی گھروں کی اس قطار کے سب سے آخر میں بابو جی کا گھر تھا، ایک منزلہ گھر جس کے

سامنے ایک برآمدہ تھا اور برآمدے کے سامنے ایک مغربی قسم کا سائن بورڈ لگا تھا جس کے ذریعہ ایشیائی تہذیب و تمدن کے دعویداروں کو خالص مغربی طرز میں بتایا جا رہا تھا کہ "بابو ناتھو مل سب اکاؤنٹنٹ امپیریل بینک شام نگر" کی یہ شان ہے۔

سامنے ہی پہاڑی سڑک کی دوسری طرف، ذرا بلندی پر، کچھ پیلے پیلے بنگلے نظر آ رہے تھے۔ جو منو کو بہت ہی پراسرار معلوم ہوئے، کیونکہ یہ بنگلے چاروں طرف سے ٹھنڈے سایہ دار درختوں سے گھرے تھے، سبز سبز گھلوں میں پام کے درخت رکھے تھے۔ سبز ٹہنیاں سلیقہ سے کٹی ہوئی چاروں طرف لگی تھیں اور ان کے درمیان ہموار مخملی گھاس کے تختے تھے، رنگ برنگے پھولوں کی بہتات تھی۔ منو سوچنے لگا کہ یہاں کون لوگ رہتے ہوں گے۔ لیکن فوراً ہی اس کی نظر اس بلندی سے نیچے آ کر ایک آدمی پر ٹھہر گئی جو سامنے سے آ رہا تھا۔ اس کا بڑا سا چہرہ سرخ رنگ کا تھا اور وہ ایک عجیب سی ٹوکری نما خاکی رنگ کی ٹوپی پہنے تھا جس سے اس کا چہرہ کافی چھپ گیا تھا۔ موٹے سے سرخ گلے میں ویسا ہی کالر تھا جیسا بابو جی پہنے تھے، خوبصورت جیکٹ جو کسی قدر مضحکہ خیز ضرور تھی کیونکہ وہ نہ تو اس کے بھاری چوتڑوں کو پیچھے سے پوری طرح ڈھک سکتی تھی اور نہ ہی توند پر اچھی طرح آ سکتی تھی، خاکی رنگ کے ترکیبس سے اس کے کولھے اور بھی زیادہ نمایاں ہو رہے تھے اور وہ پاؤں میں بڑے عجیب سے جوتے پہنے تھا جو اس کے گھٹنے تک آتے تھے۔ منو نے اپنے دل میں سوچا۔ "ضرور یہ کوئی انگریز ہوگا"

اتنے میں اس کے چچا نے جھڑاپ سے اپنے دہنے پاؤں کی ایڑی بائیں پاؤں سے ملائی سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا اور بولا "سلام حضور"

منو کی اتنی مجال کہاں تھی کہ آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے کہ اس بارعب ہستی نے کیا جواب دیا ہاں اس نے ہوا میں ایک چھڑی اٹھتی ہوئی دیکھی اور پھر نظریں جھکا کر نیچے شہر میں مکانوں کی سپاٹ چھتوں کو دیکھنے لگا۔

"یہ بنیک کے بڑے صاحب ہیں"۔ دیارام نے اپنے بھتیجے کی استفسارانہ نگاہوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ اب دیارام کے لہجہ میں کسی قدر خوف اور انکسار پایا جاتا تھا۔ وہ آدمی اب کافی نیچے اتر گیا تھا اور ان لوگوں کی باتوں کی آواز اس تک نہیں پہونچ سکتی تھی۔ پھر دیارام تیزی سے آگے بڑھا اور بابو جی کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ کچھ دیر تک دونوں دروازہ کے باہر منتظر کھڑے رہے۔ دیارام نے پھر کنڈی کو بوسیدہ دروازہ پر دھڑا دھڑ مارا تاکہ زور سے آواز ہو۔ کچھ دیر گذری۔ اب دیارام نے آواز دی۔

"بی بی جی۔ دروازہ کھولو"

پاس کے ایک دوسرے دروازے کی چک اٹھی اور ایک عورت نکلی اس کا چہرا سانولا اور متلون لگتا تھا اور نقشہ سے ٹھہراؤ قطعی معدوم تھا۔ جب کبھی اس کے پتلے لبوں پر ایک تھکی ہوئی مسکراہٹ نمایاں ہوتی تھی تو چہرہ بدل جاتا تھا۔ اس کی ناک ستواں تھی اور بھوری بھوری آنکھیں مچی ہوئی سی لگتی تھیں پیشانی پر بہت سی لکیریں سی پڑی ہوئی تھیں اور اس کے تنے ہوئے سپاٹ جسم پر ململ کی ساری لپٹی ہوئی تھی۔ منو نے پہاڑوں پر کسی کو اس طرح ساری باندھتے نہیں دیکھا تھا۔ البتہ جے سنگھ کی ماں یعنی زمیندار کی بیوی ضرور اس طرح ساری باندھتی تھی کیونکہ وہ اصل میں شہر کی رہنے والی تھی لیکن گاؤں کی سب عورتوں کا خیال تھا کہ وہ عورت کیا تھی ایک تحفے کی پوٹ تھی۔ منو نے دیکھ لیا تھا کہ اس عورت نے تعجب سے گھور کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اور اب وہ چپ چاپ

منتظر کھڑا تھا کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ اسے صرف اس عورت ہی سے اجنبیت نہیں محسوس ہو رہی تھی بلکہ اپنے چاروں طرف کے تمام ماحول، چمکتی ہوئی کرسیوں، میزوں، تصویروں سب سے محسوس ہو رہی تھی۔ ایک ایک چیز اپنی جگہ منو کے لئے مجسم سوال کا نشان بن گئی تھی۔

"بی بی جی" دیا رام نے ہاتھ جوڑ کر کہا "میں اپنے بھتیجے کو آپ کے یہاں نوکر رکھانے لایا ہوں، یہ دیکھئے یہ رہا"۔ پھر اس نے غصہ کی ایک نظر سے منو کو گھورا اور بولا۔ "ہاتھ جوڑ سور! اور کہہ پالاگوں بی بی جی"

منو نے ہاتھ جوڑے لیکن ہونٹ وہ "پالاگ ... ... " بھی بمشکل کہہ سکا تھا کہ اندر کہیں سے کسی بچے کی چیخ سنائی دی۔ بی بی جی فوراً واپس اندر بھاگیں اور تڑتڑاتی ہوئی چیخیں۔

"ارے بیٹا تو نے تو میری جان کھا لی جب کسی سے کام کی بات کروں تب تو ذرا چین لیا کر! تو مرے، تیرا کلیجہ جلے! منحوس کہیں کے تو غارت ہو! کیا ہے اب! کیا چاہئے تجھے؟"۔ اور اگر دیا رام بیچ میں نہ پوچھ بیٹھتا تو شاید یہ سلسلہ اور دیر تک جاری رہتا۔ اُف اس عورت کی بھی کیا ہاتھ بھر کی زبان تھی اور اس کے کلیجے میں کتنا دم تھا۔ کیا چیختی تھی۔

"تو بی بی جی پھر ٹھیک ہے نا۔ چھوڑ جاؤں اسے؟"

منو اس کے جواب کا بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔ اسے بی بی جی سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اس کی وہ لمبی مرغی کی سی گردن منو کی آنکھوں میں پھر رہی تھی۔

"نہیں دیا رام ذرا ٹھہرو" بی بی جی نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا کمرے میں جا کر انھوں نے بچے کے منہ پر کوسنے کے ساتھ ایک تھپڑ بھی رسید کر دیا

تھا جس سے چیخیں اور بھی بڑھ گئی تھیں

"تم نے بابو جی سے کہہ دیا ہے؟"

"جی ہاں بی بی جی۔ میں اس کو پہلے دفتر ہی لے گیا تھا" دیا رام بولا۔

"اور بابو جی نے کہا کہ اسے یہاں گھرلا کر آپ کے حوالے کر دوں"

"ٹھیک ہے" بی بی جی بولیں "لیکن ابھی شام کے کھانے کے لئے سبزیاں بھی تو بازار سے لانی ہیں۔ تم ... ..."

لیکن اتنے میں پچھلے کمرے سے پھر چیخیں بلند ہونے لگیں۔ بچے نے جب دیکھا کہ صرف رونے سے کام نہیں چلتا تو لگاتار چیخیں مارنی شروع کیں اور بی بی جی نے پھر اندر گھس کر کوسنوں کی بوچھار شروع کر دی۔

منو کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس کا وجود ختم ہو چکا ہے اس کی نظروں کے سامنے اپنی چچی کی تصویر پھر گئی۔ لیکن وہ اتنی گالیاں اور ایسے کوسنے تو کبھی نہیں دیا کرتی تھی۔ اس کے دل میں ایک درد بھری صدا بلند ہوئی جیسے کوئی غمگین نغمہ ہو ایک عجیب موہوم سی لے والا درد ناک گیت۔ اس گھر میں زندگی کیسے کٹے گی۔

"اچھا تو تم بابو جی سے کہہ دینا کہ جب آفس سے واپس ہوں تو بسکٹ خرید لیں اور اس لڑکے کے ہاتھ بھیج دیں"

منو نے اپنی مالکہ کی آواز اندر کہیں سے آتی ہوئی سنی لیکن وہ اس پر کچھ دھیان نہ دے سکا۔ اس کا دل غم سے بھرا تھا۔ اسے اپنی حالت پر رنج ہو رہا تھا اور پہاڑوں سے چل کر آنے سے تھک گیا تھا۔ اسے بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ منزل پر پہنچ کر دم لے گا اور کچھ کھانے کو بھی مل جائے گا کیونکہ یہ

تو عام طور پر قاعدہ ہے کہ چاہے کوئی بھی وقت ہو، آنے والوں اور مہمانوں سے کھانے پینے کو ضرور پوچھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے بجائے آتے کے ساتھ ہی اُسے کسی کام سے دوڑایا جا رہا تھا۔ اس کا دل غم کے بوجھ سے بالکل دب گیا اور اس نے سوچا کہ شاید شہر کے طور طریقے اور قسم کے ہوتے ہوں گے۔

"بہت اچھا بی بی جی"، دیا رام نے سیدھے سے کہا۔ وہ اپنے مالکوں کی تلون مزاجی کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ اپنے بھتیجے کی طرح غصہ اسے آ ہی نہیں سکتا تھا۔

"ادھر ہوئے منو۔ آ۔ چل"، دیا رام نے کہا اور چلنا شروع کر دیا، "یہاں تجھے خوب کھانے کو ملے گا۔ یہ لوگ تیری اچھی خبر گیری کریں گے اور بابو جی نے کہا ہے کہ ہمیں تین روپیہ مہینہ ملے گا۔ آفس کے پاس جو میرا کمرہ ہے وہ میں ابھی تجھے دکھا دوں گا جس دن تجھے چھٹی ہو تو وہاں آ جایا کیجیو۔ دل لگا کر اپنے مالکوں کی خوب خدمت کرنا۔ تو ان کا نوکر ہے اور یہ لوگ بڑے بھلے آدمی ہیں"

منو سنتا جا رہا تھا اور پھر ... ... یکایک اس کی آنکھوں سے آنسو اُبلنے لگے۔ آنسوؤں کی اس شبنمی جھلملی سے اسے اونچی چٹانیں اور بڑے بڑے پتھریلے پہاڑ دکھائی دینے لگے جو سورج کی تیز دھوپ میں سیاہ لگ رہے تھے، اور بیاس کا چمکدار سیمیں خط جس کے کنارے وہ جانور چرایا کرتا تھا، جہاں اس کے مویشی گردنیں اٹھا اٹھا کر آسمان کو تکا کرتے تھے اور کس آزادی سے گھومتے رہتے تھے ... ... دور دور تک گھومتے رہتے تھے ... ... میلوں دور تک ... ...

بابو نتھو رام کے باورچیخانہ کے ایک کونے میں منو رات بھر سکڑا پڑا رہا۔ اس نے بڑی بے چینی سے رات کاٹی تھی کیونکہ وہ تھک گیا تھا اور تھکن

میں نیند کہاں! اسے ایک بادامی رنگ کا پھٹا پرانا کمبل دیدیا گیا تھا جس میں اسے بہت گرمی لگ رہی تھی حالانکہ اس چھوٹے سے کمبل میں بھی جگہ جگہ بڑے بڑے چھید تھے جیسے روشن دان ہوں۔ ساری رات مچھر اس کے کانوں پر پینترے بدلتے رہے تھے اور کسی جگہ اسے کاٹا بھی۔ مکھیوں کا ایک دل کا دل بھن بھن کرتا ہوا بار بار اس کے منہ پر بیٹھ بیٹھ کر اسے پریشان کر رہا تھا۔ اب تو وہ اپنی آنکھیں بند بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ گاؤں میں اسے صبح تڑکے اٹھنے کی عادت تھی۔ وہ یوں ہی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتا رہا کہ شاید کسی طرح نیند آجائے۔ پھر اس نے زبردستی اپنی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی۔ اُف! اس نئے ماحول میں کس غضب کی اجنبیت تھی!

دوسرے کمرے سے بابو جی کے زور زور سے خراٹے لینے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کس کمرے میں تھے یہ منو کو معلوم نہ تھا کیونکہ جب وہ سبزی لے کر بازار سے لوٹا تھا تو بی بی جی نے اسے آواز دے کر سیدھے باورچی خانہ ہی میں بلا لیا تھا۔ اسے ایک باسی روٹی دی تھی اور پھر اسے آلو چھیلنے اور کھانا پکانے میں مدد دینے میں لگا لیا تھا۔ کھانا پکا تو ضرور تھا لیکن کہاں کھایا گیا اور کس نے کھایا اس کا منو کو کچھ پتہ نہ تھا کیونکہ وہ تھک ہار کر اسی کونے میں آٹا ہو گیا تھا جس میں وہ اب بھی پڑا ہوا تھا۔ اب تو اسے صرف اپنی مالکہ کی تیز آواز یاد تھی جو اس کے کانوں میں اس وقت پہنچی تھی جب اس کی پسلیوں میں کئی ایک ٹھوکے لگا کے اُسے جگایا گیا تھا۔

"نمک حرام، مفت خور، ارے تو کیسا نوکر ہے کہ سورج ابھی نہیں چھپا اور تو سو گیا۔ اب تو روز روز یہی کرے گا تو تجھ جیسے نکمے لونڈے کو رکھنے سے کیا فائدہ۔ اٹھ! چل اٹھ بیٹھ، جا نور کہیں کا۔ اٹھ بابو جی کو کھانا دے۔ اگر کسی نے

کے لئے مرا جاتا ہے تو کھانا تو کھا کر مر"

منو نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ مختلف چیزوں کا ایک انبار اس کے چاروں طرف بکھرا پڑا تھا۔ کہیں چمکتی ہوئی پیتل کی تھالیاں تھیں کہیں تانبے کی دیگچیاں جن کے تلے سیاہ ہو رہے تھے، کہیں ایلومینیم کے گلاس، بچوں کے کھلونوں اور شیشیوں کے ساتھ پڑے لڑھک رہے تھے۔ کوئی شیشی بڑی تھی تو کوئی چھوٹی، کچھ دواؤں کی شیشیاں تھیں جیسی منو نے گاؤں کے ڈاکٹر کی دکان میں دیکھی تھیں۔ البتہ یہ شیشیاں میلی اور گرد آلود تھیں۔ اور ڈاکٹر کی دکان میں کمپاؤنڈر ہر چیز کو صاف ستھرا رکھتا تھا۔

بہت سی بوریاں تھیں جن میں آٹا دال وغیرہ رکھا تھا۔ بوریوں کے علاوہ لکڑی کے صندوق اور ٹین بھی تھے لیکن منو کو نہیں معلوم تھا کہ ان میں کیا بھرا ہے۔ دیواروں میں کھونٹیاں لگی تھیں جن پر دو میلی قمیصیں اور ایک ساٹن کا جیکٹ ٹنگا ہوا تھا۔ دو بڑی بڑی رنگین تصویریں لگی تھیں جن پر سوکھے ہوئے پھولوں کے ہار اس طرح لٹکے تھے کہ تصویریں دکھائی نہ دیتی تھیں۔ ایک طرف ایک ٹوٹا ہوا آئینہ رکھا تھا جو دھوئیں سے سیاہ ہو رہا تھا۔ ایک کونے میں جلانے کی لکڑی گنجی ہوئی تھی۔ دو دیواروں کے درمیان ایک الگنی آڑی بندھی تھی جس پر طرح طرح کے نئے اور پرانے کپڑوں کا ایک انبار لٹکا تھا۔ چھت پر نجان باندھ کر اس پر بہت سے لحاف توشکیں اور کمبل لٹکائے گئے تھے۔ تھوڑی دور پر، ایک الگ الماری پر، ایک لوہے کی کشتی میں سفید چاک کے کچھ چمکتے ہوئے برتن رکھے تھے، چھوٹے چھوٹے گول گنڈے دار پیالیاں، ایک بڑی سی کیتلی جس کی ٹونٹی کسی جانور کی تھوتھنی کی طرح لگتی تھی اور ایک جگ۔ یہ سب برتن ایسے اُدھڑے تھے کہ معلوم ہوتا تھا اب آہی پڑیں گے۔ منو کو کچھ معلوم نہ تھا

کر سفید چاک کے یہ برتن کس کام آتے ہوں گے۔ لیکن اُسے ان کی وہ چمکدار چکناہٹ اچھی ضرور لگی۔ ان کو دیکھ کر اسے ایسا لگا کہ اب ان برتنوں کے ذریعہ اسے کوئی نئی بات ضرور معلوم ہوگی، اس پر کوئی نیا راز ضرور کھلے گا۔ رہ گئے تانبے اور پیتل کے برتن تو ان کی چمک تو زبان حال سے کہہ رہی تھی کہ "اب تمہیں ہم کو مانجھنا پڑے گا، رگڑنا پڑے گا"

تصویروں اور آئینے کی موجودگی کے باوجود بھی یہ تمام انبار ایسا تھا کہ منو کا جی گھبرانے لگا۔ کمرے میں اب صبح کی سفیدی دھیرے دھیرے قدم رکھتی آرہی تھی اور منو کا دل چاہا کہ کہیں چھپ جائے، اپنے ہی وجود میں کہیں گم ہو جائے۔ اسے معلوم ہوتا تھا ساری دنیا خالی ہے۔ پھر اس کا دل چاہنے لگا کہ اُٹھ بیٹھے اور دیکھے کہ اور کمروں میں کیا ہے۔ پہاڑوں کی چٹانوں، جھاڑیوں اور درختوں میں اکثر چڑیوں کے انڈے بچے ڈھونڈا کرتا تھا اور اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں وہی شرارت چمکنے لگی۔ جب وہ باغوں سے پھل چرایا کرتا تھا تو اس کا دل ہلکے ہلکے دھڑکنے لگتا تھا۔ اس وقت بھی اس پر وہی کیفیت طاری تھی۔ اس کی رگ رگ میں دریافت کرنے، معلوم کرنے کا جذبہ بیدار ہو رہا تھا ایک انگڑائی لے کر وہ جھپاک سے کھڑا ہو گیا اور پنجوں کے بل چل کر اپنے سامنے والے دروازے میں سے جھانکنے لگا۔ دروازہ میں ایک پتلی سی دراز تھی، اس نے اپنی آنکھ اس روزن میں لگا کر دیکھنا شروع کیا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو دو بڑے بڑے پلنگوں سے بالکل گھرا ہوا تھا۔ کئی چھوٹے بڑے صندوق اوپر تلے رکھے تھے اور ایک بچوں کی گاڑی رکھی تھی۔ ایک پلنگ پر بابو جی کروٹ لئے، آنکھوں میں منہ گاڑے سو رہے تھے۔ دوسرے پلنگ پر چادر اوڑھے، کمر موڑے کوئی اور سو رہا تھا۔ منو نے سوچا یہ ضرور بی بی جی ہوں گی۔ اب منو داہنی طرف مڑا اور دوسرے

دروازہ کی طرف متوجہ ہوا جو آدھا کھلا ہوا تھا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اس طرح جھانکنے سے اس کے مالک اور مالکہ جاگ نہ اٹھیں۔ دوسرے کمرے کے بیچوں بیچ میں ایک پلنگ بچھا تھا جس پر صاف اور سفید بستر لگا تھا اور اس پر ایک شخص سو رہا تھا۔ اس آدمی کا رنگ اس صاحب کی طرح سفید تھا جو ٹوکری نما ٹوپی پہنے تھا اور جس کو اس کے چچا نے سلام کیا تھا۔ اس کمرے میں اور بھی بہت سی دلچسپ قسم کی چیزیں تھیں اور سب کی سب نہایت صفائی اور سلیقے سے سجی تھیں۔ ایک کونے میں ایک بڑی سی میز تھی، شاندار کرسیاں تھیں جیسی منو نے اپنی تاریخ کی کتاب میں پرانے شاہی تختوں کی تصویریں دیکھی تھیں، چھوٹی بڑی تصویریں تھیں، کچھ کیلنڈر ادھر ادھر لٹک رہے تھے جن پر معمولی تاریخیں سیاہی سے اور چھٹیوں والے دن سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے تھے۔ مٹی کے رنگ برنگے کھلونے رکھے تھے ہاتھی کے سونڈ والے دیوتا گنیش کی بھی ایک مورتی تھی جو دولت اور دنیاداری اور عقل کا دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ یہ مورتی تمام کھلونوں پر چھائی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ منو اپنی گول گول آنکھیں ادھر ادھر پھیر پھیر کر تہذیب و تمدن کے ان آثار کو دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ ابھی اور دیر تک دیکھتا رہتا، دیکھتا ہی رہتا، کہ یکایک سونے والے شخص نے (جو ضرور بابو جی کا چھوٹا بھائی تھا کیونکہ منو نے بی بی جی کو چھوٹے بابو پریم کا ذکر کرتے سنا تھا) کروٹ لی اور نیند ہی میں کچھ بڑبڑانے لگا۔

"او بے منوا اٹھ گیا کیا؟"

منو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ جب وہ دوڑا تھا تو اس کی پیر کی تھپ تھپ سے تو بی بی جی نہیں اٹھ گئی تھیں؟۔

"ہاں بی بی جی اٹھ گیا ہوں" اس نے اپنے پہاڑی لہجہ کو اپنے مالکوں کے لہجہ کے مطابق مروڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو لگ کام میں" بی بی جی کی سستی بھری آواز آئی "چولھے کی راکھ جھاڑ ڈال اور رات کے جھوٹے برتن سب مانجھ لے۔ کل رات کو تو اتنی جلدی سو گیا کہ اتنا سا کام بھی نہیں ہوا تجھ سے۔ اور آگ جلا کر دیگچی میں بابو جی کی چائے کے لئے پانی چڑھا دے۔ میں ابھی اٹھ کر آتی ہوں"

پھر رونے کی آواز آئی۔ ضرور چھوٹی بچی لیلا اٹھ بیٹھی تھی۔ لیکن اسے پھر لوری دے کر سلا دیا گیا۔ منو سوچنے لگا کہ بڑی لڑکی شیلا کہاں ہے۔ کل منو کو معلوم ہوا تھا کہ وہ چچا کے ساتھ میلے میں گئی ہے۔ اس نے اب تک شیلا کو دیکھا ہی نہیں تھا۔

باورچیخانہ کی طرف جاتے وقت منو کا جی گھبرانے لگا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس گھر میں کام کیسے ہوتا ہے اور کدھر سے کام کرنا شروع کرے۔ اس کے علاوہ اپنے گاؤں میں صبح تڑکے اٹھ کر سب سے پہلا کام وہ یہ کرتا تھا کہ کھیت میں جا کر فارغ ہوتا تھا، پھر کنوئیں پر نہاتا تھا اور واپس آ کر کھانا کھاتا تھا۔ اس کے بعد یا تو اسکول جاتا تھا یا پھر اپنا ریوڑ لے کر چرانے نکل جاتا تھا۔ یہاں اسے معلوم ہی نہ تھا کہ فراغت کے لئے کہاں جائے۔ چاروں طرف مکان ہی مکان تھے اوپر پہاڑ سے وہ شاندار بنگلے اُسے اندر آنے کی مناہی کر رہے تھے اور سڑک پر دربان آ جا رہے تھے۔ اسے کیا معلوم کہ شہر کے لوگ فراغت کے لئے کہاں جاتے ہیں۔ وہ دوڑ کر باورچیخانہ کے دروازہ پر پہنچا جو باہر کھلتا تھا۔ باہر مکان سے لگا ہوا کوئی پاخانہ اسے نظر نہ آیا۔

منو کی گھبراہٹ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُسے ایسا لگا کہ اب وہ زیادہ

برداشت نہیں کر سکے گا اور اپنی دھوتی بھی خراب کر دے گا۔ وہ باہر بھاگا اور مکان کے احاطہ کی دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ ابھی وہ بمشکل بیٹھ ہی سکا تھا کہ اس کی مالکہ کی آواز آئی۔

"ابے کہاں ہے۔ اوئے منو کہاں مر گیا"

منو پر ایک دم سے خوف طاری ہو گیا کہ کہیں وہ آکر اسے دیکھ نہ لے لیکن وہ کرتا بھی کیا۔ اب اپنے آپ کو برداشت کر کے اٹھ کھڑا ہونا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

"اوئے نمک حرام، اے کمبخت بے حیا جانور، سور، کتا، معلوم ہوتا تھا منو کے سر پر ایک طوفان پھٹ پڑا۔ کیونکہ بی بی جی اپنی آواز کا جواب نہ سن کر باہر نکل آئی تھیں اور پھر اس نظارہ کی تاب نہ لا کر ایک دم اندر کو لوٹ گئی تھیں۔

"ہائے کمبخت بے شرم، بے حیا، ذلیل پہاڑی لونڈا۔ تو مرے، تیرا بیڑا غرق ہو، یہ کیا کیا کم بخت تو نے، تو نے مجھ سے کیوں نہ پوچھا کہ کہاں جاؤں، تو جل مرے، تو غارت ہو، ارے ہمیں کیا خبر تھی کہ ایک کمبخت جانور کو، جنگلی وحشی کو نوکر رکھ لیا ہے۔ صبح شام یہاں سے جو صاحب لوگ نکلتے رہتے ہیں وہ دیکھ کر کیا کہیں گے۔ صاحب لوگوں کے سامنے بابو جی کی عزت دو کوڑی کی کر دی کمبخت، ہائے ہائے کیا گندگی کی ہے دروازے کے سامنے"

پہلے تو ان کی آواز نفرت کے مارے بڑی اونچی جا رہی تھی، پھر غصہ میں فوں فوں کرنے لگیں اور آخر کار انتہائی بے زاری کے عالم میں وہ بڑبڑانے لگیں منو کا چہرہ لال ہو گیا۔ سارے جسم کا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آ گیا۔ زندگی میں یہ پہلی مرتبہ کسی نے اسے کھلے بندوں فراغت کرتے دیکھ لیا تھا اور وہ شرم سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔

اور پھر اتنی دیر میں تو تمام گھر کا گھر جاگ پڑا۔

سب سے پہلے بابو نتھورام اپنے بھاری کندھے ہلاتے، چربی ہوئی ٹانگوں سے چلتے موجود ہوئے۔ انھیں اپنی جمع کی ہوئی دولت کی ہمیشہ فکر پڑی رہتی تھی۔ اور اسی لئے ان کو چھوٹتے ہی یہ خیال ہوا کہ ضرور گھر میں کوئی چور گھس گیا ہے۔ پھر چھوٹے بابو وارد ہوئے۔ یہ حضرت خوبصورت اور مضبوط نوجوان ہونے کے علاوہ طبیعت کے بھی چلبلے اور بے تکلف تھے۔ آتے ہی بولے

"کیا ہوا یہ شور کیوں مچ رہا ہے بھئی"

سب سے آخر میں بابو جی کی بڑی لڑکی شیلا پہنچی۔ شیلا کی عمر کوئی دس سال کی ہوگی، دبلی پتلی، سنہرے بال، دودھ کی سی رنگت، اور لمبی بھوری آنکھیں اس مضحکہ خیز نظارے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شرارت کی چنگاریاں جھلکنے لگیں۔ بی بی جی اپنے بھرپور غصہ اور نفرت کے ساتھ زور زور سے چیخنے لگیں۔

"ارے یہ بے حیا گنوار، اس نے جاکر باورچیخانہ کے آگے دہلیز ہی پر پاخانہ پھر دیا۔ ہے بھگوان، ارے ذرا تو دیکھو، نمک حرام کہیں کا، یہ مرجائے، ہائے ہائے، میں تو ... ... "

"کیوں بے سور کے بچے" اور بابو جی نے اپنا پتلا سوکھا سا ہاتھ اٹھایا جس سے ان کی بیوی خاموش بھی ہو جائیں اور منوڈر بھی جائے۔

"ابے یہ کیا کیا۔ کیوں کیا ایسا، ہیں" پھر انھوں نے اپنے چہرے کو کچھ ایسی عجیب طرح سے مروڑا اور کچھ ایسا منہ بنایا کہ ان کے ہونٹ کھل کر لال لال جبڑے اور چھدرے دانت دکھائی دینے لگے اور انھوں نے پھر احمقانہ طریقے سے دوہرایا "کیوں بے کیوں کیا، ہیں؟"

چھوٹے بابو کو ہنسی آگئی اور وہ چیئر خانی کرتے ہوئے بولے۔

"ارے بھئی کیا یوں کہ دھوتی میں نہیں کرنا چاہتا تھا اور کیوں؟ ویسے اگر دھوتی خراب ہو جاتی تو پھر بی بی جی کو دھوتی پڑتی۔ چلو خیر ابھی تو بھنگی آیا جاتا ہے" شیلا ہنسنے لگی۔ کھی کھی کھی۔ اور اپنے چچا کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

بابو نتھو رام غصہ ضبط کرتے ہوئے بولے "چلو شیلا ہٹو یہاں سے، تمہارا یہاں کیا کام ہے۔ یہ کمبخت پاخانے میں کیوں نہیں گیا؟

"تم نے اسے بتایا کیوں نہیں کہ پاخانہ کہاں ہے" انھوں نے مڑکر بی بی جی سے پوچھا

"لو اور سنو تو تم کیا سمجھتے ہو کہ اس کو ہم اپنے پاخانے میں جانے دیں گے۔ بی بی جی نے جواب دیا۔ اس گنوار کو اپنے پاخانے میں جانے دیں گے تم اور بھی اس کو سر پر چڑھالو۔ اب یہ میرے سر کی ایک اور آفت آئی کہ اس کی خبر گیری کروں۔ ارے کوئی جاؤ مہتر کو بلا کر یہ گندگی تو صاف کروادو جو اس کمبخت نے کی ہے۔ ہائے ہائے"

"خیر بھئی اب جو ہوا سو ہوا" چھوٹے بابو ذرا ملائمت سے بولے۔ "اب اور زیادہ اس کو دھمکائیں گے تو پھر ڈر کے مارے ہگ دیگا۔ اور ہاں چائے کیوں شیلا! آج تمہاری ماں کو اتنا غصہ ہے کہ ہم لوگوں کو چائے بھی نہیں ملے گی؟"

"تم سے ذرا صبر نہیں ہو سکتا پریم" بی بی جی چیخیں "پہلے مجھے اس کمبخت کا تو قصہ چکا لینے دو"

"اُف۔ اُوق" یہ منظر دیکھ کر ان کا قے کرنے کو دل چاہتا تھا حالانکہ قے بالکل نہیں آرہی۔ "اوق۔ اُف مجھے قے آرہی۔ اُف چکر آرہا ہے"

اتنے میں پیچھے سے کچھ سرسراہٹ ہوئی اور بی بی جی نے مڑکر دیکھا کہ منو ان کے بالکل پیچھے ہی باورچیخانے میں کھڑا ہے۔ وہ اس پر جھپٹ پڑیں اور زور سے چیخیں۔

"ارے نمک حرام، کہاں گیا تھا" اب منو بالکل نہیں گھبرا رہا تھا اور دھیرے سے بولا۔

"پمپ پر دھونے گیا تھا"

بی بی جی نے اسے دونوں ہاتھوں سے باہر دھکا دیا "چل خبردار جو نہائے بغیر باورچیخانے کے پاس بھی پھٹکا ہوگا"

منو باہر نکل گیا لیکن بی بی جی کی آواز برابر اس کے کانوں میں آتی رہی "گنوار کہیں کا۔ دور ہو میری آنکھوں کے سامنے سے"

منو کافی دور نکل گیا۔ اب وہ ان کی آواز نہیں سن سکتا تھا لیکن پھر بھی وہ بڑبڑاتی ہی رہیں۔ "میں نے تو سوچا تھا کہ نوکر آجائے گا تو مجھے ذرا آرام ملے گا لیکن یہاں تو وہی پہلے کی سی گھس گھس اور محنت اور چاکری، ایسے جنگلی لڑکے سے بھلا گھر کا کام چل سکتا ہے۔ مدد دینی تو کیسی اور الٹی مصیبت ہوگئی۔ بیوقوف گدھا اور گندا کس قدر ہے۔ اُف یہ دیہات کے لوگ"

"چلئے بھئی اب دیہات والوں کو زیادہ باتیں نہ سنائیے۔ آپ خود بھی تو گاؤں کی ہیں" دیور نے چھیڑا

"بس جی مذاق نہ کرو۔ واہ، آخر ہمارے منھ پر ناک ہے کہ نہیں کم از کم دوسروں کے سامنے تو اپنی ناک اونچی رکھنی ہی چاہئے"

"شیلا"

وہ گیا گیت تھا چائے کے بارے میں جو تم نے ریلوے اسٹیشن پر

لکھا دیکھا تھا۔ ارے وہی جو امپیریل ٹی کمپنی کے اشتہار پر لکھا تھا۔ یاد ہے؟"
پریم بات تو بھتیجی سے کر رہے تھے لیکن دراصل وہ اپنی بھابی کو سنا کر کہنا
چاہتے تھے

"کون سا گیت چچا۔ وہی گرم چائے بخار اتارتی ہے گرم چائے
گرمی میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے، اور کیا کیا تھا"

"ہاں ہاں وہی، جاؤ اور زور سے بی بی جی کے کان میں وہ گیت
گا دو" اور پریم شرارت سے بستر پر لوٹ لگانے لگا۔

شیلا نے گانا شروع ہی کیا تھا۔ "گرم چائے" کہ بی بی جی
پھٹ پڑیں۔ "اچھا، اچھا! تو میرا مسرتو نہ کھاؤ، میرا کیوں مفت میں نام لیتے
ہو۔ بنا تو رہی ہوں چلتے۔ کم بخت نکھٹو ہی جان اور ہاتھ بھر کی زبان، تیرا چچا
تو خیر کالج میں ڈاکٹری پڑھ کر بڑا صاحب بن گیا ہے پر تو سیم صاحب کیوں بنی
جا رہی ہے"

موری میں منو بیٹھا راکھ سے برتن مانجھ رہا تھا۔ یہ موری برتن مانجھنے
اور نہانے دونوں کا کام دیتی تھی اور اس کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سی
میلی پھسلندی نالی تھی جہاں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور کیڑے چل رہے تھے،
پیچھے جالی میں سے ٹھنڈی ہوا آ آ کر منو کا پسینہ خشک کر رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے
جہاں وہ اکڑوں بیٹھا تھا، ذرا کھسکا اور نالی کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ اب اس کے
سامنے ایک دروازہ سا تھا جو پیچھے کو کھلتا تھا اور ادھر سے پاخانے کی بو آ رہی
تھی۔

منو نے دل میں سوچا "ضرور یہی پاخانہ ہوگا۔ کبھی وہ عجیب" شیلا
باورچی خانہ ہی میں کھڑی کھڑی کہنے لگی۔ "ماتا جی اسے برتن مانجھنے میں مدد دوں؟"

"چل پرے ہٹ" بی بی جی زور سے چیخیں "اس نکمے سور کو کچھ کام تو کرنے دے"

شیلا کھسک گئی

بی بی جی نے اُبلتے ہوئے پانی کی پتیلی چولھے پر سے اتاری۔ چائے کا سیٹ اتارا جو منو نے تختے پر ادھر رکھا دیکھا تھا۔ اور پھر انھوں نے اسی چائے دان میں چائے بنائی جس کی ٹونٹی کسی جانور کی تھوتھنی کی طرح تھی۔ وہ اس بات کی خاص احتیاط کر رہی تھیں کہ یہ برتن چوکے کے نزدیک نہ ہونے پائیں کیونکہ وہ جگہ تو پورے باورچیخانے میں ایک متبرک مقام تھی۔ کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ ان کے شوہر اور دیور کے مسلمان دوستوں نے بھی اکثر ان پیالیوں میں چائے پی ہے اور وہ خود نہایت ہی راسخ الاعتقاد ہندو خاتون تھیں۔ منو ان کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھ رہا تھا اور اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ بی بی جی چینی کے برتنوں کو پتیلی کے برتنوں سے دور رکھنے کی انتہائی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ جب وہ چائے بنانے کے لئے پتیلی سے کیتلی میں پانی انڈیلنے لگیں تو پتیلی کیتلی سے چھو گئی۔ بی بی جی نے بھی دیکھ لیا کہ منو دیکھ رہا ہے اور انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے چوری کرتی ہوئی پکڑی گئی ہوں۔ لیکن وہ جھٹ کایک مان جانے والی تھیں۔ دھمکا کر بولیں۔

"اپنا کام کیوں نہیں کرتا۔ میں چائے بنا رہی ہوں تو میرا منھ کیوں تکے جا رہا ہے۔ اپنا کام دیکھ" لیکن منو نے اپنی نظر ہٹانے سے پہلے ایک ایسی بات دیکھ لی جو بی بی کبھی نہ چاہتیں کہ منو دیکھے۔ یعنی بی بی جی نے بالکل ایک پنتھ اور دو کاج والا معاملہ کر لیا تھا جس پانی سے چائے بنائی تھی اسی میں انڈے بھی ابال لئے تھے۔ یہ بات تو یقیناً پہاڑی گنواروں کے یہاں بھی گندی سمجھی جاتی تھی۔

بی بی جی گھبراہٹ سے لال ہوگئیں، ان کا چہرہ سرخ ہوگیا اور کڑوا کریلا نیم چڑھایہ ہوا کہ اسی وقت چھوٹی بچی لیلا، جسے وہ پلنگ پر سوتا چھوڑ آئی تھیں، ایک چیخ مار کر جاگ اٹھی۔

"ارے کمبخت لیلا، اٹھ گئی تو میری جان کھانے، اب بھلا تو مجھے چین لینے دے گی یا کوئی کام کرنے دے گی"

انھوں نے ڈبل روٹی کے دو توس کاٹ کر چولھے پر سینکنے کے لئے رکھے اور تیسرا کاٹنے لگیں۔ ایک لمحہ گذرا تھا کہ بچی نے پھر ایک چیخ ماری۔

"اری مری ذرا تو دم لے تجھے ہوکیا گیا ہے۔ تجھے چڑیل کھائے، کیا نحوست ہے دن بھر رین رین رین۔ باباجی سے تعویذ بھی دلوایا پھر بھی وہی حالت، ہے بھگوان مجھے کس دن چین نصیب ہوگا؟ سارا دن گھس گھس کرتے نکلتا ہے، کپڑے بدلنے تک کی مہلت نہیں ملتی، اتنی چھٹی نہیں ملتی کہ انسان پڑوسنوں سے دو گھڑی بات کرے یا بازار ہی ہو آئے۔ کل رات کو بھی دھونا دھانا کرکے دو بجے سوئی تھی اور اب ... ... شیلا ادھر شیلا سارے گھر میں ہڑونگا مچاتی پھر رہی ہے۔ ذرا چھوٹی بہن کو سنبھال لے۔ چل"

اتنے میں پریم نے آکر چھوٹی بچی کو اٹھا لیا تھا۔ اسے اور شیلا کو اپنے کمرے میں لیگیا اور وہاں اگر موقون کیا کہ بہلانے لگا۔ ثواب تمام برتن تقریباً مانج چکا تھا۔ دوسرے کمرے سے گانے کی آواز آتی سن کر اس نے باہر نل پر برتن کھنگالنے کا بہانہ کیا اور باورچی خانے سے باہر نکل گیا۔

بی بی جی نے چیخ پکار میں تو اس کی طرف دھیان نہیں دیا اور وہ جل گیا۔ انھوں نے ایک کو ستا سنایا اور دوسرا توس کاٹ کر سینکنے لگیں۔ گھر بھر میں ایک دو منٹ کے لئے محبت کے ایک لطیف درد بھرے گیت کی

لے بجنے لگی تھی۔ لیکن بی بی جی اپنے خیالات میں گم سوچ رہی تھیں کہ آج وہ بابو بیلی رام کی ماں کی ماتم پرسی کو جا سکیں گی یا نہیں۔ منو نے جلدی جلدی سب برتنوں کو کھنگالا اور گھر واپس ہوا مگر باورچی خانہ سے نہیں بلکہ باہری برآمدے سے ہو کر بیٹھنے کے کمرے میں آ گیا۔

"ابے او آلو کے پٹھے" چھوٹے بابو نے کہا۔ "کمرے میں آنے سے پہلے پاؤں بھی پونچھے تھے؟"

"نہیں بابو جی" منو نے جواب دیا۔ وہ گیلے پاؤں لئے قالین پر کھڑا تھا۔ برتنوں کی ٹوکری سے بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

"اچھا تو اگر اجازت ہو تو یہ عرض کروں کہ خدا کے لئے باہر پائدان پر پاؤں پونچھ کر پھر اندر تشریف لائیے۔ پائدان اسی غرض سے وہاں رکھا ہے" چھوٹے بابو نے طعنہ کے انداز میں کہا۔

منو کا دل بڑھ گیا اور وہ سوچنے لگا کہ خیر کم از کم چھوٹے بابو نے مجھے اندر آنے سے تو نہیں روکا۔ اب اس کی ہمت ذرا بڑھی۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ آگے بڑھ کر اس مشین کو دیکھے جیسی اس نے بازار میں دیکھی تھی اور اس کا گانا بھی سنے۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ میں بھی کیسا خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسی جگہ نوکری ملی جہاں یہ مشین بھی موجود ہے۔ وہ دوڑا ہوا باورچی خانہ میں پہونچا کہ برتنوں کی ٹوکری باورچی خانے میں پٹک کر اپنے ہاتھ خالی کرے۔ پھر وہ راکھ اور کوڑا پھینکنے کے بہانے سے باہر سڑک پر پہنچ گیا۔ بدقسمتی سے اسی دم گانا رک گیا۔ سڑک کے پاس پمپ پر ایک لمبا سا لڑکا پیتل کے گگروں میں پانی بھر رہا تھا، وہ اور لڑکے اس کے پاس ہی منتظر بیٹھے تھے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" لمبے لڑکے نے منو سے پوچھا۔ "راکھ پھینکنی

ہو تو ادھر ڈھیری پر پھینک دیا کرو۔"

"کیا تم بھی یہیں کہیں نوکری کرتے ہو" منو نے سوال کیا

"ہاں میں بابو گوپال داس کے وہاں کام کرتا ہوں" لمبے لڑکے نے جواب دیا۔ "وہ تمہارے بابو سے بڑے بابو ہیں۔ اور ان دونوں کے بابو لوگ کچہری میں کام کرتے ہیں۔ ہم سب ہوشیار پور کے رہنے والے ہیں"

"میں کانگڑا سے آیا ہوں" منو نے جواب دیا اور پھر خود ہی اپنے چچا اور اپنے گاؤں کی سب اہم شخصیتوں کا حال کہہ ڈالا۔ اور ساتھ یہ بھی کہ جب وہ چھوٹا سا تھا تو اس کے ماں باپ اسے کس طرح ہوشیار پور لے گئے تھے۔ اور پھر چند ہی لمحوں کے اندر انھوں نے شمالی ہندستان کے صاف دل باشندوں کی طرح ایک دوسرے سے اپنے دل کا سب حال کہہ سنایا۔

یکایک گھر میں سے پھر ایک مسرت خیز نغمہ بلند ہوا۔ منو کی توجہ ادھر ہو گئی اور وہ بھاگ کر اندر آ گیا۔

"ابے اپنے پنجے سنبھال، او بندر" چھوٹے بابو چیخے

منو چاروں ہاتھ پاؤں کے بل ہو کر اپنے مالک کی خوش طبعی اور ذوقِ ظرافت کی داد دینے لگا جیسے سچ مچ ہی تو بندر تھا۔ پاؤں پر ہاتھ پاؤں پر گھٹنے کے بعد وہ پھر مسخروں کی طرح آگے بڑھا اور گاؤں کے مداری کے بندر کی طرح ناچنے لگا جس کو وہ روز اسکول سے واپسی پر چوراہے پر ناچتا ہوا دیکھا کرتا تھا۔

"دیکھو چاچی، دیکھو ذرا، بالکل بندر کی طرح ناچ رہا ہے" شیلا ہنسنے لگی۔

"شاباش، شاباش" چھوٹے بابو بھی مداری کے ناچ میں کافی دلچسپی لے رہے تھے۔ تبھی لیلا اپنا سر ہلا ہلا اور تالی بجا بجا کر تال دے رہی تھی۔

"چاچا جی میں بھی بھالو بنوں گی" شیلا نے چلا کر کہا

منو اب بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ بندر بنا ہوا بھدے پن سے تھرک تھرک کر ناچتا جا رہا تھا۔ کبھی طرح طرح کے منہ بناتا، کبھی دانت نکالتا، کبھی آنکھیں مٹکا مٹکا کر بچ مچ بندر کی طرح ناچنے لگتا۔

"ارے یہ کیا ہنگامہ مچا ہے۔ یہ کیا ہڑدنگا ہو رہا ہے۔ یہ لونڈا ڈرائنگ روم میں کیوں گھسا ہے" بی بی جی کی تیز چیخیں سنائی دینے لگیں۔ تمام چہل پہل پر اوس سی پڑ گئی۔

"اپنے مالکوں کے ہنسی مذاق میں یہ کیسے شامل ہو گیا؟"

منو تیزی سے باورچی خانے کی طرف بھاگا۔ لیکن اس کی خوشی ختم نہیں ہوئی۔ اپنے تھرکنے اور ناچنے سے جو قدرتی خوشی اسے حاصل ہوئی اس سے اس کا چہرہ اب بھی دمک رہا تھا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ چولھے میں اٹھتے ہوئے دھوئیں سے اس کا سرخ مسرت آمیز رخسار اور چمکتی ہوئی آنکھیں چھپ گئیں اور بی بی جی کو نظر نہ آ سکیں۔ اور وہ وہیں چٹائی پر آلتی پالتی مارے توس سینکتی رہیں ورنہ اگر کہیں وہ دیکھ لیتیں تو اس کے ہنسنے پر بھی ایک طوفان پھٹ پڑتا جو فرائض جتانے والے طوفان سے کسی طرح کم نہ ہوتا۔

"دیکھ رے تیری جگہ یہاں باورچی خانہ میں ہے۔ تجھے چھوٹے بابو اور [illegible] کے کھیل میں گھسنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تو گھر کے کاموں سے جلدی جلدی نبٹ، فضول وقت خراب نہ کر، بابو جی کو دس بجے دفتر جانا ہے۔ شیلا کو اسکول جانا ہے۔ ہم نے تجھے گھر کا کام نبٹانے کے لئے رکھا ہے۔ بڑھانے اور پیار لگانے کے لئے نہیں تجھے اتنی تنخواہ دی جاتی ہے جتنی تو نے گاؤں میں کبھی نہ دیکھی ہو گی بلکہ تیرے باپ نے بھی کبھی نہ دیکھی ہو گی پھر مفت خوری کیوں؟ اور

دیکھ خبردار کہے دیتی ہوں کبھی آئندہ جو گھر کے آس پاس کہیں پاخانہ کیا۔ ابھی مہترآتا ہوگا اس سے کہنا مجھے نوکروں کا پاخانہ بتا دے جو اس پہاڑی کے نیچے ہی ہے اور ہاتھ اچھی طرح دھوئے بغیر برتنوں کو چھونا تک مت۔ تیرا بدن کیسا گندہ ہے اور تو برابر اسے چھوتا کھجاتا رہتا ہے۔ کپڑے بھی تو کیسے گندے ہیں ابھی میں نے دیکھا کہ تو نے قمیص سے ہاتھ پونچھے تھے۔ افوہ، اور نہا کر کیا دھوتی سے بدن پونچھا تھا ہے بھگوان، ارے مجھ سے تولیہ کیوں نہیں مانگ لیا۔ کمبخت جانور ڈوب مر چلو بھر پانی میں، شیلا او شیلا! جا تو میرا بچہ بکس میں سے ایک تولیہ نکال کر اس کم بخت جنگلی کو دے۔ تو سنا تو نے خبردار جو ہاتھ دھوئے بغیر اس گھر کی کسی چیز کو ہاتھ لگایا ہوگا۔ اچھا نہانے کے بعد تو پھر کسی گندی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا؟"

"نہیں بی بی جی" منو نے جواب دیا۔ بی بی جی کی باتیں اس کے کان میں ضرور پڑ رہی تھیں۔ مگر وہ دھیان سے کب سن رہا تھا۔ وہ تو اب اپنے تخیل میں ناچ رہا تھا، ناچے چلا جا رہا تھا

"اچھا۔ لیکن برتن مانجھے تھے نا؟" بی بی جی نے کہا

"اس کے بعد تو میں نے ہاتھ دھو لئے تھے بی بی جی" منو نے جواب دیا۔

"پھر تو کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا؟"

"جی نہیں"

"نہیں؟ کیا سچ مچ نہیں اور کوڑا جو پھینکا تھا؟"

"کوڑا پھینکنے کے بعد میں نے پمپ پر ہاتھ دھو لئے تھے"

"پھر اور کسی چیز کو چھوا تھا؟"

"نہیں" منو نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ وہ گھبرا گیا تھا اور چاہتا

تھا کہ کسی طرح یہ سوال جواب ختم ہو چکے۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ ابھی پائدان پر ہاتھ رکھے تھے۔ اور پائدان جس پر سب جوتے پونچھتے ہیں وہ تو گندا ہی ٹھہرا۔

"اچھا تو پھر چھوٹے بابو کے لئے چائے لیجا"

منو کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ کیسے لے جائے۔ سب برتن ایک ساتھ کشتی میں لے جائے۔ یا الگ الگ ایک ایک کر کے۔ گھر پر اس نے کبھی ایسی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ لہٰذا اس نے سوچا کہ ٹھیک معلوم کر لینا چاہئے۔

"کیسے لے جاؤں بی بی جی" اس نے پوچھا

"کیسے لے جاؤں؟ ارے کیسے لے جائے گا، ہائے ہائے تجھے کتنا سمجھانا پڑے گا۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ دیا رام ایسے کوڑھ مغز کو لے آئے گا۔ ہم ... ... "

اس عرصہ میں منو غور سے چاک کے بنے ہوئے ان برتنوں کو دیکھ رہا تھا اور ابھی بی بی جی نے اپنا نیا طوفان ختم بھی نہ کیا تھا کہ وہ بولا۔ "بی بی جی یہ برتن کاہے کے بنے ہیں؟"

"لو اور سنو، ذرا یہ گستاخی دیکھیو، بات کاٹ کر بیچ میں بولتا ہے۔ اپنا کام دیکھ۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ ارے چینی کے بنے ہیں یہ برتن، اور تو کیا بھاکہ کاہے کے بنے ہیں۔ ارے لوگو دیکھو اس جنگلی نے کبھی چینی کے برتن نہیں دیکھے۔ اور دیکھ خبردار جو کشتی گرائی ہو گی اور برتن توڑے ہوں گے۔ ورنہ یاد رکھنا تیری ہڈیاں توڑ دوں گی"

منو نے بس اپنے سوال کا جواب پانے تک تو انتظار کیا اور پھر بڑی پھرتی سے کشتی اٹھالی اور نہایت سبک رفتاری سے چلا۔ اس کی مالکہ پیچھے سے اپنی قینچی ایسی زبان سے برابر گالیاں کوسنے دیتی اور خبردار کرتی ہی رہی۔

"بھئی واہ بچو، آگئی چائے، آ ہی گئی آخر، ذرا دیر تو ہوئی مگر خیر کوئی بات نہیں" - پریم نے تالی بجا کر کہا

"چائے - چائے آگئی" شیلا نے خوشی سے کہا - اس کی نیلی آنکھیں چمکنے لگیں اور لب سکڑ گئے -

"اوں، اوں - آں - میں بھی چائے پیوں گی" لیلا نے روتے ہوئے کہا - وہ ایک میز پر بیٹھی، اپنے طفلانہ انداز میں، موسیقی کے ساتھ ساتھ اپنا سر ہلا ہلا کر تال دے رہی تھی - اور اس کی بڑی بہن، چچا اور باپ اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے - کبھی کبھی بڑے بابو جی بھی اپنی عظمت اور گھبراہٹ کو بالائے طاق رکھ کر بچوں کے کھیل میں دلچسپی لیتے تھے -

"یہاں رکھ گشتی، کالا آدمی کہیں کا" پریم نے بناوٹی ہندستانی میں تمسخرانہ انداز میں کہا - وہ کبھی کبھی ایسے ہی بات کیا کرتے تھے - خاص کر اگر کسی خالص یورپین چیز کے متعلق ہو جیسے چائے کی ٹرے، یا جب کبھی انگریزی سوٹ میں ملبوس ہوتے تھے تو بالکل ایسے بات کرتے تھے جیسے انگریز اپنے دیسی نوکروں سے بات کرتے ہیں -

"یہاں رکھ اس ٹیبل پر، کالا آدمی، زمین کا گھنے والا"

"بابو جی آؤ چائے پی لو" شیلا نے اپنے باپ کو آواز دی - وہ ابھی تک اپنے کمرہ کی محفوظ فضا میں ایک اور نیند لینے میں مصروف تھے -

"بھلا وہ کیوں اٹھنے لگے" بی بی جی جھنجھلائیں "وہ کیوں اٹھیں بھلا - سارے دن دفتر میں کلہاڑیاں چلایا کرتے ہیں نا"

بابو نتھو رام بوکھلا کر اٹھ بیٹھے - اور اپنی زرد، پھٹی ہوئی صورت لئے کر جھکائے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے - بابو جی نہایت ہی زن مرید قسم کے آدمی

تھے اور ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ صبح ہی صبح بیوی سے مڈبھیڑ نہ ہونے پائے۔

منو نے احتیاط کے ساتھ ایک چھوٹی سی میز پر کشتی رکھ دی۔ اور خود پیچھے ہٹ کر دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اور وہاں سے غور سے دیکھتا رہا کہ چھوٹے بابو کیسے کمال کے ساتھ چائے بناتے ہیں۔ پہلے انھوں نے لمبے سے جگ سے دودھ انڈیلا۔ پھر موٹے، ٹھنٹھنی ایسی ٹونٹی دے چائے دان سے چائے ڈھالی اور پھر الگ الگ ایک ایک پیالی میں شکر ملائی۔

"واہ کیا" اس نے اپنے دل میں سوچا۔ بھلا ایک برتن سے دودھ اور دوسرے سے چائے انڈیلنے میں کیا رکھا تھا۔ مگر یہ تو اس کی چچی پانی دودھ چائے کی پتی شکر سب ایک جگہ ملا کر ایک بڑی دیگچی میں ابال لیا کرتی تھی اور پھر پیتل کے گلاسوں میں انڈیل دیتی تھی۔ بس چائے تیار ہو گئی۔ اور بھلا موٹی سی روٹی کے ٹکڑے کاٹ کر کھانے سے پہلے، ان کو جلانا کون ضروری تھا۔ منو نے پہلے کبھی ڈبل روٹی نہ دیکھی تھی۔

"ابے ملائی کہاں ہے ملائی، او بسند ملائی" چھوٹے بابو نے اسی چلبلے پن سے کہا۔ "جا بی بی جی سے کہہ کہ ملائی بھجوا دیں"

منو سوچتا سوچتا ایک دم چونک پڑا۔

"لے یہ رہی ملائی اور یہ رہا مکھن، دے ان کو کہ ٹھونسیں اور موٹے ہوں۔ آخر مکھن لے کیوں نہیں گیا"

منو نے لحظہ بھر میں مکھن دوسرے کمرے میں پہنچا دیا۔ اور پھر کھڑا ہو کر چاروں طرف تکنے لگا۔ ایسا لگتا تھا چھوٹے بابو کے چلبلے پن اور مسرت میں کوئی مقناطیسی کشش تھی کہ منو کو کھینچے لئے جاتی تھی۔ بڑے بابو نے ہاتھ اونچے کر کے ایک جمائی لی، کنکھیوں سے منو کی طرف دیکھا، اور اپنے ڈھانچے ایسے جسم کو لے

کرکرسی میں بیٹھ گئے، جیسے کوئی فاقہ زدہ ہڈی چمڑا فقیر ہو۔ چھوٹے بابو بڑے اطمینان کے ساتھ کھانے میں مشغول تھے، انھوں نے ٹوسٹ پر مکھن لگالیا تھا اور اسے داہنے ہاتھ میں لئے کھانے میں مشغول تھے۔ بیچ بیچ میں چائے کا ایک ایک گھونٹ بھی اتارتے جاتے تھے۔ لیکن بڑے بابو بھدے پن سے اپنی کرسی پر پہلو بدل رہے تھے، کبھی اپنے اوپر توس کا چورا گراتے کبھی قالین پر پیالی سے طشتری میں چائے انڈیل کر گرم گرم چائے پر پھونکیں مارتے سڑسڑ پی رہے تھے۔ بیچ بیچ میں اپنی لٹکی ہوئی مونچھوں کے بالوں کو اپنی زرد میلی زبان سے چاٹ کر صاف بھی کرتے جاتے۔

"ارے چل مرے، اب تو کہاں جا کے مرگیا" بی بی جی چیخیں غالباً انھوں نے سن لیا تھا کہ شیلا نے اپنے چچا سے منو کو چائے دینے کی اجازت مانگی تھی

"یہاں کام کرنے کو نہیں ہے، تو کیا بھیجا کہ بس ایک کشتی اس کمرے سے اس کمرے میں لے جا کر رکھ دی تو تنخواہ وصول کرلی"

منو اپنی حالتِ زار پر افسوس کرتا ہوا باورچی خانے کو واپس ہوا کیونکہ شیلا کی مہربانی سے اس کے دل پر کافی اثر ہوا تھا۔

"چل سست کہیں کا۔ ان برتنوں کو راکھ سے مل کر صاف کر! چکنائی اور گندگی کا ذرا بھی نشان نہ رہنے پائے" بی بی جی نے چیخ کر کہا منو بیٹھ گیا اور ابھی مانجنا شروع ہی کیا تھا کہ بی بی جی پھر چیخیں۔

"رہے بھگوان، ارے رہنے دے، ارے چھوڑ، تو بالکل نکما ہے مجھے خود ہی کرنا پڑے گا سب کام مجھے خود ہی کرنا پڑتا ہے، بھلا کون ہے جو ذرا بھی ٹھیک کام کر کے دے۔ ارے بے وقوف تجھے نہیں دکھائی دیتا کہ یہ کالک

بالکل چھوٹ جانی چاہیئے بالکل۔ ذرا ان برتنوں کو دیکھ جو الماری پر رکھے ہیں، ان کی چمک کہاں اور تیرے مانجے ہوؤں کی کہاں۔ بالکل ایسا ہی چمکا "

اتنے میں منو کی خوش قسمتی سے دوسرے کمرے میں سے کسی نے بی بی جی کو پکارا۔

"اجی سنو منی کی اماں" بڑے بابو جی آواز دے رہے تھے "یہ بابو رام لال آئے ہیں ذرا ایک پیالی اور لیتی آنا اور ہاں شیلو کے لئے گرم پانی بھی چاہیئے گا۔ شیلا کو بھی نہلا کر اسکول کے لئے تیار کروا دو۔ بابو رام لال کی لڑکیاں تو تیار بھی ہو گئیں۔"

بی بی جی نے الماری میں سے ایک اور پیالی اتاری اور باہر کے کمرے میں لے گئیں۔ ان کی سخت آواز اور زبردست تیور ایک دم نرم پڑ گئے۔

اب منو کی طرف ان کی توجہ کسی قدر کم ہو گئی۔ کیونکہ جب وہ شیلا اور لیلا کو لے کر باہری کمرے سے واپس آئیں تو اسے بابوؤں کے واسطے گرم پانی لے کر باہر بھیج دیا اور خود لڑکیوں کو نہلانے دھلانے اور کپڑے بدلوانے میں لگ گئیں۔

"کیا سور عورت سے بھونکتی ہے جیسے کتیا" منو نے اپنے دل میں سوچا۔ وہ تو پہلے ہی بہانہ ڈھونڈ رہا تھا کہ کسی طرح باورچی خانے سے پیچھا چھڑا کر ڈرائنگ روم میں جائے۔ ڈرائنگ روم کی دنیا ہی الگ تھی۔ ایک بہتر دنیا، جہاں چمکیلے چھوٹے بابو چائے پی رہے تھے۔ اور بڑے بابو بھی تھے جو دیکھنے میں کیسے عجیب لگتے تھے۔ منو کے کان میں یہ بات بھی پڑی تھی کہ اب وہاں ایک اور نئے بابو آکر شامل ہو گئے ہیں۔

ڈرائنگ روم میں ایک پیارا سا چھوٹا سا آدمی بیٹھا کچھ پنجابی کے گیت سنا رہا تھا۔ منو نے ایسے گیت اپنے گاؤں کے میراسیوں اور بھانڈوں کو بھی گاتے سنا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر پُر لطف منظر تو یہ تھا کہ چھوٹے بابو نے اپنے کانوں پر ہیڈ فون کے جھاگ لگا رکھے تھے، اور ایک دندانے دار مشین گالوں پر پھیر رہے تھے۔

پہلے منو سوچنے لگا کہ بابو جی یہ کر کیا رہے ہیں۔ پھر اُسے اپنے گاؤں کے حجام کی دکان یاد آ گئی اور اس کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔

"داڑھی بنا رہے ہیں"، اس نے بڑبڑا کر کہا اور کھڑے ہو کر اس عمل کو غور سے دیکھنے لگا۔ کل جب سے وہ گاؤں سے آیا تھا، اور اس نے جتنی بھی عجیب و غریب چیزیں دیکھی تھیں، ان میں یہ ننھی منی دندانے دار مشین سب سے زیادہ عجیب تھی۔ گاؤں میں تو حجام ایک لمبے سے تیز چمکدار استرے سے لوگوں کے خط بنایا کرتا تھا۔ ایسی مشین اس نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ اس مشین سے کسی قسم کا ڈر نہ ہوگا۔ جبھی تو بابو جی اس مزے سے اُسے گالوں پر پھیر رہے ہیں، اوپر نیچے، اوپر نیچے۔۔۔

"کیا دیکھ رہا ہے بے اُلو"، چھوٹے بابو نے منو کو اتنا غور سے تکتے ہوئے دیکھ کر مست سے کہا۔ انھوں نے بھی جب پہلی مرتبہ سیفٹی ریزر دیکھا تھا تو انھیں بھی ایسی ہی دلچسپی اور تعجب ہوا تھا۔

"بابو جی"، منو نے ذرا رک رک کر پوچھا۔ "اس مشین کے دام بہت زیادہ ہیں؟"

"کیوں"، بابو جی نے شرارت سے طنزیہ کہا "چاند منڈوانا چاہتا ہے۔ باپ مر گیا ہے کیا، یتیم ہو گیا ہے؟"

"میں تو ہوں ہی یتیم" منو نے جواب دیا۔ اسے اپنی حالت پر رونا آرہا تھا۔

"اوہو" نئے آنے والے بابو جی بولے "چھنگلیا برابر کا لونڈا اور خط بنانے کی مشین لینے کا شوق"

"اچھی بات ہے" چھوٹے بابو بولے "اگر آپ مہربانی کر کے مجھے دوسرے کمرے سے تولیا لا دیں تو یہ مشین تو نہیں ہاں ایک بلیڈ آپ کو دے سکتا ہوں۔ پھر اس سے آپ شوق سے اپنا گلا کاٹ لیجئے گا"

منو تولیا لانے کے لئے بھاگا۔ چھوٹے بابو کے لئے اس کے دل میں محبت اور پسندیدگی سے دھڑکن سی ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس چلبلے آدمی کے بہت نزدیک سمجھنے لگا تھا۔

جب وہ تولیا لے کر واپس آیا تو اسے ایک اور معجزہ نظر آیا۔ اس دفعہ بڑے بابو ایک چمکتی ہوئی بیضوی مشین پر ایک چھوٹا سا ہینڈل گھما رہے تھے۔ اس نے دماغ پر خوب زور دے کر سوچنا شروع کیا کہ یہ کیا ہے اور وہ زور زور بابو جی سے پوچھنے ہی والا تھا کہ یکایک اسے وہ مشین یاد آگئی جس پر گاؤں کا حجام اپنا اُسترا تیز کیا کرتا تھا۔

"یہ تیز کرنے کی مشین ہے نا؟" اس نے بابوؤں کو خطاب کر کے کہا وہ چاہتا تھا کہ اپنی دریافت میں ان کو بھی شامل کر لے۔

"ارے او نمک حرام" بی بی جی کی چیخ سنائی دی۔ انھوں نے اسے بابو لوگوں سے بات کرتے سن لیا تھا۔ "اب کہاں اڑ گیا تو، تجھے کام نہیں جو بیکار وقت خراب کر رہا ہے۔ میں نے تجھ سے کیا کہا تھا؟ کہ تیری جگہ باورچی خانے میں ہے، تیری کھوپڑی میں بات نہیں آتی، یا ہڈیاں تڑوائے گا تب سمجھے گا۔ سارا

کام کرنے کو پڑا ہے۔ اس چڑیل کو اسکول جانا ہے، بابو جی کو ابھی دفتر جانا ہے تو نے اپنے پہاڑی دیس میں آٹا گوندھنا تو کا ہے کو سیکھا ہوگا۔ اور تیرے ہاتھ بھی تو گندے ہیں۔ خبردار جو اس گھر کی کوئی کھانے پینے کی چیز چھوئی ہوگی مجھے ہی سب کچھ کرنا ہوگا۔ تجھ پر وشواس کرنا بے کار ہے۔ تو ... ... ،

"تو اب کیا کرنا ہے بی بی جی"

"ارے میرا سر نہ کھا رے۔ تیری آنکھوں سے کچھ کام نہیں دکھائی دیتا۔ اندھا ہے؟ کیا ہے؟ یہ چائے کے برتن دھونے کو پڑے ہیں، ترکاری چھیلنے کو رکھی ہے نا"

منو نے چائے کے برتن دھونے شروع کئے۔ اس نے دیکھا کہ چاک کے یہ برتن پانی ڈالتے ہی صاف ہو جاتے ہیں اور اس نے سوچا کہ یہ تو بڑا آسان کام ہے۔ جلدی جلدی اس نے پیالیاں دھو ڈالیں اور خشک ہونے کے لئے الگ رکھ دیں۔

"ارے یہ کیا کر رہا ہے" بی بی جی اور بھی زور سے چلائیں "چینی کے برتنوں کو بھی راکھ سے مل کر صاف کر۔ بالکل صاف کر جیسے پیتل کے برتنوں کو کیا ہے۔ خبردار ذرا بھی مٹی یا جھوٹن نہ رہنے پائے۔ ہم کچھ صاحب لوگوں کی طرح ملیچھ نہیں ہیں کہ برتن کھنگال کر اس میں کھانا پینا شروع کر دیں گے۔ ہم انھیں افسر سمجھ کر مان دیں وہ دوسری بات ہے مگر ہیں تو وہ لوگ گندے۔ ٹب میں نہاتے ہیں، اسی میں صابن مل مل کر میل چھڑاتے ہیں اور پھر اسی میلے پانی میں پڑے رہتے ہیں۔ بینک والی میم کی آیا کہتی تھی۔ صاحب لوگ مسلمانوں کی طرح گائے کا گوشت اور سکھوں کی طرح سور کا گوشت کھاتے ہیں"

"سور اور گائے کا گوشت تو میں بھی کھاتا ہوں" پریم نے چیڑ خانی

کرتے ہوئے کہا۔ وہ باورچی خانہ میں یہ دیکھنے آئے تھے کہ صندلا خالی ہوا یا نہیں کہ نہالیں۔

"اُدھر مہربانی کرکے چپ رہو۔ ابکائی آتی ہے" بی بی جی نے عاجزی سے کہا۔ "پیچ میں ... ... "

منو بیٹھا برتنوں کو راکھ سے مل مل کر دھوتا جا رہا تھا۔ اور برتنوں کے کونے کھدرے کو بڑی خاص احتیاط سے صاف کر رہا تھا۔ ویسے طبیعتاً بھی وہ ذرا جلد باز ہی تھا اور اس کے ہاتھ بھی ابھی نوکروں کے کام کرنے میں منجھے نہ تھے گھر پہ اس کی چچی اس سے نفرت ضرور کرتی تھی مگر خانہ داری کے سب کام وہ خود ہی کرتی تھی، ان تھک کرتی رہتی تھی۔ خاموشی سے، شکوہ شکایت کئے بغیر، اسے یاد آنے لگا کہ کبھی کبھی اس کے دل میں بھی چچی سے ہمدردی کی ایک لہر سی اٹھتی تھی اور وہ خود ہی گھر کو گوبر سے لیپنے یا ادھر ادھر کا کام کرنے کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیتا تھا۔ اس میں اصل وجہ یہ تھی کہ چچی ہمیشہ تلخی کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ بانجھ تھی اور لوگ اس کے بانجھ پنا کو طعنہ دیا کرتے تھے۔ ورنہ وہ ویسے تو اس کو یاد تھا کہ کئی مرتبہ اس نے اسے اپنے سینے سے لگایا تھا۔ پیار کیا تھا۔ کتنی ہی مرتبہ وہ اس سے لپٹ کر سویا تھا۔ مگر یہ بی بی جی تو بلاوجہ اس سے نفرت کرتی تھیں۔ برتنوں کو گیلے کپڑے سے پونچھتے وقت وہ دل ہی دل میں امید کرنے لگا کہ کبھی نہ کبھی وہ اس طرح کچھ کرنا چھوڑ دیں گی۔ اور اسے اس گھر میں اتنی اجنبیت محسوس نہ ہوگی چھوٹے بابو کافی اچھے ہیں اور بچے بھی اس کا بندر والا ناچ پسند کرتے ہیں، رہے بڑے بابو تو ان سے آنکھ بچائی جا سکتی ہے، مگر یہ بی بی جی ... ...

وہ ایک دم سے رک گیا۔ کیونکہ اسے خیال آیا تھا کہ کہیں بی بی جی سمجھ نہ جائیں کہ وہ اپنے دل ہی دل میں ان کو برا بھلا کہہ رہا ہے۔ اور پھر اس کی خبر

لیں۔ اس کا ذہن ان کپڑوں کی طرف منتقل ہوگیا جو اس نے دوسرے کمرے میں لٹکے ہوئے دیکھے تھے۔ ریشم کے خوش قطع کپڑے جیسے نمونے اس صاحب کو کل پہنے دیکھے تھے۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ چھوٹے بابو کو یہ کپڑے پہنتے دیکھے۔ لیکن جیسے ہی وہ اٹھا سامنے سے چھوٹے بابو آتے دکھائی دیئے۔

"کہئے مہاراج! آپ صندلے سے کام لے چکے، اب مجھے اس پر نہانے کی اجازت ہے؟" انھوں نے ذرا ظرافت سے کہا

"جی ہاں بابو جی" منو نے جواب دیا۔ "میں ... ..."

لیکن اتنے ہی میں بی بی جی اس پر بجلی کی طرح ٹوٹیں۔

"کیوں برتن دھو چکا" انھوں نے ڈانٹ کر کہا "تو اب کدھر چلا؟ اس کمرے میں تیرا کیا کام ہے"

"میں ... ..." اور منو بہانہ ڈھونڈنے لگا۔

"اب گڑھ لے کوئی جھوٹ" انھوں نے تھپڑ اٹھا کر کہا۔ "چل برتنوں کو اٹھا کر رکھ۔ بابو لوگوں کو نہانا ہے نا پھر سبزی کاٹ کر یہاں سے جھاڑو نکال۔ میں نے تجھ سے کہا نا کہ جب تک تجھے بلایا نہ جائے دوسرے کمرے میں ہرگز نہ جانا۔ جب یہ لوگ دفتر چلے جائیں تو تو قالین جھاڑنا اور بستر تہہ کر کے رکھنا۔ پتہ نہیں تجھے یہ سب کام آتا بھی ہے یا نہیں یا مجھے بتانا پڑے گا لیکن ہاں دیکھ ابھی تو رسوئی میں کام ہے اور تو بس ادھر ادھر سونگھتا پھر رہا ہے۔ پہاڑوں پر تجھے کچھ دیکھنا کبھی نصیب ہوا تھا جبھی تو تو ہمارے گھر کی ایک ایک اچھی چیز کو تکتا پھرتا ہے؟"

"افوہ شروع ہوگیا طوفان" پریم بابو پانی کے جگ پر جگ سر پر انڈیلتے ہوئے بولے "ابے گدھے، بچ کر رہنا ورنہ لفظوں کے سمندر کے ساتھ

ساتھ پانی کے ریلے میں بھی بہہ جائے گا "

منو نے اپنی مسکراہٹ دانتوں میں دبا کر دل ہی دل میں چھوٹے بابو کی ظرافت کی داد دی مگر پھر ایک دم اسے بی بی جی کی باتیں یاد آ گئیں اور اس نے ایک گالی چپکے سے دے ڈالی۔ منٹوں میں شیلا اسکول جانے کو تیار ہو گئی اور بی بی جی سے خرچنے کے واسطے پیسے وصول کر چلی گئیں ورنہ منو کی کوئی نہ کوئی ضرورت وہ ضرور ہی پکڑ لیتیں۔ اب تو منو کو یقین ہو چلا تھا کہ کچھ بھی ہو بی بی جی ضرور اسے گالی دینے کا کوئی نہ کوئی بہانہ نکال لیں گی۔ چاہے کوئی غلطی ہو، کوئی معمولی سی ہی بات کیوں نہ ہو، برتن رکھنے پر، جھاڑو پکڑنے پر یا آلو چھیلنے پر، مہلت کے اس لمحہ میں اس کی نگاہ بار بار چھوٹے بابو کے گورے گورے پانی سے چمکتے ہوئے جسم پر پڑنے لگی اور پھر وہاں سے ہٹ کر ان خوش قطع ریشمی کپڑوں کو چھونے لگی جو چھوٹے بابو ابھی پہننے والے تھے۔ اور پھر یکایک نہ معلوم کہاں سے اس کے ذہن میں بڑے بابو کے کالے جوتوں کی تصویر کھنچ گئی، ان کے وہ چمکتے ہوئے سیاہ جوتے اور جوتوں کے وہ چرچ بند سے ہوئے فیتے۔ وہ سوچنے لگا کہ شاید چھوٹے بابو کے پاس بھی ویسے ہی جوتے ہوں گے۔

"شیلا، اری او شیلا" کسی لڑکی کی آواز نے منو کو چونکا دیا

"ہاں ہاں آئی" شیلا نے خوابگاہ سے چلا کر کہا

ایک چھوٹی سی لڑکی، نازک سا گندمی چہرہ، پیارے پیارے خد و خال، ململ کا گلابی دوپٹہ اوڑھے دروازہ میں سے جھانکی۔ شیلا کی اماں اور پھر منو کو دیکھ کر ایک دم سے بولی "اُون ہاں ہاں"

"کیوں ری لمبے بالوں والی چھپل پیری، کہاں بھاگی جا رہی ہے"

چھوٹے بابو لڑکی کو چھیڑتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

"کوشلیا، او کوشلیا، اس گنوار سے ڈر گئی؟ بھلا یہ نمک حرام کیا کر سکتا ہے، تجھے معلوم ہے آج صبح اس نے کیا کیا کیا؟" بی بی جی نے کوشلیا کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ "یہاں مکان کے باہر پاخانہ کر دیا۔ شیلا تیار ہو چکی ہے اسے اپنے ساتھ لیتی جا اور ذرا اچھی طرح اس کی نگرانی کرنا میری بچی کیوں کرے گی نا؟"

"آپ کا یہ نوکر بھی کیسا عجیب ہے" کوشلیا نے پھر اندر جھانک کر کہا۔ "ہمارے بابو جی بتا رہے تھے کہ یہ بندر کی طرح ناچتا بھی ہے۔ اچھا اچھا آؤ شیلا جلدی چلیں میری بہنیں انتظار کر رہی ہوں گی۔ اسکول کو دیر ہو جائے گی"

منو شرم کے مارے زمین میں گڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر اس طرح، صبح کا واقعہ ایک ایک سے کہا جائے گا تو وہ لوگوں کو کیا منہ دکھائے گا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ اس دنیا میں اس کی حقیقت کیا ہے، وہ غلام تھا، محض ایک ذلیل نوکر، جس کا کام ہر فرد کی خدمت کرنا اور گالیاں کھانا بلکہ مار پیٹ برداشت کرنا بھی تھا اگرچہ ابھی اس کی نوبت نہ آئی تھی۔ اس کا دل ڈوب گیا، ساری دنیا میں وہ اپنے کو اکیلا اور تنہا پاتا تھا۔ ایک دم سے چھوٹے بابو ٹسر کی جیکٹ اور صفائی سے استری کیا ہوا پتلون پہنے بڑے کمرے سے اندر داخل ہوئے۔ ان کے سر پر فلالین کی انگریزی ٹوپی تھی اور پاؤں میں خوبصورت چمکتے ہوئے بادامی بوٹ۔ بابو جی کے اس طرح آنے سے منو چونک پڑا۔ اس کا دل اس شخص کی محبت سے بھر گیا تھا۔ وہ اسے اپنا ہیرو سمجھنے لگا تھا اور اس کا سا بننا چاہتا تھا۔

"ابے او بے سینگ کے بھوت، بی بی جی کہاں ہیں" چھوٹے بابو نے پوچھا۔ منو گھبرا تو ضرور گیا مگر خوش ہو کر مسکرا پڑا۔

"یہاں ہوں میں" بی بی جی باہری دروازے سے اندر آتے ہوئے بولیں "کیوں اب تمھیں کیا چاہیے"

"پانچ روپئے۔ میرا بھائی جو چمکتے ہوئے ڈیڑھ سو روپے ہر مہینے کماتا ہے اُس میں سے پانچ عنایت کیجئے" پریم بابو تمسخرانہ انداز میں بولے۔

"مجھے ایک مریض کو دیکھنے شہر کے پرلے حصے میں جانا ہے۔ اور اگر جیب میں روپے کھنکھناتے ہوں تو دنیا سمجھتی ہے کہ آپ کا کاروبار خوب چل رہا ہے اور اپنے سب بیمار رشتہ داروں کو لے کر پہونچتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ روپیہ روپئے کو کھینچتا ہے"

بی بی جی کے چہرے کا تناؤ غائب ہوگیا اور ان کی آنکھوں میں بھی چھوٹے بابو کی آنکھوں کی سی چمک جھلکنے لگی۔ پھر بھی جب وہ دوسرے کمرے میں جانے لگیں تو انھوں نے منو پر ایک قہر کی نگاہ ڈالی جس کا مطلب تھا کہ خبردار جو مجھے تجوری کی طرف جاتے دیکھا۔ یہاں گھر کی تمام دولت جمع ہے۔ لیکن پھر بھی بی بی جی کو یہ اطمینان نہیں ہوا کہ قہر کی جو نگاہ انھوں نے ڈالی تھی اس کا مطلب پورا ہوگیا۔ کیونکہ انھوں نے دیکھا کہ منو ایک کونے سے جھانک رہا ہے۔ انھوں نے کچھ گھبرا کر کنجیوں کو بدلا تاکہ وہ تالا کھلتے نہ دیکھ سکے اور چیں۔

"چور کہیں کا۔ اپنا کام دیکھ، جہاں جہاں میں جاتی ہوں مجھے کیوں گھورتا رہتا ہے"

منو، بی بی جی کے اس الزام سے بیزار ہوکر پھر سبزی چھیلنے لگا۔ پھر اس نے باہری دروازہ بند ہوتے سنا۔ چھوٹے بابو اپنے بڑے بھائی کے ساتھ باہر جا چکے تھے۔

"چل، اب جاکر کمروں میں جھاڑو دے اور بستر تہہ کر دے" بی

بی جی نے واپس آکر کہا۔ اب اُن پر کسی قدر اطمینان اور سکون طاری تھا۔

"جب سے میں سبزی کاٹنے کو چڑھاتی ہوں اور چپاتیوں کے لئے آٹا گوندھتی ہوں"

ڈرائنگ روم کے پرستانی ماحول میں منو کھو سا گیا۔ اکڑوں بیٹھ کر وہ قالین پر سے جھاڑ دیتا جاتا تھا اور اس کی آنکھیں بار بار کبھی ان تختہ نما کرسیوں سے جا جا کر ٹکراتی تھیں جن پر مہاگنی پالش کی ہوئی تھی کبھی مختلف تصویروں کا جائزہ لے کر انھیں سراہنے لگتی تھیں۔ دو تین دفعہ تو اس کی طبیعت بالکل قابو سے باہر ہو گئی اور وہ اٹھ کر تصویروں کو پاس سے دیکھنے لگا۔ تعجب اور اشتیاق کے ساتھ وہ ہر ایک چیز کو دیکھتا تھا، ان کے رنگ ان کی شکلوں کا جائزہ لیتا تھا اور ان کا مطلب نکالنے کی کوشش کرتا تھا، دل ہی دل میں حیران ہو ہو کر سوچتا کہ یہ گھڑی کیسے چلتی ہے، اس کتاب میں کیا لکھا ہے۔ اس بکس میں سے گانے کی آواز کیسے نکلنے لگتی ہے۔

"دیکھو تو کہیں سیلاکوٹ نہ اٹھا دینا" بی بی جی نے کرسی گھسیٹنے کی آواز سن کر پکاریں۔ "میں ابھی آتی ہوں اور تجھے بستر تہہ کرنا بتاتی ہوں"

آخر کو وہ آ ہی گئیں۔ اگرچہ انھوں نے منو کو اس قدر جلدی کرنے پر برا بھلا ضرور کہا پھر بھی ان کا مزاج کسی قدر ٹھنڈا ضرور ہو گیا تھا جب کمرے تمام ہو چکے تو انھوں نے منو کو حکم دیا باہر کے پمپ سے گھڑے بھر لائے پھر اسے حکم ملا کہ باورچی خانے میں بی بی جی کے پاس بیٹھ کر کھانا پکانا سیکھے۔

دوپہر کو منو کا چچا، یا ماموں اور شیلا کے لئے دوں کا کھانا لے جانے کے لئے آیا اور منو سے پوچھنے لگا۔

"کیوں یہاں اچھا لگتا ہے"

منو کا دل چاہا کہ رونے لگے۔ مگر بی بی جو وہاں موجود تھیں۔ اس لئے وہ آنسو پی کر بولا۔

"ہاں مجھے یہاں بہت اچھا لگتا ہے"

لیکن جب دیا رام بیوی جی کی اجازت سے منو کو بھی اپنے ساتھ لے چلا کہ شیلا کا اسکول دکھا دے تاکہ وہ روز وہاں کھانا لے جا سکے، تو راستے میں منو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اس تلخ اور سخت زندگی کا شکوہ کرنے لگا جس سے اسے سابقہ پڑا تھا۔ خاص کر بی بی جی کی ہر وقت کی بدمزاجی اور پھٹکار۔

"تو ان کا نوکر ہے" دیا رام بولا۔ "تجھے ان کے کہنے کا کچھ خیال نہ کرنا چاہئے۔ تجھے بڑا ہو کر کام سیکھنا ہے۔ گھر پر بہت موج اڑا چکا۔ تیری ماں کے لاڈ پیار نے تیرا ستیاناس کر دیا۔ اور چچی بھی تیرے بڑے نخرے اٹھایا کرتی تھی"

منو چپکا سنتا رہا۔ لیکن کھلے میدان میں پہنچ کر اس کی قدرتی انتقام لینے کی خواہش ابھرنے لگی۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ اپنے چچا کو پکڑ کر خوب ہی پیٹے

واپسی پر بی بی جی نے اسے دو چپاتیاں، ایک چمچہ دال اور تھوڑی سی سبزی دی۔ اسے اپنے ہاتھوں ہی پر روٹی رکھ کر کھانا پڑا کیونکہ وہ رذیل تھا اور برتنوں میں اس کو کھانا نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس ذلت پر اس کے دل میں تیر سا لگا، نوالے حلق میں پھنسنے لگے، کھانا بمشکل گلے کے نیچے اترا۔

مگر اب وہ سمجھ چکا تھا کہ ان باتوں کا خیال کرنا فضول ہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد بی بی جی لیلا کو لے کر پڑوس میں کہیں ملنے ملانے چلی گئیں۔

منو نے پھر برتن مانجھنے شروع کئے۔ برتن مانجھتے مانجھتے ساری دوپہر بیت گئی۔ گرمی اور محنت سے اس کا سارا جسم پسینے پسینے ہو گیا اور وہ تھک کر ایک طرف پڑ رہا۔ اتنے میں شیلا اور وہ لمبی لڑکی کوشلیا اسکول سے آ گئیں اور ساتھ میں دو اور لڑکیاں بھی آئیں۔ اور سب کی سب ڈرائنگ روم میں ناچنے لگیں۔ منو کا بھی دل چاہا کہ جا کر ان میں شامل ہو جائے۔ چنانچہ وہ دوڑا اور کمرے میں پہنچ کر وہی صبح والا بندر کا سا ناچ دکھانے لگا۔ لڑکیوں نے پہلے پہل تو اسے دھکے دے کر کہا کہ "تو نوکر ہے تو ہمارے ساتھ مت کھیل"، لیکن پھر انھیں بندر کے ناچ میں دلچسپی ہو گئی اور انھوں نے اسے اپنے ساتھ کھیلنے دیا۔

ذرا دیر بعد چھوٹے بابو کچہری اور بابوؤں کو ساتھ لے کر آئے اور چائے کی طلبی ہوئی۔ بی بی جی بلوائی گئیں۔ چھوٹے بابو کی ظرافت اور چہل کے ماحول میں منو کی روح پھر سے تازہ ہو گئی۔ اور اس کے منہ میں اُن رس گلوں، گلاب جامنوں اور انگریزی مٹھائیوں کو دیکھ کر پانی بھر آیا۔ جو چھوٹے بابو لائے تھے۔ انھوں نے اسے بھی ایک پلیٹ میں کچھ ٹکڑے ڈال کر دے دیئے۔ منو کا دل تو چھوٹے بابو پر جیسے فدا ہو گیا۔ گاؤں میں جس تیزی کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے دوڑ دوڑ کر منو کا کام کیا کرتے تھے۔ اسی تیزی کے ساتھ منو چھوٹے بابو کے ہر اشارے پر دوڑتا تھا۔ اور جب چھوٹے بابو ٹہلنے چلے گئے تو منو کا دل بیٹھ سا گیا۔

چھٹپٹے کے وقت سے بی بی جی کا مزاج پھر خراب ہونا شروع ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا۔ دوپہر بھر انھوں نے اسٹیم جمع کیا ہے۔ اور اب نکال رہی ہیں۔

مصالحہ پیستے وقت زیادہ زور لگانے سے ذرا سا اِدھر اُدھر گر گیا ——— بس ایک طوفان پھٹ پڑا۔

دیگچی چھونے سے پہلے ہاتھ نہیں دھوئے ——— بس گالیوں کی بوچھاڑ آ گئی۔ کھانے پکانے کا سب ضروری سامان تیار کر کے ذرا کی ذرا وہ دیوار سے لگ کر کمر سیدھی کر رہا تھا اور اس کی آنکھ لگنے لگی ——— بس آ گئی قیامت۔

لیکن نیند اس پر ایسی غالب آ رہی تھی کہ نہ تو اس پر گالیوں اور سخت زبانی کی چوٹوں کا اثر ہوا نہ پسلیوں میں لگائے ہوئے ٹھوکوں کا ہی کچھ اثر ہوا۔

بابو جی کے گھر میں منو جلد ہی گھریلو نوکروں کی غلامانہ زندگی کا عادی ہوتا گیا۔ پھر بھی اس نے آسانی سے اس بات کو قبول نہیں کیا۔ جنگل کے آزاد پرندے کے لئے قفس کا عادی ہونا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔

کبھی کبھی صبح کے دھندلکے میں، اپنے کمبل میں لپٹا ہوا وہ اپنے دل سے سوال کرتا۔ "منو میں کیا ہوں؟" ۔ دل نے جواب دیا۔ "میں ہاں میں منو ہوں بابو نتھو رام کا نوکر" ۔ "اچھا تو پھر میں یہاں کیوں ہوں" اس کے ذہن میں ایک کش مکش جاری ہو جاتی۔ دماغ لہروں پہ لہریں لیتا۔ "اس لئے کہ میرا چچا یہاں مجھے لایا ہے کہ میں اپنی روزی کماؤں۔ شاید کبھی وہ مجھے بھی اپنی طرح چپراسی بنا دے گا۔" پھر دماغ میں ایک طوفان سا اٹھتا۔ "یا شاید کہیں اور نوکر رکھا دے کون جانے"

اسے یہ خیال کبھی نہ آتا تھا کہ اپنے آپ سے یہ بھی تو پوچھ دیکھے کہ نوکر کے علاوہ اور میری کچھ ہستی ہے؟ بابو رام نتھو رام مالک کیوں ہیں، میں نوکر کیوں ہوں؟"

اس نے اپنی نوکر والی شخصیت کو قبول کر لیا تھا۔ اس کے نزدیک سیاہ چمک دار جوتے پہننے والے بابو نتھو رام اور ننگے پاؤں پھرنے والا منو، اب ایسے ہی لازم و ملزوم تھے جیسے سورج کا طلوع و غروب جس میں شک و شبہ کی قطعاً گنجائش نہ تھی۔

پھر ایک دم سے اُسے ان مٹھائیوں کا خیال آ گیا جو چھوٹے بابو شام کو لائے تھے، اور جن میں سے انھوں نے بی بی جی کی آنکھ بچا کر تھوڑی سی مٹھائی منو کو بھی دی تھی۔ مٹھائی کے شیرے اور لذت کا خیال کر کے اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ بیشک انگریزی مٹھائی، رس گلوں، گلاب جامنوں اور پیڑوں سے بھی زیادہ نفیس تھی۔ لیکن انھیں تو کوئی صاحب یا بابو ہو تبھی کھا سکتا ہے۔ چھوٹے بابو کی طرح ریشمی کپڑے پہنے، فلالین کی ٹوکری مناسب پہنے ——— اور ہاں جوتے بھی ——— لیکن منو کو جوتے تو بڑے بابو ہی کے زیادہ پسند تھے، چھوٹے بابو کے بادامی رنگ کے بکلس والے جوتے تو ایسے ہی تھے جیسے دکھن کے معمولی موچی بازاروں میں دیہاتیوں کے ہاتھ بیچا کرتے ہیں چھوٹے بابو کے بکس میں کیسے کیسے عمدہ کپڑے تھے، ریشمی رومال اور گرم اونی سوٹ۔ کیسے عمدہ اور کتنے عجیب تھے وہ کپڑے۔ اس کا دل چاہتا تھا کبھی چھو کر دیکھے۔ جب وہ بڑا ہو جائے گا اور ان کپڑوں کو پہن سکے گا تو کبھی وہ ضرور چھوٹے بابو سے کہے گا کہ ایک قمیص اور کوٹ اُسے عنایت کریں۔ انھوں نے ایک ریزر لمبیڈ تو دے ہی دی تھی۔ وہ کتنے فراخدل رکتنے نیک اچھے تھے۔ اور ہوشیار بھی تو کس قدر تھے وہ۔ ان کے پاس جو وہ مشین تھی اور جس میں ربر کی نلکیاں لگی تھیں، اس کا ایک سرا وہ اپنے کان میں لگا لیتے تھے اور دوسرا کسی کے دل پر رکھ کر دوسروں کے دل کی حالت صاف پہچان جاتے

تھے۔ اور بتا دیتے تھے کہ کیا بیماری ہے۔ مخمل لگے ہوئے کیسوں میں ان کے پاس اور بھی کئی مشینیں تھیں، منو کا دل کیسا چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو کبھی ہاتھ لگا کر دیکھے۔ کاش وہ بھی چھوٹا بابو بن سکتا، ڈاکٹر ہو سکتا، اور نہیں تو خیر بڑے صاحب کی طرح، بینک کا ہی کوئی افسر ہوا ہوتا۔ بینک کے افسر کو شہر کے سب لوگ سلام کرتے تھے۔ لیکن ... ...

اسی طرح اس کے دماغ میں برابر ہل چل بھی رہتی تھی۔ کبھی اس کی توجہ بڑے بھولے پن کے ساتھ بار بار اپنی ہستی پر آکر جم جاتی، کبھی اپنے مالک تک پہونچتی اور وہاں سے پھر اس پورے شہر پر چھا جاتی جہاں اس کا مالک بھی کسی نہ کسی کا نوکر اور محکوم تھا۔ اپنے ماحول کی وجہ سے اس میں ایک خاص قسم کی خودی اور خود غرضی پیدا ہو گئی تھی، اسی ماحول کی وجہ سے جسے مٹھی بھر لوگوں نے قائم کیا ہے، وہی سماج جسے چند لوگوں نے بنایا ہے، جو اپنے لئے دولت اور طاقت کے حوالے کر دیتا ہے، اور اسی خودی کی بدولت وہ خود اپنے لئے بھی اسی طرح طاقت اور دولت کا خواہاں رہتا ہے جیسے اس سے برتر لوگ تھے اس نے اسکول میں جتنی بھی کہانیاں پڑھی تھیں، اپنے آباء و اجداد کی، اپنے گاؤں کی، اپنے صوبہ کی، اپنے ملک کی، اپنی پوری تاریخ کی، وہ سب سے اچھی طرح یاد تھیں۔ اور ان کہانیوں میں کیا تھا؟ چند لوگوں کی خود پسندانہ کاوشیں، ان کی دولت کی ہوس، طاقت کا استعمال، عزت کی کوشش، اور دنیا کے ہر بچے کی طرح، بلکہ زیادہ تر بڑوں کی طرح بھی، بڑائی اور [illegible] اور عزت کی اس چکا چوند سے اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ اسے یہ کیسے دکھائی دے سکتا کہ اس کے چاروں طرف ایک ایسا نظام جال کی طرح پھیلا ہوا ہے جس میں [illegible] کی تفریق ہے۔ ایسا نظام جس میں اس کے لئے ہمیشہ کشمکش، ذلت اور [illegible] کی زندگی

بسر کرنا پڑا ہے۔

لیکن جب اس میں زندہ رہنے کی تحریک پیدا کرتی تھی اور یہی وہ چیز تھی جو بار بار اُسے اکسا کر مجبور کرتی تھی کہ فضا میں ہاتھ پاؤں مارے، چاہے وہ بابو جی کی گندی رسوئی میں سانس ہی لینے کی کوشش ہو یا سوکھی روٹیاں حاصل کرنے کی۔ اس کے یتیم وجود کو محبت کی پیاس کا بھی ایک موہوم احساس ضرور ہوتا تھا۔ لیکن ابھی تک تو بقول گاؤں کے پنڈت جی کے "وہ بساطِ تقدیر پر ایک مہرہ" کی طرح مارا پھر رہا تھا۔ پنڈت جی کہتے تھے دنیا میں سب انسان کی یہی حالت ہے۔ اس رنگ رنگیلی دنیا میں رنگ رنگ کے آدمی ہیں اور ان کے مقاصد بھی الگ الگ ہیں، اور جب تک وہ اپنے آپ کو پہچان نہ لے گا اس وقت تک وہ غلام ہی رہے گا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہاں کے لوگ، پہاڑ کے رہنے والے لوگوں سے زیادہ معزز ہیں، اونچے ہیں۔ لیکن کیا یہ لوگ گاؤں کے پنشن یافتہ صوبیدار اور جے سنگھ کے باپ زمیندار سے بھی اونچے ہیں۔ لیکن یہ اسے معلوم نہ تھا کہ آخر یہ لوگ اونچے کس بات سے ہیں۔ وہ اچھے کپڑے ضرور پہنتے تھے اور ان کے پاس سامان بھی عمدہ تھا۔ اور یہ بات منو کو یقین دلانے کے لئے کافی تھی کہ وہ ضرور برتر اور بہتر ہستیاں ہیں مگر اسباب اور وجوہ پر زیادہ غور کرنا تو آتا نہیں تھا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ اس طبقہ کی یہ حقارت آمیز نخوت، آسودگی اطمینان اور وہ خوشی جو ان میں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتی تھی، اس کی مضبوط بنیادیں روپیہ پر قائم تھیں، ان کی وہ تن آسانی اور محفوظ زندگی، ان کی وہ تندرستی یہ سب ان نذاؤں سے طاقت حاصل کرتی تھیں جو روپیہ ان کے لئے مہیا کرتا تھا۔

منو کو اپنے کمتر ہونے کا یقین ہو جاتا اور اپنے آپ کو ایک ذلیل غلام اور نوکر سمجھ کر وہ دل ہی دل میں اپنے گنوار ہونے بدتہذیب ہونے اور جانور

ہونے کا یقین کرنے کی کوشش کرتا کیوں کہ اس کی مالکہ رات دن اُسے یہی کہہ کہہ کر کچوکے لگایا کرتی تھی ۔ وہ بار بار اپنے آپ سے عہد کرتا کہ آیندہ وہ اچھا خادم بننے کی کوشش کرے گا اپنے کو بالکل کاملِ نرین، بہترین قسم کا نوکر ثابت کرے گا ۔ لیکن افسوس! مکمل ہونے کی منزل بڑی کٹھن ہے اور راستہ میں جگہ جگہ گڑھے ہیں ۔ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ وہ اسی قسم کے ایک گڑھے میں اوندھے منہ جا گرا اور اوپر سے مالکہ کے غصہ کا جو طوفان پھٹ پڑا وہ الگ، بات یوں ہوئی کہ ایک دن شام کو انگلینڈ صاحب، بابو نتھو رام کے وہاں چائے پینے کے لئے آئے ۔

انگلینڈ صاحب، امپریل بینک کی شام نگر والی شاخ کے بڑے خزانچی تھے، ان ہی کے دفتر میں بابو نتھو رام سب اکاؤنٹنٹ تھے ۔ انگلینڈ صاحب ایک لمبے قد کے انگریز تھے، چھوٹا سا چہرہ، سپاٹ بشرہ، ضعیف البصر آنکھوں پر موٹے شیشے کا چشمہ لگاتے تھے، ان کی چال بڑی بھدی سی تھی اور چلتے وقت اپنے نوکیلے لمبے پاؤں سے پینتالیس ڈگری کا زاویہ بناتے ہوئے چلتے تھے ۔ ہاں البتہ ان کے پتلے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہر وقت ان کی خوش مزاجی کا اظہار کرتی رہتی تھی، اور یہی مسکراہٹ اس ٹی پارٹی کا سبب بنی ۔

روز صبح کو بابو نتھو رام جب صاحب کو سلام کرتے اور وہ اس کے جواب میں "گڈ مارننگ" کہتے تو بابو نتھو رام کو یہ مسکراہٹ صاحب کے لبوں پر کھیلتی نظر آتی ۔ کوئی شک نہیں کہ یہ مسکراہٹ فرد انگلینڈ صاحب کی نیک دلی کا پرتو تھی ۔ بالکل ویسے ہی جیسے شام نگر بینک کے منیجر رابرٹ ہارن اسکوائر کی چڑھی ہوئی تیوری ان کے کمینے پن کی عکاسی کرتی تھی لیکن پھر

بھی انگلینڈ صاحب بولتے بہت کم تھے۔ اور ممکن ہے یہ مسکراہٹ صرف مہربانی کا اشارہ ہو جو ٹالنے کی غرض سے اختیار کیا جاتا ہو۔ بابو تھورام کے لئے یہ معلوم کرنا اشد ضروری تھا کہ یہ مسکراہٹ اصلی ہے یا بناوٹی کیونکہ وہ اکاؤنٹنٹ کی جگہ کے لئے درخواست دینے والے تھے جہاں ترقی اور تنخواہ کی زیادہ گنجائش تھی۔ اور اس درخواست پر انگلینڈ صاحب سے سفارش لکھوانا چاہتے تھے۔ بابو جی اس جگہ کے لئے مدتوں سے کوشش کر رہے تھے، مگر مشکل یہ تھی کہ بابو فضل الحق اس جگہ پر مستقل طور پر ڈٹے ہوئے تھے، جیسے بابو جی خود اپنی جگہ پر برسوں سے پڑے ہوئے تھے۔

انگلینڈ صاحب نئے نئے افسر ہو کر آئے تھے، بابو جی چاہتے تھے کہ وہ جلد از جلد ان سے سفارش لکھوا لیں، قبل اس کے کہ [illegible] اور انگریز افسر انھیں ہندستانیوں کو حقیر سمجھنے کا سبق پڑھا دیں، قبل اس کے کہ ان کی یہ مہربان مسکراہٹ نفرت میں تبدیل ہو جائے۔ قبل اس کے کہ موسم کی خرابی سے ان کا مزاج چڑچڑا ہو جائے۔ اس لئے بابو جی نے اس کا انتظار نہیں کیا کہ انگلینڈ صاحب سے دوستی ذرا اور بڑھ جائے۔ یا وہ ان کے کام سے اچھی طرح واقف ہو جائیں بلکہ انھوں نے انگلینڈ صاحب کو چائے پر مدعو کر ہی لیا، اگرچہ یہ بات ضرور ہے کہ صاحب کو چائے پر بلانے کے لئے بابو جی کو بہت ہی ہمت سے کام لینا پڑا اور بہت کچھ اور بھی کرنا پڑا۔

ہر روز صبح وہ ہمت کرتے کہ آج وہ صاحب سے گذارش کریں گے، سے زیادہ کچھ اور بھی کہیں گے۔ لیکن تباولہ الفاظ کی کوئی جگہ ہی نہ ملتی تھی، کوئی موقعہ ہی نہیں آتا تھا، یہاں تک کہ کوئی خط کوئی فائل بھی ذریعہ نہیں بنتی تھی، کیونکہ آفس میں تو صاحب سے خطوط وغیرہ لکھوائے جانے سے پہلے

ملاقات ہوتی تھی۔ اور دن بھر فائلوں کی وہ بھرمار رہتی تھی کہ اِدھر اُدھر کی بات کا موقعہ ہی نہ ملتا تھا۔ آخر بابو نتھورام کو صاحب کی مسکراہٹ کے متعلق کچھ ناامیدی سی ہونے لگی۔ اور انھیں روز بروز ہمیشہ سے زیادہ اس بات کا یقین ہونے لگا کہ یہ انگریز لوگ بھی کمبخت بڑے ہی بے مروت اور گھنے ہوتے ہیں۔ نہ کسی سے بات چیت کریں نہ کچھ، جب دیکھو منہ کھولے دوسرے کی صورت تک رہے ہیں۔ پھر کسی نے (دراصل وہ نتھورام کا ایک دوست تھا جو ولایت سے بیرسٹر ہو کر آیا تھا) بابو جی سے کہا کہ انگریزوں سے بات چیت کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ موسم کے متعلق گفتگو شروع کر دی جائے۔ لیکن بابو جی کی پھر بھی ہمت نہ پڑی کہ وہ اس نئی واقفیت کو استعمال کریں اور برابر "گڈ مارننگ سر" ہی کہتے رہے۔ اور انگلینڈ صاحب اپنی خوش طبعی کے ساتھ "گڈ مارننگ" بدبداتے رہے۔ بابو کو دیکھ کر وہ ہمیشہ جینٹیپ سے جایا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ بابو جی عمر میں اُن سے کوئی بیس سال بڑے ہیں۔ لہذا اپنی یہ بے موقعہ عزت ہوتے ہوئے دیکھ کر انگلینڈ صاحب کو ذرا عجیب ہی لگتا تھا۔ اس کے علاوہ بابو جی امیر بھی کافی تھے، الہ آباد بینک میں ان کے چالیس ہزار روپیہ کے حصے جمع تھے۔ اور ویسے بھی بابو جی حکومت کے ایک معتبر رکن تھے اور بینک سب حکومت ہی کے تحت میں تھے۔ اکثر بینکوں کے انگریز ڈائرکٹر بابو جی کی کافی عزت کرتے تھے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں بابو جی کا رویہ اپنی عزت کے مطابق نہیں تھا، اور انگلینڈ صاحب اپنے دل ہی دل میں سوچنے لگتے کہ آرن نے سچ لکھا ہے کہ یہ ہندستانی بھی عجیب تکلیف دہ قسم کے خوشامدی ہوتے ہیں۔

آخر ایک دن بابو نتھورام [illegible]

پیچھے پیچھے چلے ہی آئے اور ایک دم سے اعلان کر دیا۔

"فائن مارننگ سر، ہیوٹی فل ڈے"

انگلینڈ صاحب کی ٹانگیں ذرا لڑکھڑا سی گئیں، وہ جھجکے اور ایکدم سے پیچھے مڑے، جیسے کوئی بجلی گر پڑی ہو۔ ان کا چہرہ گھبراہٹ کے مارے پیلا پڑ گیا۔ پھر آخر انھوں نے اپنے آپ کو سنبھال کر اور ایک تلخ سی مسکراہٹ زبردستی چہرہ پر لا کر کہا۔

"ہاں۔ ہاں ضرور ضرور۔ بہت خوبصورت دن ہے"

صاحب کے انداز میں جو طنز تھا اس کو تو بابو جی کے فرشتے بھی نہیں سمجھ سکے لیکن وہ بہت خوش تھے کہ چلو کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے، حالانکہ بابو جی کی اتنی ہمت نہیں پڑی تھی کہ گفتگو کو اور بڑھائیں اور انگلینڈ صاحب کو چائے پر مدعو کریں۔ وہ برابر آفس میں اپنے ڈیسک پر بیٹھے اس مرحلے کے متعلق سوچتے رہے۔ آخر ایک دن انگلینڈ صاحب نے خود ہی یہ سوچ کر کہ لاؤ بابو نتھو رام کی ذرا تسلی کر دیں، دوپہر کے کھانے کے وقت، اُدھر سے گذرتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کیسے ہیں نتھو رام؟"

"فائن مارننگ" بابو جی ایک دم سے لیجر پر سے اچھل پڑے اور مین بابوؤں کی طرح کان پر قلم رکھتے ہوئے بولے۔

"میری پسند سے ذرا زیادہ ہی اچھا ہے"۔ انگلینڈ صاحب نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"یس سر"۔ بابو جی بولے، ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اور کیا کہیں۔ اور پھر ایک عجیب سی خاموشی طاری ہو گئی جس میں انگلینڈ صاحب

بابو جی کا اور بابو جی انگلینڈ کا منہ تکتے رہے۔

"اچھا تو پھر میں چلا لنچ کھانے، اگرچہ اس گرمی میں مجھ سے کچھ زیادہ تو کھایا نہیں جاتا"

بابو جی موقعہ پاکر جھپٹ پڑے اور بولے۔

"جناب آپ ہندستانی کھانا کھایا کیجئے۔ بہت لذیذ ہوتا ہے"

"کلب کا خان ساماں کبھی کبھی تو سالن پکاتا ہے، مگر وہ مجھے زیادہ پسند نہیں آتا۔ مرچیں بہت ہوتی ہیں"۔ انگلینڈ نے جواب دیا۔

"جناب میری بیوی بہت اچھے اچھے سالن پکاتی ہے۔ آپ کبھی میرے یہاں تشریف لاکر ہمارا کھانا چکھیں" بابو جی کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

"نہیں! مجھے سالن پسند ہی نہیں ہیں" انگلینڈ بولے "آپ کا بہت بہت شکریہ"۔ اور اپنی مقناطیسی مسکراہٹ چہرے پر لاکر وہ جانے لگے۔

"تو آپ کم از کم کسی دن میرے گھر تو تشریف لائیے" بابو تھوڑا دھڑکتے ہوئے دل سے بولے "آپ اگر کسی دن چائے پر میرے گھر تشریف لاکر ہمیں ممنون فرمائیں تو میری بیوی اپنی عزت افزائی سمجھے گی۔ اور جناب میرا بھائی ... ... "

انگلینڈ صاحب پہلے تو نفی میں سر ہلا دینے والے تھے، پھر آخر انھوں نے گھبرا کر سر جھکا لیا۔

"ہاں جناب! ہاں آج ہی جناب"

"نہیں۔ پھر کسی دن"

اس کے بعد سے نتھورام باقاعدہ طور پر صاحب کے پیچھے پڑ گئے۔ دن، دوپہر، شام، ہر وقت وہ صاحب سے درخواست کرتے رہتے کہ ازراہِ کرم چائے پر تشریف لا کر ان کی عزت افزائی فرمائیں۔ آخر صاحب اس بات پر راضی ہو ہی گئے کہ ایک ہفتہ بعد ایک مقررہ دن پر آئیں گے۔

ایک ہفتہ تک بابو جی کے گھر میں اس دعوت کی تیاری ہوتی رہی اور قالینیں دریاں سب اٹھا کر جھاڑی گئیں۔ اور اگرچہ باقی تمام چیزیں تصویریں بوتلیں، شیشیاں، کتابیں، برتن، بچوں کے کھلونے سب ویسے ہی رہے لیکن سب پر ایک چادر اڑھا دی گئی کہ صاف ستھرے نظر آئیں۔

بابو نتھورام کے گھر صاحب کی آمد آمد کی خبر تمام بستی میں پھیل گئی، اور اڑوس پڑوس کے گھروں میں چاروں طرف ٹاٹ کے گندے پردے لٹکا دیئے گئے کہ عورتوں کی زیب و زینت پر غیر نگاہیں نہ پڑنے پائیں۔

انگلینڈ صاحب نے حماقت کر کے اس خاص موقعہ کے لئے اپنا نیلے رنگ کا گرم سوٹ پہنا اور جب وہ اس شان سے آ رہے تھے کہ ایک طرف بابو نتھورام اور دوسری طرف بابو جی کا ڈاکٹر بھائی پریم اور پیچھے پیچھے دیا رام چپراسی تو ان کا گرمی اور پریشانی کے مارے برا حال تھا، ریشمی رومال سے پسینہ پونچھتے، بابو جی کی خوشامد اور اظہارِ ممنونیت سے شرماتے ہوئے وہ دل ہی دل میں سوچتے جا رہے تھے کہ دیکھیں بابو جی کا گھر کیسا ہوگا۔ کہیں ان کے اپنے باپ کے گھر کا سا نہ ہو جو برکشن میں سیمل کی زمین پر ٹوٹا پھوٹا کھڑا تھا اور جسے مسٹر ڈگبے کے ذریعہ کرائے کے سامان سے سجایا گیا تھا۔ اس گھر

میں انگلینڈ صاحب نوکروں والی کوٹھری میں رہا کرتے تھے۔ لیکن یہ تو اس زمانے کی بات ہے جب وہ مڈلینڈ بینک میں کلرک تھے پھر تو وہ چیف کیشیر بن کر ہندستان آ گئے تھے۔ یا شاید ایسا گھر ہو جیسا ہالی وڈ کی ایک تصویر "سوامی کی بددعا" میں عبدالکریم ہندی کا گھر تھا، جہاں بیچوں بیچ ہال میں فوارے چھوٹتے ہوں گے اور ان کے اطراف بابو جی کی متعدد بیویاں، چمکتے زیورات پہنے، لٹکتے ہوئے ریشمی لباس میں ملبوس ناچتی ہوں گی۔ لیکن بابو جی نے جب اُن سپاٹ چھتوں والے کوارٹروں کی طرف اشارہ کیا۔ جو ایک دوسرے سے بھڑے کھڑے تھے تو صاحب کے سب خیالات ہوا ہو گئے۔

"صاحب، صاحب" کا ایک شور اٹھا اور بہت سے لوگ دوڑ کر ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے چھپتے نظر آئے۔

"یہ ان لوگ سخت پردہ کرتے ہیں جناب" بابو تھورام نے صاحب کو سمجھایا۔

"یہ بابو فضل الحق کے گھر کی عورتیں ہیں جو دوڑ دوڑ کر چھپ رہی ہیں" — اور بابو جی اپنے دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ آج تقدیر خوب مات دے رہی ہے کیونکہ انھیں اپنے مسلمان مخالف کو زک دینے کا موقعہ جو مل گیا تھا۔ انگلینڈ صاحب دوسری طرف منہ پھیر کر ایک پریشان سی ہنسی ہنس دیئے۔

"دیکھئے دیکھئے" ڈاکٹر پریم چند چلائے "اپنا سر بچایئے"

بابو جی کے گھر میں برآمدے سے ہو کر بیٹھنے کے کمرے میں جو دروازہ جاتا تھا وہ بہت ہی نیچا تھا اور انگلینڈ کا سر اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچ گیا۔ ان کا گلابی چہرہ گھبراہٹ سے لال انگارہ ہو گیا۔ کمرہ دس فٹ لمبا اور چھ فٹ

چوڑا تھا اور اس وقت تو اور بھی اس میں کھڑے ہونے تک کی جگہ باقی نہ تھی کیونکہ دیا رام چپراسی اور بابو نتھو رام ایک ساتھ صاحب کے بیٹھنے کے لئے کرسی اٹھانے کو دوڑ پڑے تھے۔ انگلینڈ صاحب بچوں بیچ میں کھڑے چاروں طرف سامان پر نظر ڈال رہے تھے اور اپنے تئیں ایسا بلند سمجھ رہے تھے۔ جیسے قطب مینار! ۔ کھڑے کھڑے تو انھیں کچھ زیادہ دکھائی نہیں دیا ہاں جب وہ اس تخت نما کرسی پر بیٹھ گئے تو ان کا منہ گنیش کی مورتی کی طرف ہو گیا جس پر سوکھے پھولوں کا ایک ہار لٹک رہا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ یہ ضرور کوئی متبرک بت ہوگا ـــــ کوئی کافروں کا بت۔ ولیلین کے جس گرجا میں وہ اپنی ماں کی ساتھ جایا کرتے تھے وہاں ان بتوں سے سخت نفرت کرنا سکھایا جاتا تھا۔

"جناب یہ عقلمندی، دنیا داری اور دولت کا دیوتا ہے" بابو نتھو رام نے ان الفاظ کو انگریزی میں نہایت شان کے ساتھ ادا کیا کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ ان کی جاہل بیوی، کہیں نہ کہیں سے چھپی ہوئی ضرور سن رہی ہوں کہ میرا میاں ایک انگریزی صاحب سے برابری سے بات کر رہا ہے۔

"چپ، بہت چپ" صاحب بڑبڑائے۔

"انگلینڈ صاحب! میں مزید تعلیم کے لئے ولایت جانے کی امید کر رہا ہوں" ۔ ڈاکٹر پریم چند بولے۔ وہ نسبتاً زیادہ بے تکلفی سے بول رہے تھے کیونکہ وہ ایک آزاد ڈاکٹر تھے۔ کوئی اپنے بڑے بھائی کی طرح صاحب کے ماتحت تو تھے نہیں۔

"اچھا! سچ مچ!" صاحب نے کہا۔ ولایت کا نام سن کر وہ ذرا چمک اٹھے جیسے ہندستان میں ہر انگریز کرتا ہے۔

"آپ کا تو وہاں بڑا سا مکان ہوگا" پریم چند بولے۔ "اور شاید آپ مجھے تعلیم کے نصاب وغیرہ کے متعلق بھی بتا سکیں گے"

"ہوں" انگلینڈ نے جواب دیا لیکن یہ سوچ کر شرم کے مارے لال ہو گئے کہ اگرچہ ان دیسیوں کے سامنے انھیں اپنی شان رکھنی پڑتی تھی لیکن دراصل ان کا کوئی مکان وکان نہیں تھا۔ رہا برکشن والا گھر تو اس کے تو ابھی پورے دام بھی ادا نہ کئے گئے تھے اور نہ تو وہ کبھی یونیورسٹی گئے تھے اور نہ ہی انھیں تعلیم کے کورس اور نصاب کا کچھ پتہ تھا۔ انھوں نے تو صرف لینڈ بینک میں نوکر ہونے سے پہلے بس صرف ایک اسکول میں ٹائپ رائٹنگ کا ٹیمپین کورس البتہ سیکھا تھا۔ ان کا دل چاہنے لگا کہ تمام بات صاف صاف کہہ ڈالیں، کیونکہ دراصل وہ بے حد ایمان دار آدمی تھے، لیکن مشکل یہ تھی کہ کلب میں ان کے جتنے ہموطن تھے وہ سب اس بات پر زور دیا کرتے تھے کہ اگر ضرورت پڑے تو اپنے کو کنگ جارج ہی کا بیٹا ظاہر کرو۔ اس طرح ان کے دل میں جو ایک چور تھا۔ وہ ان کی گھبراہٹ میں اور بھی اضافہ کر رہا تھا۔

"یہ ہمارے پورے خاندان کی تصویر ہے جو میری شادی کے موقعہ پر لے گئی تھی" ۔ بابو نتھورام دیوار میں لگی ہوئی ایک بھاری فریم کی تصویر کیل سے اتارتے ہوئے بولے۔ اور اس سلسلہ میں دو کیلیں جو اور لگی ہوئی تھیں وہ نیچے آ رہیں۔ مدھو جو دروازہ میں کھڑا ہوا گلابی رنگت والے نو وارد کو تک رہا تھا، جلدی سے انھیں پکڑنے لپکا۔ انگلینڈ صاحب نے حیرت کی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ اتنے میں بابو جی نے صاحب کے گھٹنوں پر وہ تصویر جما ہی دی۔ انھیں یہ بالکل خیال نہ آیا کہ وہ کس قدر

آزادی سے کام لے رہے تھے۔ انگلینڈ صاحب نے تصویر کو دونوں جانب سے پکڑا اور غور کرتے ہوئے اپنی آنکھیں اس قدر قریب لے آئے کہ شیشے سے جا لگیں۔ منو کو بھی گھلنے ملنے کی اس قدرتی شوق نے اکسایا جس کے آگے بڑائی اور چھوٹائی کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ وہ بھی صاحب کے بالکل پاس آ کھڑا ہوا کہ تصویر دیکھنے میں حصہ لے۔

"چل بے گدھے" بابو جی نے آہستہ سے کہا، اور اپنی سوکھی نوکیلی کہنی سے منو کی پسلی میں ایک ٹھوکا دیا۔

انگلینڈ صاحب کسی قدر مطمئن ہو کر بیٹھ ہی رہے تھے کہ اس قصے نے انھیں پھر گھبرا دیا۔ بھلا انھیں کیا معلوم کہ منو کون ہے۔ کیا معلوم شاید بابو کا لڑکا ہی ہو۔ اگر ایسا ہے تو نتھو رام کو اسے اس طرح تو نہیں بھگانا چاہئے تھا اگرچہ انھیں اس بات کی خوشی ضرور ہوئی کہ میلے کپڑوں والا لونڈا جو سونگھتا پھر رہا تھا بھگا دیا گیا۔ بارن نے لکھا ہے کہ یہ دیسی لوگ سب جلدی امراض میں مبتلا رہتے ہیں اور سڑکوں پر کوڑھیوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے اس کا کہنا بھی صحیح ہی معلوم ہوتا ہے۔

"نوکر ہے یہ لڑکا" بابو نتھو رام صاحب نے ذرا حقارت کے انداز میں کہا تاکہ منو کے ساتھ ان کا جو برتاؤ ہے وہ حق بجانب سمجھا جائے۔ صاحب نے لب سکیڑ کر اور آنکھیں بھینچ کر، نفرت کے اظہار میں سر ہلایا۔

"یہ میری بیوی ہے" نتھو رام نے تصویر میں ایک ہستی کی طرف [illegible] ہوئے کہا جو کپڑوں اور زیورات سے لدی ہوئی گڑیا کے جیسی [illegible] تھی، پاؤں کرسی سے لٹک رہے تھے، اور دوہرے گھونگھٹ سے منہ بالکل چھپا ہوا تھا۔ انگلینڈ صاحب نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح

تصویر میں صورت دیکھ پائیں لیکن جب نہ دیکھ سکے تو اپنی ضعیف البصری کو دل ہی دل میں کوستے ہوئے بابو جی کی بیوی کی تعریف میں بولے۔

"نائیس۔ ویری نائیس" ۔ اور پھر اپنے ہاتھوں پر نظر ڈالتے ہیں تو تصویر کے پیچھے جو مٹی لگی ہوئی تھی وہ تمام ہاتھوں میں بھر چکی تھی اور سارے پتلون کا ستیاناس کر چکی تھی۔ ان کے ابروؤں پر بل پڑ گئے۔

"میری بیوی پردہ نہیں کرتی ہے مگر وہ شرماتی بہت ہے" بابو جی معذرت کے انداز میں بولے۔ "اس لئے وہ یہاں نہیں آئے گی جیسا کہ ..... آپ کے ملک کی خواتین کا دستور ہے"۔ پھر اسی سانس میں وہ پھر تصویر پر پلٹ آئے۔ "اور یہ فرد می ہے حضور دولھا بنا ہوا۔ جب میں جوان تھا"

انگلینڈ نے تصویر میں ایک بڑی سی پگڑی باندھے ہوئے ایک شخص دیکھا جو نتھو رام کا ذرا پتلا ایڈیشن معلوم ہو رہا تھا۔ جو کانوں میں مُرکیاں، گلے میں بہت سے ہار اور سفید رنگ کے انگریزی نما ہندستانی کپڑے پہنے تنا ہوا بائیں ہاتھ سے اپنی دھن کی کرسی کے ہتھے کو سہلا رہا تھا۔ اور داہنے ہاتھ سے تمام دنیا کو ایک یورپین رسٹ واچ کا دیدار کرا رہا تھا۔

پھر انگلینڈ صاحب کی نگاہیں ان سیاہ سیاہ انسانی پیکروں پر پڑیں جو تصویر میں پیچھے کی طرف کھڑے تھے اور پھر ان دو لڑکوں پر آکر جم گئیں جو نیچے لیٹے تھے۔ کہنیوں کے بل ایک دوسرے سے سرمائے جیسے وکٹورین زمانہ کی کرکٹ ٹیموں کی تصویروں میں فالتو کھلاڑی ہوتے ہیں۔

"ایں۔ ایں۔ ویں۔ ایں۔ ایں۔ آئی۔ آں"

گراموفون میں سے کسی کی گلے بازی کرنے کی آواز بلند ہوئی، ڈاکٹر

پریم نے اس عرصہ میں گراموفون چلا دیا تھا۔

منو دوڑا ہوا دروازے پر پہنچا۔ دراصل بکس کا گانا سننے لیکن بہانہ یہ بنایا کہ چائے کی تیاری کی اطلاع دینے۔ شیلا جو ابھی اسکول سے آئی تھی وہ بھی آپہونچی۔

"جنبا یہ ہماری ہندستانی موسیقی ہے"۔ بابو نتھو رام فخر سے بولے "یہ جانکی بائی الٰہ آبادی کی گائی ہوئی ایک غزل ہے میری بڑی لڑکی" وہ شیلا کی طرف اشارہ کرکے بولے۔ اور پھر اس سے مخاطب ہوکر کہنے لگے۔

"آؤ صاحب سے ملو"۔ بچی شرما گئی اور اسی جگہ اڑی کھڑی رہی اور عجیب طرح سے مسکراتی رہی۔

اب تو انگلینڈ صاحب کی پریشانی کی انتہا نہ تھی، وہ پسینے پسینے ہوئے جارہے تھے۔ ایں۔ ایں۔ ویں۔ ویں کی آواز جو گراموفون سے نکل رہی تھی وہ اور بھی ناقابل برداشت ہوئی جارہی تھی۔ صاحب کے کان تو بس زیادہ سے زیادہ۔ یا اسی قسم کی اور کچھ موسیقی کے عادی تھے۔ اور پھر بچوں کا گھور گھور کر دیکھنا اور بھی انھیں شدت سے محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگے کہ جلدی کہیں چھٹکارا ہو۔ اور افسوس کر رہے تھے کہ ناحق یہ مصیبت مول لی۔

"جا چائے کا سامان لا" بابو نتھو رام نے منو سے کہا۔

"اچھا بابو جی" منو نے نہایت ہی خوشی سے بھاگتے ہوئے کہا۔

[illegible] اپنے چچا دیا رام سے ٹکراتے ٹکراتے بچا، جو بہت سی شیرہ بھری ہوئی مٹھائیاں ہاتھوں میں لئے آرہا تھا۔ اور بہت سے بین کے کپڑے بھی جو بی بی جی نے دوپہر بھر بیٹھ کر بہت سے میٹھے تیل میں تلے تھے۔

بی بی جی نے منو کو دوڑتے
دیکھا اور گالی ان کی زبان پر آتے آتے رہ گئی۔ لیکن آج وہ بہت خوش تھیں
البتہ انھوں نے اس پر ایک قہر کی نگاہ ضرور ڈالی۔ اور انگریزی پیسٹری کی
پلیٹوں کو اپنی رسوئی کے حدود سے الگ کھسکاتے ہوئے منو کو حکم دیا کہ انھیں
اٹھا کر ڈرائنگ روم میں لے جائے۔ لیکن منو بھی خوشی کے مارے پھولا نہیں
سما رہا تھا۔ اپنے مالک کے گھر صاحب کی آمد سے اسے جو خوشی تھی اس کے
آگے بی بی جی کا تیوری چڑھانا کیا حقیقت رکھتا تھا۔

اس نے پلیٹیں ہاتھوں میں اٹھالیں اور مٹھائیوں کو دیکھ کر اس کے
منہ میں پانی بھر آیا۔ پیسٹری کی پلیٹیں لے جاکر اس نے اس ٹیبل پر رکھ دیں جو
اصل میں لکھنے کا تھا لیکن فی الحال کھانے کی میز کا کام دے رہا تھا۔

اس درمیان میں بابو نتھورام نے صاحب کے سامنے کھانے
پینے کی چیزیں پیش کرنی شروع کر دی تھیں۔ انھوں نے اپنے ہاتھ میں دو پلیٹیں
لیں اور انھیں انگلینڈ صاحب کی ناک کے بالکل پاس لے آئے۔

"جناب یہ ہماری بہت مشہور مٹھائی ہے۔ اسے گلاب جامن
کہتے ہیں" وہ کہنے لگے "یہ دوسری مٹھائی رس گلا کہلاتی ہے
اور خالص ملائی سے بنائی گئی ہے۔ اور اسے گلاب کے عرق
کی خوشبو سے بسایا گیا ہے۔ یہ خاص طور پر میں نے حلوائی کو
آرڈر دے کر بنوائی ہیں"

رس گلے اور گلاب جامنوں کو دیکھ کر اور ان کی خوشبو سے صاحب
کو متلی سی ہونے لگی اور ان چپچپی شیرہ بھری مٹھائیوں کو اپنے احساس لطیف
پر حملہ کرتے دیکھ کر وہ پیچھے کو ہٹے اور بڑبڑائے۔

"نہیں۔ نہیں۔ شکریہ"

"ہاں جناب، ضرور جناب۔ ہاں جناب" بابو نتھو رام اصرار کرنے لگے۔

اگر انگلینڈ صاحب کو ایک اور پلیٹ اور ایک کانٹا یا چمچہ ہی دے دیا جاتا تو غالباً وہ ایک ڈلی مٹھائی کی لے لیتے۔ لیکن ان سے یہ امید کی جا رہی تھی کہ ہاتھ سے اٹھائیں گے۔ انگریز سے اس کی توقع ہی کرنا غلط تھا کیونکہ وہ تو کبھی مرغ کی ہڈی تک کو وصول کرنے اور اس کا مزا لینے کے لئے ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

"تو پھر کچھ پکوڑے لیجئے۔ میری بیوی پکوڑے بنانے کی خاص ماہر ہے یہ میری بیوی کا خاص پکوان ہے لاؤ دیا رام" ۔

چپراسی بین کے پکوڑوں کی پلیٹ لے کر آگے بڑھا، سرخ سرخ، چکنے بین کے پکوڑوں کی تیز خوشبو صاحب کی طبیعت میں صفراوی ہیجان پیدا کرنے کے لئے کافی تھی۔ انھوں نے پکوڑوں کو ایسے دیکھا جیسے وہ سنکھیا ہوں۔

"نہیں۔ نہیں شکریہ۔ میں نے آج لنچ ویرے کھایا تھا"

"اچھا جناب! اگر آپ ہندستانی مٹھائیاں پسند نہیں کرتے تو پھر مہربانی کر کے آپ یہ انگریزی پیسٹری تو کھائیے۔ میں نے خاص طور پر ارسٹانیفلس کے یہاں سے آرڈر دے کر بنوائی ہیں آپ کو کھانا ہی ہوگا جناب"

پیسٹریوں میں بھی چینی کی آکسنگ کی ایک موٹی تہہ جمی تھی،

"نہیں۔ نہیں۔ شکریہ۔ موسم اس قدر گرم ہے کہ میں کچھ کھا نہیں سکتا۔ انگلینڈ [illegible] کہا کہ شاید اس

طرح جان چھوٹ جائے۔

اب تو بابو نتھورام بہت ہی مایوس ہوئے۔ اگر صاحب نے کچھ کھایا ہی نہیں اور ان کے ممنونِ احسان نہ ہوئے تو پھر وہ سفارش کس طرح حاصل کر سکیں گے۔

"جناب جناب" انھوں نے اصرار کر کے انگلینڈ صاحب کے بالکل منھ کے پاس سب چیزیں بڑھانی شروع کر دیں۔ "کچھ تو کھائیے، کوئی چیز تو چکھئے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ سچ مچ نتھورام۔ آپ کا بہت بہت شکریہ" انگلینڈ صاحب بولے "میں ایک پیالی چائے پی لوں گا اور پھر مجھے جانا ہے آپ تو جانتے ہیں۔ میں بہت مصروف آدمی ہوں"

"جناب" نتھورام بولے۔ جذبات سے اُن کے ہونٹ کانپنے لگے تھے "مجھے تو امید ہے کہ جو کچھ خاطر مجھ غلام سے ہو سکے گی آپ اسے قبول فرمائیں گے۔ لیکن ہاں! آپ چائے پئیں گے! چائے لاؤ۔ ابے او منو چائے لا"

منو چائے کی ٹرے لئے جلدی جلدی آ ہی رہا تھا۔ اپنے آقا کی آواز سن کر وہ تیزی سے دوڑا۔ کشتی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور چشم زدن میں تمام چائے کے برتن ٹوٹے ہوئے باورچی خانے کے فرش پر پڑے تھے انگلینڈ صاحب نے بھی جھنا کا سنا اور سمجھ گئے کہ کوئی آفت نازل ہو گئی۔ بابو نتھورام کا دل بیٹھ گیا۔ اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی کے پانچ روپے انھوں نے اس ٹی پارٹی پر خرچ کئے تھے۔ لیکن سب ضائع ہو گئے۔

ڈاکٹر پریم چند بڑی احتیاط سے باورچی خانے میں داخل ہوئے

بی بی جی کو زبردستی خاموش کیا۔ بچی ہوئی چائے اور دودھ کو ایک جگہ جمع کر کے ایک پیالی میں ڈالا، اور پھر پیالی کو ایک صاف طشتری میں رکھ کر لے آئے اور نہایت اطمینان سے ایک تمسخر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولے،

"مسٹر انگلینڈ! یہ ہمارا نوکر منو جانتا ہے کہ جاپانی ٹی سٹ پونے دو روپے کو ملتا ہے، تبھی تو وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ کتنی پیالیاں اور طشتریاں اس کے ہاتھ سے ٹوٹتی ہیں"

مسٹر انگلینڈ گرمی کے مارے پسینہ میں شرابور ہو رہے تھے، گھبراہٹ اور غصے سے ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ انھوں نے چائے کی پیالی لی۔ اور دھیرے دھیرے پینے لگے۔ چائے خوب گرم تھی۔ ان کے ہونٹ اور زبان جھلس گئے۔

"اب مجھے جانا چاہیے"، انھوں نے کہا۔ اور تخت نما کرسی والی معزز جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"جناب! ہم لوگوں کو بہت مایوسی ہوئی"، بابو نتھو رام جھینپتے معافی مانگتے ہوئے بولے "لیکن مجھے اور میری بیوی کو امید ہے کہ آپ پھر کبھی تشریف لائیں گے"۔ پھر وہ دبے ہوئے صاحب کے پیچھے پیچھے باہر نکلے۔ انگلینڈ صاحب ایک دفعہ کچھ بوکھلا کر مڑے اور پھر گھبراہٹ سے قدم اٹھاتے چلے۔

"دیکھیے دیکھیے آپ کا سر" ڈاکٹر پریم چند نے عین موقعہ پر پھر صاحب کو خبردار کیا، ورنہ نیچے دروازہ سے ضرور ان کا سر ٹکرا جاتا۔

"تھینک آف ٹرنون"۔ انگلینڈ صاحب نے مسکرائے۔ لیکن پھر ایک دم ہی ان کے چہرے پر سختی کے آثار نمایاں ہو گئے اور وہ خاموشی کے ساتھ

باہر نکل کھڑے ہوتے۔ بابو نتھو رام اور دیا رام ان کے پیچھے پیچھے تھے، اور چاروں طرف بہت سے آدمی بچے وغیرہ کھڑے ان کو تعجب اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

چائے کی دعوت ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ گئی۔ صاحب کے جانے کے بعد ڈاکٹر پریم چند کھانے پر ڈٹ گئے۔ وہ تہیہ کئے ہوئے تھے کہ مٹھائیوں سے جی بھر کر لطف اندوز ہوں گے۔ لیکن ان کی بھابی منو پر چیخ رہی تھیں۔

"دے تو مرجائے، تیری ہڈیاں ٹوٹیں، تو غارت ہو، اندھا کہیں کا! ارے خبر بھی ہے کیا کر بیٹھا تو؟ نہ جانے اس نرکھ میں بھلے کون سی منحوس گھڑی تھی کہ تو ہمارے گھر آیا تھا کہ جو کام کرتا ہے اس کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ ایسا چائے کا سٹ تیری ایک مہینہ کی تنخواہ میں آئے گا"

"یہ اگر نیز تو ٹبا ہی بدمذاق نکلا" پریم چند اندر آتے ہوئے بولے "کچھ بھی تو نہیں کھایا اس نے"

"یہ سب اس نمک حرام کا قصور ہے" بی بی جی منو کی طرف اشارہ کر کے چیخیں "یہ مرجائے"

"واہ بھئی! اس بندر کی سی صورت والے انسان کی بدمذاقی کا ذمہ دار یہ غریب کیسے ہو گیا" پریم چند نے پوچھا۔ "اور آپ کے گھر میں جو یہ سب اثاثہ بھرا پڑا ہے، جس کو دیکھ کر صاحب خفا ہو گئے اس میں اس کا کیا قصور"

"تم اس مرے کو سر پر نہ چڑھایا کرو پریم" بی بی جی بولیں۔ "اس پہاڑی گنوار کے آنے سے پہلے ہمارا گھر بالکل صاحب لوگوں کا

گھر لگتا تھا۔ اسی نے سب خرابی کی ہے، جنگلی کہیں کا، ایسا اچھا چائے کا سٹ توڑ کر رکھ دیا "

"خیر بھئی" پریم چند نے مزاحیہ لہجے میں کہا، "آج کل تو چار آنے کی کوئی جاپانی چیز خرید دو تو ایک دھوپ کی عینک مفت ملتی ہے۔ تو اب تو ہم سب کے لئے عینکیں آجائیں گی۔ آپ سمیت بی بی جی "

منو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہنسے یا روئے۔ جب اس کے ہاتھ سے چینی کے برتن گرے تھے تو خوف کا ایک دھچکا سا اس کے دل پر لگا تھا، اور ڈر کے مارے اس کی جان مٹھی میں آگئی تھی۔ اور اس نے چپ سادھ لی تھی چھوٹے بابو کے مذاق سے اس کی رگوں میں جیسے نیا خون دوڑنے لگا اور وہ چونک کر مسکرا دیا۔ بی بی جی رسوئی کے پاس جہاں بیٹھی تھیں، وہاں سے ایک دم جھپٹیں، اور نڑاسے ایک طمانچہ اس کے گال پر رسید کیا۔

"نمک حرام" وہ چیخ کر بولیں۔ "ہمارے گھر پر نحوست لایا، جا نہیں کہیں کا۔ کتنا کتنا سکھایا مگر... ... "

"اوہ چھوڑو اس غریب کی جان۔ اس کا بھلا کیا قصور ہے" اتنے میں بابو جی آنکھوں میں آنسو بھرے اندر داخل ہوئے، "جبھی جو میں نے تیرے رونے کی آواز سنی۔ جان سے مار ڈالوں گا، گدھا کہیں کا "

آج یہ پہلا موقعہ نہ تھا کہ منو اپنے آنسوؤں اور اپنی ہچکیوں کو دبا کر سویا۔ کئی دن تک وہ اس طرح کھویا ہوا کام میں مصروف رہا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ اس کے ہاتھ کام میں لگے ہوتے مگر دل اڑا اڑا پھرتا۔ اس کا جی چاہتا

تھا سب کچھ چھوڑ بھاگے۔ اور چھٹی کے لمحوں کا انتظار کرتا رہتا تھا۔

اسے ہفتہ میں آدھے دن کی چھٹی ملتی تھی۔ اس ہفتہ چھٹی والے دن وہ برابر منہ پھلائے کام میں لگا رہا۔ بی بی جی نے بھی دیکھا کہ منو کا منہ لٹکا ہوا ہے اور انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اسے چھٹی نہ دیں گی۔ انھیں معلوم تھا کہ چھٹی کے اوقات میں وہ اپنے چچا کے پاس جاتا ہے اور وہ یہ ہرگز نہیں چاہتی تھیں۔

دیا رام کو معلوم ہوا کہ منو کے ساتھ کیسا برا برتاؤ کیا جاتا ہے لیکن آج منو کو نہ صرف لگاتار جھڑکیوں گالیوں اور ڈانٹ سے بچنے کی خواہش تھی بلکہ اس کے دل میں اپنے یہاں کا سا کھانا کھانے کی بھی ہوک اٹھ رہی تھی ـــــ دال اور چاول کھانے کی جو اس کا چچا اپنی کوٹھری میں پکایا کرتا تھا اور چھٹی کے دن جب منو اس سے ملنے جاتا تھا تو اسے بھی تھوڑا سا دیدیا کرتا تھا، اس لئے جب بی بی جی بابو جی کے آگے کی تھالی میں سے بچی ہوئی شلجم کی بھجیا اسے دینے لگیں تو اس نے کھانے سے انکار کر دیا اور اس بات کا اعلان کیا کہ میں اپنے چچا کے یہاں جا رہا ہوں۔

"ارے دیکھو! کیسا کلجگ آگیا ہے" بی بی جی اپنے میاں کو مخاطب کر کے بولیں "ارے سنا تم نے کچھ! یہاں کا کھانا اسے نہیں بھاتا۔ ہے بھگوان نہ برتن مانجھے اور نہ دھویا دھایا۔ اور کہتا ہے چچا کے یہاں جاؤں گا۔ اب مجھے دن بھر گھس گھس کرنی پڑے گی۔ ہے ہے۔ ایسے نوکر کو رکھنے سے کیا فائدہ؟"

"کیوں بے؟" بابو جی نے اپنا چہرہ غصے سے سکوڑا "جو دیا جاتا ہے وہ کھانا کیوں نہیں؟ بڑا نواب کا بچہ ہے جو شلجم دیکھ کر منہ بناتا ہے چل نکل یہاں سے۔ جا اپنے چچا کے یہاں جا کر دال بھات کھا!

چل ۔"

منو کو تو "چل" سننا کافی تھی ۔ فوراً کل بھاگا ۔ پہاڑ سے اترتے وقت اس کو ان تمام پریشانیوں کا خیال آیا جو اس گھر میں اس پر گذری تھیں ۔ ان ذلتوں کا ہجوم اس پر چھا گیا جو اس نے برداشت کی تھیں ۔ اس نے بڑی بہادری سے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کی ۔ لیکن اس کا سارا وجود کانپنے لگا ۔ سارے جسم سے گرمی کی لہریں اٹھ کر بادل کی طرح اس کے سرخ چہرے پر چھا گئیں اور ٹپ ٹپ قطرے ٹپکنے لگے ۔ بینک کے نکڑ پر پہونچ کر جب وہ اس گلی میں داخل ہوا جو نوکروں کے کوارٹروں کو جاتی تھی تو اس نے اپنی دھوتی کے کنارے سے اپنا منہ پونچھ ڈالا اور داہنے ہاتھ سے اپنی ناک پکڑ کر چھینک ڈالی ۔

دیارام اپنی چھ فٹ مربع چھوٹی سی تاریک کوٹھری میں ایک صاف ستھرے پلنگ پر پڑا خراٹے لے رہا تھا ۔ کوٹھری میں سوائے ایک مٹی کے چولھے ، ایک ٹین کے بکس اور چند پیتل کے برتنوں کے اور کچھ نہ تھا ۔ منو پنجوں کے بل آہستہ سے اندر داخل ہوا اور اپنے چچا کے داہنے پاؤں کے انگوٹھے کو پکڑ کر ہلایا کہ وہ جاگ جائے ۔

"کون ہے ؟ کیا چاہئے ؟" دیارام شیر کی طرح دھاڑا اور آنکھیں کھول دیں ۔

"کچھ کھانا بچا ہے چچا ؟" منو نے کہا

"ابے حرامی ! یہ میرے پاس کھانے کے لئے آنے کا کون سا وقت ہے ۔" دیارام سانپ کی طرح اپنی لال زبان نکال کر پھنکارا

"کیا بابو جی کے گھر تجھے کھانے کو نہیں ملتا ؟"

"تو پھر مجھے کچھ پیسے ہی دے دو کہ بازار سے کھالوں ۔"

منو کے پاس خود کبھی پیسے نہیں رہتے تھے کیونکہ باپو جی اس کی تنخواہ کے نہیں روپے اس کے چچا کو دے دیا کرتے تھے۔

"ابے کتیا کے پلے!" دیارام اٹھ بیٹھا اور لگا گرجنے "اگر تو اس طرح ساری تنخواہ خرچ کر دے گا، تو تیرے لئے کپڑے کہاں سے بنواؤں گا۔ جوتے کہاں سے لے کر دوں گا"

"لیکن تم نے میرے لئے کپڑے خریدے ہی کب؟" منو نے جواب دیتے ہوئے کہا "میں تو وہی پھٹی دھوتی پہنے ہوں جو بی بی جی نے مجھے دی تھی، اور جوتے بھی تم نے کہاں دلوائے؟"

"ابے ہو ننھی سی جان گز بھر کی زبان گستاخ کہیں کا" اور دیارام نے لپک کر منو کی گردن دبالی "تو تو مجھ سے حساب مانگتا ہے سور کا بچہ تجھے اتنے دن پالنے اور نوکری دلوانے کا یہی انعام ہے؟ روپیہ روپیہ جب دیکھو تب روپیہ ہی چاہئے تجھے" اور پھر اس نے منو کی پسلیوں پر دھڑا دھڑ گھونسے برسانے شروع کر دیے۔

"ارے چچا! ارے مجھے مارو مت چچا، میں تو خالی کھانے کو مانگ رہا ہوں۔ مجھے تو بس کھانے کو چاہئے"

"تو پھر کھانے کے وقت کہاں گو کھا رہا تھا"۔ دیارام چیخا "کھانا کھانا تھا تو پہلے کیوں نہ آیا؟ اور باپو کے یہاں نہیں تھا تجھے کھانے کو؟"

[illegible] سے کام کروا رہی تھیں [illegible] چکیاں لے [illegible]
[illegible] تو نے کھانے کو کیوں نہیں دے دیا تھا تجھے [illegible]
معلوم وہ تجھے کتنا پیار کرتی ہیں۔ تجھے معلوم ہوتا تو تجھے اس طرح [illegible]

نہیں لگتا۔ مجھے دال بھات اچھا لگتا ہے"

"جھوٹا! سؤر! شکایت کرتا ہے" دیا رام نے چیخ کر کہا، "جب دیکھو تب شکایت" اور اس نے منو کو دیوار میں دبا کر پھر گھونسے مارنے شروع کئے۔

"ارے ماں! اری میری ماں" منو بلک بلک کر رو رہا تھا۔ پھر بھی ان دل دوز چیخوں کا دیا رام پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ روپیہ کی محبت اور غربت کے ڈر سے سنگ دل ہو چکا تھا، بینک میں چپراسی گیری کا ذلیل کام کرتے کرتے اس کی حس مر چکی تھی، اس کا چہرہ تن گیا، آنکھوں میں خون اتر آیا اور جب اس نے دانت پیس کر منو کو قہر کی نگاہوں سے دیکھا تو معلوم ہوتا تھا اسے کچا چبا جائے گا۔

"سچ بتا" دیا رام نے گرج کر کہا "کہاں سے گھومتا گھومتا آیا ہے"

منو میں بولنے کی سکت کہاں تھی، کھڑا روتا رہا۔

"بتا کہاں تھا! بول جواب دے" دیا رام نے قریب آ کر چیخ کر کہا

"میں تو گھر ہی پر تھا" منو نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا

"جھوٹ بولتا ہے کتا! بدمعاش سارے زمانے کا" دیا رام پھنکارا "جیسے میں تجھے جانتا نہیں ہوں۔ ان کا کام توڈھنگ سے کرنا نہیں اور الٹا ادھر اُدھر سیر سپاٹا کرنا۔ اب اگر تو نے ان کی شکایت کی تو یاد رکھنا جان سے مار ڈالوں گا۔ اس دن ان کے چینی کے برتن توڑ ڈالے۔ صاحب کے سامنے ان کی بیٹی کرا دی"

اور پھر وہ منو پر لپک پڑا اور لگا اسے لاتیں مارنے۔

"شرارتی! فضدی! جو جی میں آتا ہے وہ کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اپنے کو بڑا محنتی! صاحب کے سامنے بابو جی کی عزت دو کوڑی کی کر دی، میرے سر پر بابو جی کی طرف سے اُلاہنا الگ بلا، تیرے آنے سے پہلے بینک میں میری گنتی اچھے نوکروں میں تھی۔ اپنی روزی کمانے کے لئے محنت کر کے اور مالکوں کو خوش کر کے میں نے نیکنامی پائی تھی اور تو ہمارے شریف بابو جی کی شکایت لے کر یہاں آیا ہے؟ جان کی خیر چاہتا ہے تو واپس جا اور ڈھنگ سے لگ کر کام کر ورنہ جان سے مار ڈالوں گا۔ سؤر کہیں کا۔ بس پڑھنا اور سونا بہت ہو چکا، چل جا یہاں سے اور بی بی جی سے کھانا مانگ۔ میرے پاس نہ تیرے لئے کھانا ہے نہ ہمدردی" ۔ اور اس نے منو کی گردن میں ہاتھ دے اُسے باہر دھکیل دیا۔

منو بابو جی کے گھر واپس آکر اسی ڈھرے پر چلنے لگا۔

بینک سے باہر نکل کر وہ سڑک پر آگیا اور پھر کچھ دیر تک اپنا آنسوؤں سے بھیگا، سوجا ہوا چہرہ چھپائے، یونہی اِدھر اُدھر گلیوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اس کا دماغ جیسے سن سا ہو گیا تھا۔

"کمبخت چچا! آخ یہ ظالم بدمعاش چچا" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہا۔ "سؤر کا بچہ! کتیا کی اولاد! مجھے کیسا بُرا لگتا ہے وہ" اس نے غصہ کے مارے اپنے دانت پیسے گویا اپنے طیش کے جذبے کو اور ابھار رہا ہو، اور دل میں سوچنے لگا، میں بھاگ جاؤں گا۔ میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا دیا رام اور اس بی بی جی سے پیچھا چھڑا کر، پھر یہ لوگ مجھے ڈھونڈنے پھریں گے

شہر خبریوں سے ڈونڈی پٹوا کر سارے شہر میں مجھے ڈھونڈیں گے اور میں نہ ملوں گا۔ اچھا ہوگا۔ تب ان لوگوں کو مزا معلوم ہوگا۔ لیکن میرے پاس تو روپیہ پیسہ کچھ نہیں۔ بھاگ جاؤں گا تو کھاؤں گا کہاں سے؟۔ اور اگر ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا، ڈھونڈ لیا، اور پھر یہاں واپس لے آئے۔ تب تو اور بھی ماریں گے اور بھی پیٹیں گے۔"

مومن گلی کے پرنالے پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں، جیسے منو کو لعنت ملامت کر رہی ہوں۔ لیکن منو بالکل کھو سا گیا تھا۔ گلی کا شور و غل، اپنے اپنے دواروں پر بیٹھی ہوئی عورتوں کی غپ شپ، ان کے چلتے ہوئے چرخوں کی گھن گھن، اندھا بھینسا کھیلتے ہوئے بچوں کی چیخیں۔ ان سب سے منو کا دماغ بالکل بے نیاز تھا۔ اسے اپنی زبان کے نیچے ایک عجیب سا مزا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک بے چینی، جیسے متلی سی آ رہی ہو، جیسے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہو، اور ساتھ ہی ساتھ بھوک۔ اشد بھوک اور تکلیف۔ اس نے ایسا منہ بنایا جیسے کوئی تلخ دوا پی رہا ہو اور پھر جلدی جلدی ابو جی کے گھر کی طرف چلنے لگا۔ اس کے قدم لاشعوری طور پر اٹھ رہے تھے، اپنے ماحول سے بالکل بے نیاز!

بی بی جی گھر پر موجود نہ تھیں۔ منو نے کچھ کھا پی لیا اور لیٹ گیا کہ شاید نیند ہی اس کی مصیبت کو ہلکا کر دے۔ اس کے دماغ میں خیالات کا ایک ہجوم تھا کہ اُمڈتا ہی چلا آتا تھا۔ وحشیانہ خیالات، انتقام کا جذبہ، اسی قسم کا اور جذبہ جس کا مظاہرہ اس نے چاقو سے پیٹنے وقت کیا تھا۔

"اس کی کھال کھینچ لوں گا"۔ منو اپنے دل میں سوچ رہا تھا۔ کبھی سوتے میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا۔ جان ہی سے

مار ڈالوں گا، لیکن زمین کی خنکی نے اس کے دماغ کو کسی قدر ٹھنڈک پہنچائی اور اس کی قوت کو اپنے اندر اس حد تک جذب کیا کہ وہ فوراً نیند آ گئی۔ اور وہ اس کوشش کی طرح بے سدھ ہو گیا، جس پر اوپر سے بے ہوشی طاری ہو، بے حس و حرکت۔ اگرچہ اس کا دل اب بھی جسم کے اندر برابر دھڑک رہا تھا۔

بہرحال کچھ دنوں بعد اس کی پرانی بے پروائی اور زندہ دلی پھر لوٹ آئی اور اس میں زندگی کی آگ از سر نو بھڑکنے لگی، وہی آگ جو اپنے چاروں طرف ہر چیز کو اور ہر آواز کو سن کر اس کے وجود میں جاگ سی اٹھتی تھی۔

"کہئے مہاراج! کیسا ہے جناب کا مزاج"۔ اس نے سب جج صاحب کے برہمن نوکر رام کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ رام چونکہ آس پاس کے تمام نوکر لڑکوں سے عمر میں بڑا تھا، اس لئے وہ جب دیکھو تب پانی کے نل پر قبضہ جمائے رہتا تھا۔ آج منو بھی ذرا تنگ میں تھا کیونکہ بچے سے بیوی جی نے آٹے، دال اور نمک ڈالنا تھا۔

"ابے کیوں بھونکے جا رہا ہے لیچھ پیاڑی" رام کے سخت اور وحشیانہ چہرے پر نفرت سے سلوٹیں پڑ گئیں۔ اسے اپنی طاقت اور عالی نسبی پر بڑا غرور تھا۔ "یہ تو کہہ اب تیری مالکن تیرے ساتھ کیسا برتاؤ کرتی ہے یا اب ترس کھا کر تجھے اپنے خوبصورت سخت سینے سے لگانے لگی؟"

"چپ رہ" منو شرم سے لال ہو کر بولا۔ غصے میں بھر گیا، شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے۔ میں تجھ سے کبھی تیری مالکن کی بات کرتا ہوں"

اسے اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا کہ وہ اپنے کو رام سے مذاق کرنے دیتا ہے۔

"اچھا تو اس بات پر تجھے غصہ کیوں آتا ہے، معلوم ہوتا ہے وہ فرو تجھ پر مہربان ہو گئی ہے اور تجھے پیار کرتی ہے۔ جبھی تو تجھے اتنی

گالی دیتی ہے" اور تو چپکا سنا کرتا ہے۔ اور دھوتی کے اندر وہ کیسی ہے؟ ایسی؟" اور اس نے اپنی انگلیوں سے ایک فحش قسم کا اشارہ کیا۔

"چپ رہ بے" منو زور سے چیخا۔ "پرے ہٹ۔ مجھے گھڑا بھر لینے دے، گھنٹوں سے نمبر پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے"

"ذرا اس پہاڑیئے کو دیکھنا" ورما نے لہنو سے کہا۔ لہنو پاس ہی کہیں نوکری کرتا تھا، عمر میں ورما ہی کے برابر، پتلے پتلے ہونٹ اور کتاب سی ناک جو اس کے برہمن ہونے کا اعلان کرتی تھی۔ ورما اور لہنو ہمیشہ سے دوست تھے۔ "میں نے جواس کی مالکن کی چھاتیوں اور ٹانگوں کی تعریف کی تو بگڑ گیا۔ اور وہ ہے کہ سارے دن اس کو پھٹکارتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ یہ ضرور اس سے پھنسا ہوگا"

"چل مجھے پانی لینے دے" منو نے نل کے پاس آتے ہوئے کہا۔

"ورما! اسے ایک دینا تو ذرا" لہنو بولا "اپنی طاقت پر بڑا اترا رہا ہے۔ مجے معلوم ہے یہ اتنا تگڑا کیسے ہو گیا۔ اپنے مالکن کے سودے کے پیسوں میں سے چراتا ہے۔ کل ہی میں نے اسے بھگو کی دکان پر مٹھائی کھاتے دیکھا تھا۔

"جھوٹ" منو نے جواب دیا۔ جھوٹے الزام سے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ "مجھے پانی لے جانے دو"

"اچھا اب مجھے جھوٹا بنا کر تجھے جانے کی جلدی پڑ گئی" لہنو بولا "لہنوا سے ایک دینا تو"

منو غصہ میں تنتنایا ہوا لہنو کو گھور رہا تھا کہ ورما نے ایک دھکا دیا پمپ کے آس پاس کافی جمع ہونے سے زمین کچھ پھسلنیدی سی ہو گئی تھی، منو کا پاؤں پھسل گیا، لیکن فوراً ہی وہ کھڑا ہوا اور چشم زدن میں وہ تن کر ورما کے ننگے، گندمی جسم کے مقابل میں آ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

"اب مار ذرا" وہ گرجا۔ "اب میرے دیکھتے میں مار، کمینہ کتا، برہمن بچہ"

"اوہو ہو، ذرا اس کا گھمنڈ کوئی دیکھے"۔ ورما چپکے سے کھسک کر نل پر قابض ہو گیا تھا۔

"تو یہ کیا تیرے باپ کا نل ہے کہ گھنٹوں کے گھنٹوں اور کسی کو ہاتھ ہی نہیں لگانے دیتا" منو چلایا

"ٹھہرو، میں اسے مزا چکھاتا ہوں۔ ایسا سبق دوں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا"۔ لہنو آگے بڑھ آیا، اور منو کا ہاتھ پکڑ گھسیٹنے لگا۔ پیچھے سے ورما نے دو ایک تڑی لگا دیں۔

منو نے لہنو سے ہاتھ چھڑایا۔ اور شیر کی طرح ورما پر جھپٹا۔ اپنے دشمن کو اس نے کمر سے پکڑ لیا اور اٹھا کر نیچے کھڈ میں پھینکنا ہی چاہتا تھا کہ ایک دم سے اُسے خیال آ گیا کہ اس طرح تو وہ مر جائے گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑ گئی۔

ورما منو کی گرفت سے نکل گیا اور چھوٹتے ہی اسے ایک زناٹے کا تھپڑ منہ پر رسید کیا۔ لہنو نے دوسری طرف سے منو کی ٹانگ پر ٹانگ رکھ جو لنگی دی تو منہ کے بل اینٹوں کے فرش پر جا پڑا۔ فوراً ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا لیکن

اب ورما کے ہاتھ میں کیکر کا چار فٹ کی موٹی لکڑی تھی۔ اور لہو بھی دھمکی کے انداز میں اس کے سر پر ہوا میں [illegible] دوسرے خطرے کو دیکھ کر منو کے اور بھی آگ لگ گئی۔ وہ غصے میں بھرا ہوا ورما پر ٹوٹ پڑا اور اسے کمر پر سے پکڑ کر اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ پھر وہ اسے پہیے کی طرح گھمانے لگا اور دھم سے زمین پر پٹخ دیا۔ جب وہ واپس ہوا تو لہو غائب ہو چکا تھا۔ منو نے اپنے پیتل کے گھڑے کا چھوٹا سا منہ نل کی سیدھ میں رکھ دیا۔ اور پانی کی دھار گر گر گر کر کے گھڑے کے ڈھول ایسے پیٹ میں گرنے لگی۔ منو اب تمام لڑائی وڑائی بھول چکا تھا۔ جیسے یہ بھی کوئی دنگل یا کشتی تھی جس میں جانبین کو ایک دوسرے سے کوئی دشمنی نہ تھی۔

اتنے میں ورما پیچھے سے پنجوں کے بل چلتا ہوا آیا اور منو کو ایک لکڑی رسید کی۔ منو نے وار ہاتھوں پر روک لیا۔ ورما نے پھر ایک دیا اور اب کی دفعہ چوٹ ٹھیک منو کی [illegible] منو نے ہاتھ سے لکڑی پکڑ لینی چاہی، مگر ورما نے لکڑی کو یوں [illegible] ہتھیلیوں میں پڑ پڑ کر نکل جاتی تھی [illegible] منو نے ورما کی گردن ناپی، بالوں کا جو گچھ جو اس تقدس مآب برہمن کے سر پر لہرا رہا تھا، مضبوطی سے اپنی مٹھی میں پکڑ لیا۔ اور جھنجھوڑنا شروع کیا کہ کسی طرح وہ لکڑی چھوڑ دے، اس نے ورما کے ہاتھ سے لکڑی چھین کر نیچے کھڈ میں پھینک دی۔

اتنے میں گھڑا بھر جانے کی آواز آنے لگی۔ منو نے ورما کو تو چھوڑا اور خود گھڑے کو برآمدہ کی طرف دھکیلا، اس کا سارا [illegible] میں تر تھا۔

"جا بے! جا کر اپنی مالکن کی ٹانگوں [illegible] جا" ورما پیچھے

سے چلایا۔

"ہے نمک حرام!" بی بی جی نے اسے اس طرح بے اختیار باورچی خانہ میں گھستے دیکھ کر اس کا خیر مقدم کیا "کیا کیا تو نے؟ کس سے لڑ رہا تھا"

"کسی سے بھی نہیں" منو نے گھڑا باورچی خانے میں رکھتے ہوئے کہا۔ بی بی جی کے سامنے سے گذر کر وہ چولھے کے پاس پہنچا اور مٹھی بھر راکھ لے کر اپنے ماتھے کے زخم پر جمائی جس سے خون بہا بہہ رہا تھا۔

"اے۔ اے۔ ذرا مجھے تو دکھا کہاں چوٹ لگی" انھوں نے جذبات کی رَو میں چیخ کر کہا۔ "دیکھ تو سارا منھ خون سے بھر گیا ہے۔ یہ ورما حرام کار نے مارا ہوگا تجھے۔ میں نے تجھے کہا تھا کہ اس کی سنگت میں نہ بیٹھنا وہ گندی گندی باتیں کرتا ہے اور تو بڑے مزے لے لے کر سنا کرتا ہے۔ اب ایسوں کے ساتھ رہنے کا پھل بھوگ"

"یہ کچھ نہیں۔ ذرا چھل گیا ہے اور کیا؟" منو نے الگ ہٹتے ہوئے کہا۔

"دیکھو ذرا اس کو۔ ارے ذرا اسے دیکھو تو سہی" بی بی جی چیختی ہوئی دوسرے کمرے میں گئیں جہاں چھوٹے بابو بیٹھے اپنے کالروں پر استری کر رہے تھے۔ "دیکھو جانے کہاں سے لڑ بھڑ کر اور سر پھڑوا کر آیا ہے"

"یہاں آ بے منوڑے"

"جی بابو جی"۔ منو نے جواب دیا۔ اس کی رنگت پیلی پڑ گئی تھی وہ گھبرا تو ضرور رہا تھا، لیکن زخم کی اُسے کوئی خاص پروا نہ تھی۔

"چل ادھر آ، مجھے اپنا سر دکھا" ڈاکٹر صاحب بولے

"وہ ٹھیک ہوگیا بابو جی" منو نے بے پروائی سے کہا۔ "میں نے اس پر راکھ لگا لی ہے۔ اب اچھا ہو جائے گا"۔ اسے یقین تھا کہ گاؤں کے حجام کے کہنے کے مطابق مٹی یا راکھ لگا لینے سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

"اِدھر آ بے گدھے!" ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے آواز دی۔ "گندی راکھ سے مر کر رہ جائے گا زخم، چل مجھے دکھا"۔

آخر منو نے اپنے آپ کو تشخیص کے لئے حوالے کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ زخم کافی گہرا تھا، نیچے تقریباً ہڈی تک پہونچ گیا تھا۔ انھوں نے پرائمس چولھا جلا کر پانی گرم کیا اور زخم کو دھو کر باندھ دیا۔ منو پرائمس اسٹو کے جلتے ہوئے تیل اور دواؤں سے مہکتی ہوئی پٹیوں میں اس قدر محو ہو گیا کہ آخر اسے چکر سا آنے لگا، ڈاکٹر صاحب نے اسے باورچیخانے کے ایک کونے میں آرام کرنے لٹا دیا۔

جب نیند منو کے حواس پر چھانے لگی اور درد کے بوجھ سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں تو اس نے بی بی جی کے چلانے کی آواز سنی، لیکن اس مرتبہ وہ منو پر نہیں چلا رہی تھیں، بلکہ ورما اور اس کے مالکوں پر۔

"نمک حرام کہیں کے، ان کا دماغ آسمان پر چڑھ گیا ہے۔ سمجھتے ہیں کہ بڑے آدمی کیا ہو گئے کہ بس من مانی ہی کر لیں گے۔ ہم ان کے برابر تنخواہ دار نہ سہی لیکن ان سے کیا کسی طرح کم ہیں؟ وہ بڑے ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے، ہم اپنے گھر کے ... "

جج صاحب کی بیوی بھی باہر نکل آئی تھیں اور بی بی جی کو گالیاں دے رہی تھیں "ان ذلیل بابوؤں کا دماغ تو دیکھو، آنے دو ذرا صاحب

کو بتا دیں گے کہ بڑوں کے منہ لگنا کیسا ہوتا ہے۔ کتے، سؤر، ایک گنوار پہاڑی لڑکا کیا نوکر رکھ لیا کہ آپے سے باہر ہی ہوئے جا رہے ہیں "

منو کو نیند آ گئی تھی، اور اپنی، الکن کے الفاظ اس بے چین نیند میں اسے دور سے گونجتے ہوئے سنائی دے رہے تھے۔ اب تو صرف ایک خاموش آواز تھی جو اس کے پھولتے ہوئے نتھنوں میں سے مدھم مدھم سرسراتی ہوئی آ جا رہی تھی جیسے دل کی دھڑکن، جو ہر مرتبہ اندر آتے جاتے زندگی کا پیام دیتی تھی۔

جتنے دن منو کو باورچی خانے کے اس کونے میں گذارنے پڑے، بی بی جی نے اس کی طرف کچھ یوں ہی سی توجہ دی لیکن چھوٹے بابو روزانہ صبح برابر اس کی پٹی کھولتے اور پھر سے باندھتے، اور شیلا پاس کھڑی رہ کر اپنی طفلانہ طرز میں حیرت سے دیکھ دیکھ کر ہمدردی جتایا کرتی۔ جب منو کا جوش کسی قدر کم ہو گیا اور سارے جسم سے خون کھنچکر زخم کی طرف آنے لگا تو اسے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ اسے بخار چڑھ گیا تھا اور وہ روتا اور کراہتا رہا، کبھی کبھی اس کی کراہ چیخوں میں بھی تبدیل ہو جاتی تھی، پھر اسے اپنی سدھ نہ رہی تھی۔ تمام چیزوں پر کالی راتوں کے آسمان کی سی سیاہی چھا گئی تھی۔ ہاں کہیں کہیں کوئی خوشگوار خیال کسی چمکتے ہوئے ستارے کی طرح جھانکتا نظر آتا تھا، اس کے کان بج رہے تھے اور وہ ایک کونے میں گٹھری بنا پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا سارا جسم سن ہو گیا ہے، وقت کی رفتار بند ہو کر منجمد ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اُسے کوئی دوا دی تھی جس سے اُسے خوب پسینہ آ گیا تھا اور پھر اپنے سینے کی گہرائیوں میں، خلا کے باوجود، لاشعوری طور پر انسانی جذبات کی بیداری کا احساس ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا دماغ، بیماری سے پہلے کی طرح، اپنے

ماحول سے دوچار ہونے لگا۔ لیکن جیسے جیسے وہ ہوشیار ہوا، اسے ایسا لگا کہ صدیوں کی نیند سے جاگ اٹھا ہے۔ جیسے کوئی لہر ہو جو دھارے کے خلاف ہنکورے لیتی، آس پاس کی لہروں سے ٹکراتی، کبھی پیچھے ہٹتی ہے اور کبھی پھر بچتی ہوئی، دھنستی ہوئی، اپنا بھولا سر اٹھائے آگے کو بڑھتی ہی چلی آتی ہے۔ اس نئی زندگی کا احساس گویا روشنی کی ایک کرن تھی جس نے اس گھر میں منو کی زندگی کے لئے ایک نیا اور روشن راستہ کھول دیا تھا۔ اسے اپنے چچا کی وہ نصیحت یاد آئی جو اس نے یہاں آتے وقت کی تھی۔ اور اسے خیال آیا کہ یہاں آتے وقت وہ کس قدر گھبرا رہا تھا اور اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہا تھا۔ مختلف اوقات میں جو اس پر مختلف جذبات طاری ہوئے تھے۔ ان کا اسے خیال آیا۔ اس کے چچا نے تمام مشکلوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اور طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر اسے بہلانے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت اسے ہر بات کتنی مشکل لگتی تھی، گھر کے کاموں کے متعلق پہلی معلومات اسے کسی نے نہ دی تھیں اور اس کی مالکن تو ہمیشہ غصہ ہی کیا کرتی تھی۔ اُف جس دن صاحب کی دعوت تھی اور اس نے وہ برتن توڑے تھے تو وہ کیسا غصے میں بھر گئی تھی جیسے اسے چبا ہی تو جائے گی۔ اس گھر میں صرف چھوٹے بابو ہی ایک نیک دل انسان تھے، ہر ایک بات کو وہ کیسے مزے سے ہنسی میں اڑا دیا کرتے تھے۔

پھر اس کے دماغ میں ایک دھندلی سی یاد آئی کہ اس کا چچا حال ہی میں اسے دیکھنے آیا تھا۔ لیکن اسے اپنے چچا سے نفرت تھی۔ اسے چھوٹے بابو اور ننھا منا کے علاوہ اور سب سے نفرت تھی۔ شیلا اچھی تھی مگر وہ بہت کترایا کرتی تھی۔ اور وہ اس کا مذاق بھی تو کیسا اڑایا کرتی تھی۔ بندر، بندر۔ لے۔ لے کھانا کھالے۔ اس کی یہ باتیں اسے اچھی لگتی تھیں کیونکہ ان سے اپنائیت

ٹپکتی تھی۔ اسے شیلا کو نظر بھر کر دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے شیلا کی وہ تصویر پھر گئی جب وہ اپنی ماں کے زبردستی کے کچوکے اور دھموکے کھا کر۔ نہانے کے بعد نکلتی تھی۔ ململ کی باریک بھیگی ہوئی ساری جو اس کے جسم کے خطوط کو کچھ یوں ہی سا چھپاتی تھی۔ اس کے سارے بدن پر لپٹی ہوتی تھی اور اس میں سے اس کے سنہرے جسم کی پرچھائیاں جھانکتی رہتی تھیں، اس کے متناسب لچکدار اعضا سے ایک نور سا چھنتا ہوا معلوم ہوتا اور یہ نور پھر ایک لطیف اور طویل قہقہہ بن جاتا تھا جو شیلا کے کبھی ساکن اور کبھی متحرک جسم کے اردگرد ایک ہالہ سا بنائے رہتا تھا۔

بچپن میں منو کو یہ سکھایا گیا تھا کہ ہر عورت کو اپنی ماں یا بہن سمجھے۔ اس نے اپنے دل ہی دل میں شیلا کے وجود کو بھی بہن سمجھنے کی کوشش کی، لیکن شیلا کے ساتھ کھیلنے کی جو خواہش بار بار اس کے دل میں پیدا ہو رہی تھی اس کی شدت میں وہ اس پر، بہن، کا لیبل لگانا بھول بھول جاتا تھا۔ ہاں جب کبھی وہ اسے دیکھتا تھا تو شرم سے سر غرور جھکا لیتا تھا۔ یا تو سچ مچ اسے شرم آجاتی تھی یا وہ تخیل میں شرمایا کرتا تھا۔ لیکن اس پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوتی تھی جیسی اپنے گاؤں میں موسم بہار میں کسی دوسرے کے باغ کے پکے پھل چرانے کا ارادہ کرتے وقت اس کے سانولے ہونٹوں پر ایک بھوکی مسکراہٹ ناچنے لگتی تھی۔ نرمی اور پیار کی ایک آہ غیر شعوری طور پر اس کے لبوں تک آئی لیکن پھر اپنی محبت کی ناکامیابی اور بے چارگی پر ایک اور آہ اس کے کلیجے سے اٹھی اور گھل مل کر رہ گئی۔ کاش اس کے پاس روپیہ ہوتا۔ اگر بالو جی اس کی تنخواہ اس کے چچا دیا رام کو نہ دے دیا کرتے تو وہ یہ سب روپیہ جمع کر لیتا اور پھر بھاگ جاتا اور مٹھائی کا خوانچہ لگا لیتا، جیسے وہ لڑکا لگایا کرتا تھا۔ جو شیلا کے اسکول

کے آگے بیٹھا کرتا تھا، اور ایک روپیہ روز کما لیا کرتا تھا۔ جس دن وہ اور اس کا چچا گاؤں سے شہر آ رہے تھے تو چچا نے کہا تھا

"روپیہ ہی سب کچھ ہے"

اور اب منو بھی یہی سوچ رہا تھا۔

"بیشک روپیہ ہی سب کچھ ہے"

اور پہلی مرتبہ اس نے اپنا، ایک غریب لڑکے کا موازنہ، امیر آدمیوں یعنی اپنے مالکوں سے کیا، گاؤں کے سب غریب لوگوں کا مقابلہ جے سنگھ کے باپ زمیندار صاحب سے کیا۔

اس کے اسکول کے ساتھی، ننھے بشن کے ستر سالہ بوڑھے دادا گنگو کا سکڑا، سوکھا ڈھانچہ اس کی نظروں کے آگے پھرنے لگا، گنگو کھیت مزدوری کرتا تھا کسی کے کھیت پر مزدوری کرتا تھا۔ پھر اسے بشمبر کی ماں کے سوکھے چمرخ چہرے کا خیال آیا۔ وہ زمیندار صاحب کے یہاں کام کرتی تھی، پھر اسے اپنے خود کے باپ کی دھنسی ہوئی آنکھوں کی دھندلی سی یاد آئی جب اس نے ہمیشہ کے لیے آنکھ موند لینے سے پہلے اس [illegible] کی ایک نظر ڈالی تھی۔ اسے اب تک اپنی ماں کی گود کی وہ گرمی یاد تھی۔ وہ منو کو چکی پیتے وقت اپنی گود میں لٹا لیا کرتی تھی اور چکی کا ہتھا برابر گھمائے جاتی، گھمائے جاتی۔ یہاں تک کہ آخر وہ تھک کر ختم ہو گئی۔ اب اس گرمی کے بغیر منو کو ویرانی سی لگتی تھی گویا وہ بھی اس کے جسم کو ڈھانپنے کی کوئی ضروری شے تھی، لیکن گاؤں میں غریب لوگ کتنے ہی تھے، کتنے بہت سے تھے یہ غریب، اور امیر تو بس گنتی کے دو چار ہوں گے۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا یہ سب غریب اس کے باپ کی طرح مر جائیں گے۔

البتہ شہر میں امیروں کی تعداد غریبوں سے زیادہ تھی۔ لیکن پھر اسے خیال ہوا کہ ایک شہر ہے تو سینکڑوں گاؤں ہیں اور اگر ہر گاؤں میں غریبوں کی اتنی ہی بہتات ہے جتنی اس کے اپنے گاؤں میں تو پھر یقیناً دنیا میں امیر کم ہیں اور غریب زیادہ۔ بہرحال چاہے امیر زیادہ ہوں یا غریب لیکن دنیا میں صرف دو ہی قسم کے لوگ ہیں۔ دنیا دو طرح کے انسانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ذات پات سے کچھ نہیں ہوتا۔

"میں کھتری ہوں اور غریب ہوں۔ ورما بھی برہمن ہے لیکن معمولی نوکر ہے کیونکہ وہ بھی غریب ہے۔ نہیں۔ ذات پات سے کچھ نہیں ہوتا بابو لوگ صاحب لوگوں کی طرح ہیں اور نوکر سب ایک ہی سے لگتے ہیں۔ دنیا میں صرف دو ہی قسم کے لوگ ہیں، امیر اور غریب"

وقتی ضرورت نے اسے ان بھولے بھالے خیالات سے چونکا دیا۔ اینٹوں کے چولھے میں آڑی سیدھی لکڑیاں رکھ کر وہ پھکنی سے پھونکیں مار مار کر آگ جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لکڑیاں تھیں کہ سلگنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں اور دھواں تمام اس کی آنسو بھری آنکھوں میں بھر بھر کر اُسے چُندھیائے دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تو جیسے مرچیں سی لگنے لگیں۔ اس نے آنکھوں کو بھینچ لیا اور ہتھیلیوں سے دبا کر ان میں سے پانی نچوڑ ڈالا۔ اس کی تھکی ہوئی تمگین طبیعت میں غصے کے آثار پیدا ہونے لگے۔ اور رونا سا آنے لگا۔ بیماری سے اس کی قوت ارادی جیسے سلب سی ہو گئی تھی۔ لیکن قوت ارادی کے ٹوٹنے سے کیا ہوتا تھا۔ جیسے جیسے اس کی قوت جسمانی عود کرتی گئی۔ منو پھر کاموں میں جٹتا گیا، وہی چکر پھر شروع

ہو گیا، برتن مانجھنا، سبزی چھیلنا، جھاڑو دینا، بستر لگانا، کھانا کھلانا اور اور جو بھی کام اس کی مالکن کے دماغ میں سما جاتا وہ سب کرنا۔ اس طرح پھر سے کام شروع ہو جانے سے اس کے جسم میں زندگی کی گرمی پھر لہریں لینے لگی، زندگی کی وہ گرمی اور وہ امنگ جو ہر احساس اور ہر شے کی طرف لپکتی تھی۔ وہ ہنستا، گاتا، ناچتا، چیختا، کودتا اور زندگی بھری امنگوں سے قلابازیاں لگاتا۔ اس وقت اونچ نیچ کے فرق کی دیواریں ہٹ جاتیں زندگی کا دھارا لاشعوری طور پر بہنے لگتا اور وہ اپنے آپ کو اپنی خواہشات کی بشریت کے حوالے کر دیتا۔

یہ شرارت اور یہ زندگی تو اس میں ودیعت ہوئی تھی اُسے بھلا گالیاں یا نصیحتیں کب میٹ سکتی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ جسمانی چوٹ بھی اُسے نہ روک سکی اور اسی کے بدولت وہ ہمیشہ کسی نہ کسی آفت میں پھنس جایا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک اور زلت اس پر فوراً ہی نازل ہوئی۔

ایک دن شام کو وہ باورچی خانے میں بیٹھا آلو چھیل رہا تھا کہ اس کے کان میں کچھ اس قسم کی آوازیں آئیں کہ شیلا اور اس کی اسکول کی کچھ سہیلیاں بڑے کمرے میں آئیں۔ مالکن گھر کے باہر، اور بابوؤں کی بیویوں سے غیب لڑانے گئی ہوئی تھیں۔ جلدی جلدی اس نے اپنا کام ختم کیا کہ جا کر ان کے ساتھ کھیلے۔ ابھی وہ ہاتھ ہی دھو رہا تھا کہ اس نے اس گانے والے بکس کی آواز سنی اور اس نے سوچا کہ بڑا ہی اچھا موقعہ ہے۔ اب وہ جا کر بچوں کے سامنے اپنا بندر والا ناچ دکھا کر انھیں خوب خوش کرے گا۔ شاید اس طرح وہ اسے اپنے ساتھ کھیلنے پر راضی ہو جائیں ورنہ وہ ویسے تو صاف انکار کر دیتے تھے، کیونکہ انھیں بی بی جی نے منع جو کر دیا تھا۔

وہ دوڑا ہوا کمرے میں گھس گیا اور فوراً چاروں ہاتھ پاؤں کے بل ہو کر ادھر اُدھر چلنے لگا۔ لڑکیاں سب بیچوں بیچ کمرے میں جھنڈ بنائے، اسکول کا سیکھا ہوا ایک ناچ ناچ رہی تھیں۔ منو کے گھنے بھی سب تتر بتر ہو گئیں۔

"اونہہ چل جا یہاں سے" کوشلیا نے شرما کر کہا

"بھئی ہم تمھیں اپنے ساتھ نہیں کھلائیں گے" شیلا بولی۔

"ماتا جی نے کہا ہے ہمیں تمھارے ساتھ نہیں کھیلنا چاہیئے"

ویسے تو شیلا منو کو پسند کرتی تھی اور اس کے بندر والے ناچ میں اُسے بھی بہت مزا آتا تھا لیکن ماں کی نصیحت اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر ایک خلیج کی طرح حائل ہو گئی تھی۔ پھر بھی شیلا کا جی چاہنے لگا کہ منو کو چھو کر دیکھے۔ وہ اس کی طرف بڑھی اور کان پکڑ کر اُسے اِدھر اُدھر گھمانے لگی۔

منو نے اُسے مزے سے اپنا کان پکڑا دیا

سب لڑکیاں چیخیں مار مار کر ہنسنے لگیں

شیلا نے منو کا کان اور زور سے کھینچا اور وہ ایک دم سے غرا کر دانت پیستا ہوا الٹ کر اس پر جھپٹ پڑا گویا وہ سچ مچ ہی کا تو بندر تھا اور قبل اس کے کہ وہ خود بھی کچھ محسوس کر سکے اس نے شیلا کے گال پر ایک بگٹا بھر لیا تھا۔

"ماں ـــــ ارے میری ماں!" شیلا چیخی۔ لیکن اس کی ماں نے نہیں سنا تو کوشلیا دوڑی ہوئی گئی اور بی بی جی کو آواز دینے لگی۔

"شیلا کی ماں! اجی شیلا کی ماں۔ یہاں آؤ ذرا دیکھو تو

سہی جنگلی پہاڑی لڑکے نے تمہاری لڑکی کو کیا کر دیا "۔
بی بی جی لپکی ہوئی پہنچیں۔ اپنی لڑکی کو گال سہلاتے دیکھ کر
ان کا منہ غصہ سے لال چقندر ہو گیا۔
" دکھا تو مجھے " انھوں نے چیخ کر کہا۔ " مجھے تو اپنا منہ دکھا میرا
بچہ " ۔ جہاں منو نے کاٹا تھا اس جگہ گال کی سفید جلد
نیلی پڑ گئی تھی۔
" میں تو خالی کھیل رہا تھا بی بی جی " ۔ منو نے طوفان چڑھتے دیکھ
کر اپنے آپ کو اس سے بچانے کی بے سود کوشش کی۔
" ارے کمبخت حرام خور! تو مر جائے، تیرا بیڑا غرق ہو " گالیوں
کی بوچھار شروع ہو گئی۔ " تجھے اور تیرے ہوتوں۔ سوتوں کو چین نصیب
نہ ہو، تو نے میری بچی کی عزت پر حملہ کیا اور وہ بھی معصوم بچی کی! کم بخت
شہوت پرست پہاڑی بیل، ہمیں کیا معلوم تھا کہ ایک بدمعاش آوارہ کو نوکر
رکھ رہے ہیں۔ آنے دے بابو جی کو! تجھے تو پولس کے حوالے کرنا چاہئے، ارے
تجھے کچھ شرم نہیں آئی، تو نے ذرا بھی پاس نہ کیا، دیکھ تو میرے بچے کو نمکحرام
میں نے تجھ سے کتنا کہا تھا کہ میرے بچوں سے الگ رہنا، ان کے ساتھ
کبھی نہ کھیلنا، تو اپنے کو کیا سمجھتا ہے کہ مالکوں کے بچوں میں گھلنے لگا، ہمیں کیا
خبر تھی کہ آستین میں سانپ پال رہے ہیں اور وہ دودھ پی کر ہمیں کو ڈسنے
دوڑے گا، آنے دے اپنے چچا دیا رام کو۔ کم بخت، بے کہا بدمعاش، میں نے
ایک دفعہ کہدیا کہ میرے بچے تیرے برابر کے نہیں ہیں، وہ بابو کے بچے ہیں
اور تو نہ معلوم کس گھوڑے پر پیدا ہوا ہوگا۔ بھلا ہماری عزت اور شان کہاں
اور تو کہاں، اس برہمن کے لڑکے سے سر تڑا کر آیا تو ہم نے تیری دیکھ بھال

کی اور تجھ پر ترس کھایا، اب ہمیں تجھے پولیس کے حوالے کرنا ہوگا "

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" بابو نتھورام سر جھکائے، کندھے لٹکائے اندر داخل ہوئے، ان کا چہرہ تھکن اور مسکینی سے مڑا چڑا نظر آ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" بی بی جی نے تیز ہو کر کہا "سب کچھ ہو گیا، یہ نمک حرام اس کی ہڈیاں نرکھ میں جلیں! یہ "

"ارے تو پر ہوا کیا؟" - بابو جی نے چڑھ کر غصے کے انداز میں کہا۔

"کہتی تو ہوں، میرا تو دل جل رہا ہے۔ اس نمک حرام نے شیلا کو گال پر کاٹ کھایا۔ کلنک آ گیا ہے۔ یہ لڑکا ابھی جنم جنم آٹھ دن ہوئے اور اپنے مالک کی بیٹی کی عزت پر حملہ کرنے لگا، ہے بھگوان!"

"کیوں بے حرامی" بابو جی چلائے اور انھوں نے ایسا منہ بنایا کہ بھویں تن کر ماتھے کی جھریوں سے مل گئیں اور دانت مسوڑھوں تک دکھائی دینے لگے۔ "بول کیا کہتا ہے"

منو چپ کھڑا رہا۔ سر جھکائے، چہرہ سرخ، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا مگر منہ سے ایک لفظ نہ نکلتا تھا۔

"دیکھو لوگو کلنک آ گیا ہے۔ یہ اندھیر ذرا دیکھو" بی بی جی نے پھر شروع کر دیا۔

بابو جی تھپڑ تانے آگے بڑھے، اپنی بیوی کو خاموش کرنے اور منو کو پیٹنے۔

"کیوں بے سؤر، جواب کیوں نہیں دیتا"

"بابوجی میں تو صرف کھیل رہا تھا" منو نے اپنی گھبرائی ہوئی پریشان نگاہیں، اٹھا کر اپنے مالک کو دیکھا۔ "کھیل رہا تھا، ہوں! کھیل رہا ..... تھا" بابوجی نے دانت پیس کر کہا "کمینا کا جنا" انھوں نے اپنے پتلے ہڑیلے ہاتھ سے منو کو ایک تھپڑ دیا اور پھر اسے اپنے چمکیلے سیاہ بوٹوں کی نوک سے ٹھوکریں اور لاتیں مارنی شروع کیں ..... وہی سیاہ چمک دار بوٹ جو منو کی زندگی کے سب سے عزیز خواب تھے،

"معاف کرو بابوجی، مجھے معاف کرو" منو زمین پر لڑھک کر چیخنے لگا۔

"معاف کروں" بابوجی بولے "ٹھہر تجھے ایسا ٹھیک سے معاف کروں گا کہ دیکھنا" اور منو کے لاتیں مارتے مارتے وہ کونے کی طرف بڑھے، جہاں ایک موٹی سی لکڑی رکھی تھی۔ منو کی روح میں نفرت کا ایک دھارا اُبل پڑا۔ اُسے کبھی خیال بھی نہ گذرا ہوگا کہ وہ اتنی نفرت بھی کر سکتا ہے۔ وہ چونک پڑا لیکن مدافعت نہ کی۔

"ارے بابوجی مجھے معاف کرو۔ معاف کرو۔ معاف کرو، مہربانی کر کے معاف کر دو" منو نے زمین پر لوٹتے ہوئے فریاد کی پکار مچائی۔

"ہاں ہاں ٹھہر تجھے کیسا معاف کرتا ہوں" بابوجی پسینے میں نہاتے کانپتے اُسے چوٹ پر چوٹ مارے جا رہے تھے۔

منو تکلیف سے کراہنے لگا۔

"بابوجی معاف کرو۔ معاف کرو۔ بس معاف کرو" وہ چیخنے لگا

"کتیا کا جنا" بابو جی نے پھر لکڑی اٹھائی، ان کی آنکھیں سختی سے پتھرا سی گئی تھیں۔

"معاف کرو۔ معاف کرو۔ بس معاف کرو۔" منو کی آوازیں گھٹتے ہوئے اندھیرے میں دب گئیں۔

کتے کو مارو تو کونے میں دبکتا ہے، انسان کو مارو تو بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ چھٹپٹے کے وقت، جب سب لوگ باورچی خانے میں چلے گئے اور اسے اسی طرح ذلت میں چھوڑ گئے، تو منو بابو جی کے گھر سے نکل کھڑا ہوا، پہاڑ پر سے دوڑتا ہوا آتا، کیکر کے جھنڈوں سے نکلتا ہوا بینک کے پاس سے ہوتا ہوا، بڑے مکانوں کے پاس سے جن کی بجاوٹ امارت ظاہر کرتی تھی، گذرتا ہوا وہ صدر بازار میں پہونچ گیا، جہاں خوب بھیڑ بھڑکا تھا، بجلی کے ہنڈوں، تیل کے لیمپوں اور روئی کی بتی والے چراغوں سے بازار کی مختلف دکانیں جگمگا رہی تھیں اور تمام منظر ایک خواب سا دلکش معلوم ہوتا تھا۔ جس میں طرح طرح کی شکلیں بکھری پڑی ہوں۔ لیمپوں کی روشنی سے اس کی آنسو بھری آنکھیں دکھنے سی لگیں۔ لیکن بھیڑ میں جو لوگ ادھر ادھر گھوم رہے تھے ان کی آنکھوں میں اور بھی زیادہ قسموں کی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ منو ان سے نگاہیں دوچار نہ کر سکا۔ اس لئے اس نے ان کے جسموں پر زیادہ توجہ دینی شروع کی۔ وہ زور زور سے بات کرتے تھے، کبھی ہاتھ ہلاتے تھے تو کبھی زور زور سے سر ہلا ہلا کر طرح طرح کے اشارے کرتے تھے۔ منو کا دل چاہتا تھا کہ خوشی ہو اور تاریکی اور وہ اس میں گم ہو جائے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ایک دوسرے سے ٹکر کھاتے ان سرخ سفید اور سیاہ لوگوں، سرسراتے ریشم اور بادلی ململ کے ان انسانوں کی بھیڑ سے دور کہیں چلا جائے تاریکی کے کسی ایسے

گڑھے میں دفن ہو جائے جہاں آج کی مار کی ذلت کبھی یاد نہ آئے، کوئی اسے پہچان تک نہ سکے۔ چھوٹی چھوٹی جھبتیں اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ گلی سے گذرا اور پھر واقعی بھاگنے لگا۔ پسینہ اس کے چوٹی سے ایڑی تک بہہ رہا تھا۔

آخر وہ ایک بڑی سڑک پر نکل آیا جہاں چاروں طرف خیمے لگے تھے، کہیں کہیں ٹاٹ سے منڈھی جھونپڑیاں اور بڑے بڑے تنبو بھی تھے اور کچھ بند دکانیں تھیں جو اندھیرے میں کھوئی ہوئی تھیں۔ دور بہت ہی گھپ اندھیرے میں ایک محرابی دروازہ تھا جس کے اندر صحن میں تھوڑی تھوڑی دور پر، لکڑیوں کے انبار لگے تھے۔ ان انباروں میں مُردے جل رہے تھے۔ یہاں مکمل خاموشی اور غضب کا سناٹا طاری تھا۔ کچھ کتے ادھر ادھر نالیوں میں سونگھتے پھرتے تھے۔ منو اچھل پڑا۔ ریلوے کے احاطے سے کسی انجن کی تیز سیٹی کی آواز آئی اور اس کا کلیجہ بلیوں اچھلنے لگا۔ اب وہ ریلوے گودام کے پرے سرے پر پہونچ چکا تھا۔ گودام کی حدیں اور مسان کی دیوار بالکل ملی ہوئی تھیں، وہ اسی دیوار کے سہارے پاگلوں کی طرح دوڑنے لگا۔ اور لوہے کی چھڑوں میں سے پار نکل گیا کہ کہیں مسان کا کوئی بھوت یا ریلوے کا کوئی چوکیدار تو اس کا پیچھا نہیں کر رہا ہے۔ وہ پسینہ میں شرابور تھا مگر اسے پروا نہ تھی کیونکہ اب وہ اسٹیشن کے احاطے میں تھا اور ریل کی پٹریوں کے جال پر سے گذر رہا تھا، ایسا لگتا تھا کہ یہ مہیب سیاہ انجن چلنے لگیں گے اور دم کے دم میں موت آدبوچے گی۔ سانس لینے کے لئے وہ ذرا کی ذرا رکا۔ لیکن لال اور سبز روشنیاں مقناطیسی کشش سے اُسے کھینچے لئے جاتی تھیں۔ ایک دم سے وہ تاروں میں اُلجھ گیا اور ہتھیلیوں کے بل ریل کی پٹریوں پر اوندھا گرا۔ اسے

ایسا لگا کہ بس اب موت آئی حالانکہ انجن کوئی دو سو گز دور شنٹ کر رہا تھا اور آس پاس کہیں گاڑیاں بھی نہ تھیں۔ دور سے انجن کی سیٹی کی آواز سن کر وہ جست بھر کے کھڑا ہو گیا اور دیوانہ وار ان ڈبوں کی طرف دوڑا جو تاریکی میں بالکل سو گئے تھے، کہیں کہیں سے ان کے چوکھونٹے دروازے خلائیں کھلے ہوئے چھوٹی آنکھوں کی طرح جان پڑتے تھے۔ وہ لکڑی کی موٹی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ جو حفاظت کے لئے جمائی گئی تھیں کہ دور سے کوئی آدمی سبز اور سرخ روشنی ہلاتا آتا دکھائی دیا۔ اگرچہ وہ آدمی خود بالکل تاریکی میں کھویا ہوا تھا، اور قطعی دکھائی نہ دیتا تھا، لیکن منو گھبراہٹ کے عالم میں نیچے پھسل پڑا اور ایک گالی چپکے سے دے دی۔ خوش قسمتی سے روشنی واپس ہوتی چلی گئی۔ منو اٹھا۔ اس کے سامنے کھڑکی کھلی تھی، جیسے کوئی جمائی لے رہا ہو۔ چشم زدن میں وہ اس کے اندر کود گیا۔ جیسے کوئی چیتا کسی دبے پاؤں آتے ہوئے شکاری کے خوف سے اپنی ماں کے اندر جست بھر جائے۔ کودتے کے ساتھ ہی منو کسی سخت چیز پر پہلو کے بل جا پڑا۔ ایک تیز چبھن اس کی پسلیوں سے اٹھ کر سر تک پہونچی۔ درد کی تکلیف، بھاگنے کی تھکن اور ڈبے کی گھٹن سے اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ اپنا پہلو پکڑے، منہ کا پسینہ آستین سے پونچھتا فرش پر پڑ گیا۔ ایسی تنہائی اور ایسی شدید بے کسی اسے زندگی میں کبھی محسوس نہ ہوئی تھی جیسی اس ذلت، اس جہنم میں کود کر ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی وہ اس تنہائی میں پڑا اپنی موٹی دھوتی اور صدری کھول کر اپنے جسم کو ہوا دینے کی بے سود کوشش کر رہا تھا، اور چپچپا پسینہ پونچھ ہی رہا تھا کہ دور سے ایک تیز بھنبھناہٹ اسے سنائی دی۔ پھر اس نے بہت سے آدمیوں کے جلدی جلدی دوڑنے کی آواز سنی اور وہ دھپا دھپ کرتے کمپارٹمنٹ میں چڑھ آئے۔ بہت سی گٹھریاں

اور بقچے اور دوسرا سامان دھڑا دھڑ اس کے چاروں طرف گرنے لگا۔ منو بچنے کے لئے ایک طرف گھسٹ کر برتھ کے نیچے ہولیا اور فرش پر سر ٹیکا کر گرمی سے پناہ لینے کی کوشش کرنے لگا۔ اب اس کے چاروں طرف آوازیں بھی آنے لگیں۔ "اللہ داد خاں کہاں ہو بھئی"۔ "دیوی سنگھ تم کیا ہو گئے"، "بیٹھ گئے لالہ چرونجی لال جی"۔۔

منو کا دل اب کسی قدر دھیمی رفتار سے دھڑک رہا تھا اور وہ کان لگا کر غور سے سننے لگا۔ اس کے گالوں پر تمام مٹی بھر گئی تھی، جسم پسینہ سے لت پت تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا نسیں تمام پھول گئی ہیں اور جسم سیسہ کا ہو گیا ہے۔

گاڑی چل پڑی۔ اور اب وہ اور لوگوں کی سانسوں ملی گندی ہوا پی رہا تھا کیونکہ کھیتوں کی سرد تازی ہوا اس تک پہونچ نہ سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اسے تازی ہوا بھی ملنے لگی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ گاڑی کہاں جا رہی ہے، مگر پھر بھی خوش تھا کہ کسی متحرک چیز میں بیٹھا ہے۔

تیسرا باب

"ہوں۔ ہوں"۔ سیٹھ پربھو دیال کراہے اور انھوں نے تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ کے ایک برتھ کے نیچے سے اپنی گٹھری کھینچی۔ سست رفتار گاڑی کچھ کچھ کرتی شام نگر سے دولت پور کو جا رہی تھی، سیٹھ جی کانگڑا کے رہنے والے تھے، لمبا قد چوڑے کندھے، بھاری بھرکم، دیکھنے میں سیٹھ کے بجائے سپاہی لگتے تھے۔ بھرے ہوئے ڈبہ میں انھوں نے ساری رات نخوتوں کے برتھ پر اینڈے بینڈے طریقے سے بیٹھ کر گذار دی تھی، اور اس وقت بھی نیم خوابیدہ حالت میں تھے۔ ابھی گاڑی منزل سے کافی دور تھی لیکن انھوں نے اترنے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ انھوں نے اپنا سامان برتھ کے نیچے ٹھونس دیا تھا اور اس وقت ہاتھ پیتے کا پنکھا پیشانی سے پسینہ پونچھتے اسے کھینچکر نکالنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

"ہوں۔ آں۔ ہاں"۔ انھوں نے پھر زور لگایا۔ دیکھنے میں تو وہ بنڈل بڑا چکنا لگتا تھا، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا اس میں سیسہ ہی بھرا ہے۔

"ہو۔ ہُو۔ ہُو۔ ہُو ... ہا۔ آ۔ آ"۔ اب کے انھوں نے خوب زور لگایا اور کھینچکر جو دیکھتے ہیں تو منو کا جسم، تعجب اور ڈر سے وہ بوکھلا

سے گئے۔ منو ابھی تک سویا ہوا تھا، ساری رات وہ ٹرنکوں، چوبی بکسوں، لپٹے ہوئے بستروں اور قسم قسم کے بنڈلوں، یہاں تک کہ پلنگوں کی بندھی ہوئی پٹیوں، ناشتہ دانوں، اور سفید چادروں میں بندھی ہوئی گٹھریوں کے ایک انبار میں دب کر سویا تھا۔

"رام رے رام"، سیٹھ جی نے بڑے احترام سے کہا، لیکن ساتھ ہی ان کے زرد، چھوٹی سی، احتیاط سے رکھی ہوئی سیاہ مونچھوں والے چہرے پر ایک چوڑی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یہ سویرے ہی سویرے ہنسی کی کیا بات ہو گئی بھئی"، گنپت بڑبڑایا، وہ کاروبار میں سیٹھ جی کا نوجوان ساتھی تھا۔ چھوٹا سا گتھی بکروں کا سا چہرہ، دھنسے ہوئے گال، سامان کی بوریوں پر آڑا لیٹا ہوا زبردستی نیند بلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"لاحول ولا"، ایک مسلمان کسان نے منو کو دیکھ کر کہا جو اب سیٹھ برجھو دیال کے پاؤں کے گرد مڑ پڑا تھا۔ "یہ کون ہے بھئی! ابلیس کی اولاد"

"واہ گورو۔ واہ گورو"، ایک سکھ کسان نے ذرا تھم تھم کر کہا "واہ گورو کی کرنی نیاری ہے"

"زندہ ہے کہ مر گیا"، ایک عورت نے گردن بڑھا کر معلوم کرنا چاہا وہ اپنے گود کے بچے کے منہ میں اپنے پستان ٹھونسے جا رہی تھی۔ ڈبے کے دوسرے مسافروں نے بھی صبح کی سفیدی دیکھ کر اپنی آنکھیں کھولنی شروع کیں اور یہ عجیب منظر دیکھ کر سب پوچھنے لگے۔

"یہ کون ہے، کہاں سے آیا؟"

منوڑہ کے مارے سہم گیا، خوف کے مارے اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ جب پربھو دیال نے اُسے کھینچکر نکالا تھا تو وہ ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا کہ دو فیل پیکر دیو اس کے جسم کو کچل رہے ہیں، دو سینگوں والے ڈراؤنے بھوت اسے قمچیاں لگا رہے ہیں۔

"بھگوان کی کرنی بھی عجیب ہے"، پربھو دیال خود ہی خود بڑبڑایا "چلو یہ بھی اچھی فال رہی، شاید پہاڑی معلوم ہوتا ہے"

"اب تو تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ ایک پلا پلایا ثابت بیٹا مل گیا" گپت نے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "اب ان جڑی بوٹیوں کو بھول جاؤ جو تم اپنی بیوی کے لئے یا شاید اپنے لئے خریدنے والے تھے"۔ اور پھر اس نے ذرا سنجیدگی سے کہا "کیونکہ بھئی مجھے تو شک ہے کہ تمہاری بیوی بانجھ نہیں ہے بلکہ تم خود ہی نامرد ہو"

"کیوں رے تیرا کیا نام ہے، کہاں کا رہنے والا ہے، کس کا بیٹا ہے"، پربھو دیال نے پہاڑی لب و لہجہ میں کہا۔ ابھی تک وہ پہاڑی لہجہ بھولے نہ تھے، حالانکہ وہ بچپن ہی سے اپنا دیس چھوڑ کر دولت پور میں آبسے تھے۔ یہاں انھوں نے سڑکوں پر قلی کا کام کرنا شروع کیا تھا، اور اب ترقی کرتے کرتے ایک اچار اور عطر کی فیکٹری کے مالک بن گئے تھے۔

"بلاسپور میں مجھے منو کہتے تھے، شام نگر میں منوڑے"، منو نے ایک دم کہنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا پہاڑی لب و لہجہ نے تکلف کو بالکل برطرف کر کے اس کی زبان کھول دی ہے۔ "میرا باپ مر گیا اور پھر میری ماں بھی مر گئی، میرا چچا دیا رام شام نگر کے بینک میں

چپراسی ہے۔ اس نے دہیں کے ایک بابو کے یہاں مجھے نوکر رکھا دیا تھا۔ کل بابو نے مجھے بہت مارا تو میں بھاگ نکلا۔" اتنا کہہ کر ڈر اور خود رحمی کے ملے جلے جذبات سے اس کا چہرہ سکڑ گیا، اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ لیکن پھر فوراً ہی اسے اپنے رونے پر شرم آ گئی اور اپنی داہنے ہاتھ کی مٹھی سے اس نے اپنی آنکھیں چھپا کر ملنی شروع کر دیں۔

"ارے یہ تو بغیر ٹکٹ کے ہے" ایک نوجوان ہندو طالب علم بولے۔ وہ خالص انگریزی لہجے میں بول کر ان جاہل کسانوں پر رعب بھی جمانا چاہتے تھے اور اپنے نیم انگریزی کپڑوں، ایک گھسی ہوئی بنکی دار ٹائی مخملی ولیسٹ کوٹ، خاکی نیکر اور بڑے سے بھاری بھرکم صافے کی شان بھی برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

"بھئی اچھا ہو اگر ہم اسے اپنے ساتھ لے چلیں" پربھو نے اپنے ساتھی سے کہا

"ہمیں کیا معلوم یہ ہے کون؟" گنپت بولا۔ "چور ہے، اچکا ہے کون ہے۔ ہاں یہ تو ضرور ہے کہ ہمیں تلسی مہاراج اور بونگے کو کام میں مدد دینے کے لئے ایک لڑکا تو ضرور چاہیئے جو ادھر ادھر سندیسات لے جائے اور اوپر کا کام کرے۔ اور یہ تو کھانے کپڑے ہی پر راضی ہو جائے گا۔ تنخواہ دینے کی ضرورت نہیں"۔

"کیوں منو ہمارے ساتھ چلے گا؟" پربھو نے اپنے ساتھی کی تجویز پر کچھ دھیان نہیں دیا اور منو کے سیاہ بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا جو اس کے

بیٹا بناتے ہو کبھی منش کے رتبہ پہ پہنچاتے ہو۔ تمھیں یہ بھی معلوم نہیں ہے
کہ یہ ہے کون؟ کوئی چور ہوگا گھر سے بھاگا پھرتا ہے "

پربھو دیال اپنے ساتھی کی بات پہ ایک کھسیانی سی مسکراہٹ
اپنی صورت پہ لاکر رہ گئے لیکن ان کا دل مجبور کر رہا تھا کہ منو سے باپ کی
سی نرمی کے ساتھ پیش آئیں۔

اب گاڑی دولت پور کے مضافات سے گذر رہی تھی۔ منو
کھڑکی میں سے باہر جھانک رہا تھا۔ کیلے کے چوڑے چوڑے پتوں والے
جھنڈ میں سے ایک سنہرا مندر جھپ سے اس کی نظروں سے گذرا وہ کھڑکی
کی طرف جھک گیا۔ اور اسے ننگے ننگے لوگ دکھائی دینے لگے۔ کچھ کنوؤں
سے پانی کھینچ رہے تھے۔ بعض سر پر پانی ڈال کر نہا رہے تھے۔ بعض
ایک دوسرے کو تیل کی مالش کر رہے تھے، اور بعض قریب ہی اکھاڑے
میں کشتی لڑ رہے تھے۔ لیکن منو پوری طرح جائزہ بھی نہ لینے پایا تھا کہ یہ منظر
گذر گیا۔ اب وہ دوسرے منظر کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ یہ ایک چار مینار والی
مسجد تھی جس میں ایک آدمی جو منو کے خیال میں ملا تھا سبز عمامہ اور سفید عبا
پہنے چیخ چیخ کر اذان دے رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہیں بہت سے پاٹ اچھتوں
والے مکانات اور طرح طرح کی دکانوں سے گذرنے لگیں جو ریل کی کراسنگ
کے پاس تھیں۔ کراسنگ کے نزدیک ہی نیلی وردی پہنے ایک آدمی
کھڑا ہوا ریل کو ہری جھنڈی دکھا رہا تھا۔ بازار میں بہت سے لوگ تیز
تیز قدم اٹھاتے خرید و فروخت کرتے پھر رہے تھے۔ پھر منو کی نگاہیں ان
موٹروں، بسوں اور لاریوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں جو ریل کی پٹری کی متوازی
سڑک پر دھول کے بادل اڑاتی دوڑتی چلی جا رہی تھیں۔ ایک بڑی سی فیکٹری

کی چمنی میں سے دھواں نکل رہا تھا، اور اس کی پچھلی دیوار پر ہندی کے بڑے بڑے الفاظ میں لکھا تھا "سوڈا واٹر کا کارخانہ"۔ منو کی نگاہیں اس پر سے ہوتی ہوئی، برما آئل کمپنی کی بڑی بڑی ٹنکیوں سے گذرتی آسمان میں پہونچ گئیں اور انھوں نے وہ نظارہ دیکھا جو منو نے کبھی دیکھنا تو کیسا تخیل میں بھی نہ سوچا ہوگا۔ لوہے کی ایک بڑی عجیب سی چڑیا، جس کے پر بالکل سیدھے تھے، بھنبھناتی ہوئی صاف اور شفاف مسطح آسمان پر منڈلا رہی تھی، اور اس کی دم سے دھوئیں کی ایک باریک، دھار نکل کر فضا میں پھیلتی جا رہی تھی۔ منو کی نگاہیں پھر زمین پر اتر آئیں۔ اور دولت پور کے میلوں تک بکھرے ہوئے گھروں کا جائزہ لینے لگیں اور پھر اس کے اپنے دل میں اتر آئیں جیسے وہ اس گوناگوں دنیا کی وسعت کی تاب نہ لا سکتی ہوں، اس کے دل میں تو جیسے جذبات اُبلے پڑتے تھے، ڈر اور خوشی کے ملے جلے جذبات، کچھ اسی طرح کے جذبات جو پہلے پہل شیام نگر دیکھ کر اس کے دل و دماغ پر چھا گئے تھے اسے نا معلوم باتوں کا ڈر اور اس نئی دنیا میں جس میں وہ داخل ہو رہا تھا، بہتر زندگی بسر کرنے کی امید!

بالس کی اونچی سی گاڑی پر چاروں طرف موٹا کھدر لپٹا ہوا تھا اور منو پر بھوا اور گنپت کے بیچ میں دبا سکڑا، اس گاڑی میں بیٹھا اسٹیشن سے گھر آ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دولت پور کے بازار وغیرہ نہ دیکھ سکا۔ البتہ اس نے محلہ بلی ماروں میں داخل ہوتے وقت کچھ دکانیں دیکھی تھیں جن کے آگے گاڑی آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ اور خود گلی تو بہت ہی پتلی تھی، چاروں طرف کوڑے کے ڈھیر نالیوں کے پاس پڑے سڑ رہے تھے، چاروں طرف اونچے اونچے تین منزلہ مکانات تھے۔ منو کچھ گھبرایا ہوا سا پربھوا اور گنپت کے پیچھے پیچھے

چلا جا رہا تھا۔ کچھ نیم برہنہ عورتیں کھلے چبوتروں پر بیٹھی تیل بنا رہی تھیں۔ دیکھنے میں یہ سب عورتیں پہاڑی لگتی تھیں، غالباً قلیوں کی بیویاں ہوں گی جو اس طرح گھریلو دستکاری کر کے کچھ فاضل پیسے پیدا کر لیا کرتی تھیں۔ اور جب انھوں نے منو کے مربیوں کا پہاڑی زبان میں استقبال کیا تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ پہاڑی ہی تھیں۔

"جے دیو سیٹھ جی! اچھے رہے، گھر پر سب مزے میں ہیں"

اور پربھو نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر جواب دیئے

"پالاگوں"

اب یہ لوگ ایک بڑے سے مکان کے صدر دروازے میں داخل ہوئے، اندر بڑا سا صحن تھا اور چاروں طرف چھوٹی چھوٹی تاریک کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ کوٹھریوں کے سامنے اور بہت سی پہاڑی عورتیں تیل بنانے میں مصروف تھیں۔ ایک دم سے بہت سی بوڑھی عورتوں اور جوان لڑکیوں نے پربھا اور گنپت کو چاروں طرف سے گھیر لیا، اور بڑی محبت سے اُسے خوشامدید کہتے ہوئے پوچھنے لگیں کہ پہاڑ سے کیا کیا لائے اور جب پربھا نے مسکرا کر منو کی طرف اشارہ کر دیا کہ بس یہی ایک سوغات لایا ہوں، تو منو بہت ہی گھبرایا۔ اس کے بعد دس بارہ سیڑھیاں چڑھ کر یہ لوگ ایک بڑے سے کمرے میں پہنچے جس کے دروازے صحن کی طرف کھلتے تھے، اور ایک دبلی سی شرمیلی عورت، جس کی آنکھوں میں نرمی اور محبت کی چنگاریاں روشن تھیں، اور جو غالباً پربھا کی بیوی تھی آ کر منو کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ کسی قدر خاموش طبع اور زرد رُو تو ضرور تھی مگر جس اشتیاق سے وہ منو کی طرف بڑھی اور بغیر یہ معلوم کیے کہ وہ ہے کون، اُسے گلے سے لگا لیا اور اس

کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس سے منو کی گھبراہٹ دور ہو گئی اور اُسے فوراً اس نرمی کا احساس ہوا جو ایک لمحہ میں آدمی کو محسوس ہو جاتی ہے اور جس پر وہ آئندہ محبت کی بنیاد رکھ سکتا ہے۔

"پالاگوں بھابی"، گنپت نے تمسخرانہ انداز میں کہا

"جیتے رہو"، پاربتی نے جواب دیا۔ اور پھر چھیڑنے کے انداز میں بولی "تم اپنے لئے کوئی خوبصورت پہاڑی دلھن نہیں لائے؟ کیوں؟"

"نہیں تو"، گنپت نے بھی چھیڑتے ہوئے کہا "مگر میں آپ کے لئے ایک بنا بنایا بیٹا لایا ہوں"

"ہاں ہاں"، پاربتی نے منو کو گلے لگا کر کہا۔ بات ختم ہو گئی اور پھر وہ اپنے میاں سے مخاطب ہوئی۔

"کھانا بس تیار ہی ہے۔ میں ابھی لائی، تم جا کے نہا ڈالو، تاکہ کھانے کے بعد سو رہو تو سفر کی تھکن دور ہو جائے"

"اچھا"، پربھا نے محبت سے کہا۔ پھر اس نے کونے سے لگی ہوئی [illegible] کی کھاٹ گھسیٹی۔ اس پر اپنا سامان پھینکا، اور منو سے بھی بیٹھنے کو کہا۔ [illegible] اونچا سا کمرہ، تپتے ہوئے صحن کے بمقابلہ کتنا ٹھنڈا ہے اس نے اپنے منہ پر سے پسینہ پونچھ ڈالا اور سوچنے لگا کہ کارخانہ معلوم نہیں کہاں ہوگا۔ اتنے میں اس کی مالکن نے اسے ایک گلاس شربت کا پکڑایا، اور منو کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ پھر پربھا نے اُسے ایک کونے میں نہانے کے لئے ایک صندلہ بنا دیا۔ اس کے بعد کھانا ہوا۔ کھانے میں میٹھے اور سادے دو قسم کے چاول تھے۔ دال۔ سبزی، املی کا اچار، سب پہاڑی کھانے جن کی ہوک منو کو بابو جی کے یہاں اُٹھا کرتی تھی، اور کچھ شہری کھانے بھی تھے۔ گیہوں

کی روٹیاں، دہی اور منو نے ایسا لذیذ کھانا آخری مرتبہ اپنے ماں باپ کی شرادھ کے دن کھایا تھا، یہ شرادھ اس کی چچی نے اس کے شہر آنے سے تین مہینے پیشتر کی تھی، تب سے منو نے ایسا لذیذ کھانا چکھا بھی نہ تھا۔ اس کا پیٹ بھر چکا تھا جسم نہانے سے ٹھنڈا ہو چکا تھا، چارپائی پر لیٹنے کی دیر تھی کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب وہ سو کر اٹھا تو دوپہر بیت چکی تھی۔ اوپر بھا بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ اس نے منو سے کہا۔

"فیکٹری دیکھے گا؟ وہ رہا اس کا دروازہ۔ کسی سے کہنا تجھے اندر اتار دے"

منو کمرے کے دوسری طرف ایک کھڑکی کے پاس گیا اور نیچے دیکھنے لگا، لیکن وہ ہچکچانے لگا۔ فیکٹری کے تاریک، گھٹ تہہ خانے میں اترتے ہوئے اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ شہر کے ٹھیک بیچوں بیچ، اونچے اونچے مکانات کے درمیان، یہ فیکٹری گھٹے ہوئے تہہ خانوں میں بنی ہوئی تھی۔ اس میں اترنے کی کھڑکی بھی ایک کنوئیں کی سی گہرائی کے بالکل کنارے، ادھر رکھی ہوئی تھی۔ اور منو کھڑا رہا تھا کہ کنوئیں میں اب گرا کہ گرا۔ لیکن منو اپنے مخصوص بھولے جوشیلے پن سے کھڑا دیکھتا رہا۔ یہ جگہ اسے بری تو ضرور لگی تھی مگر پھر اسے اپنی خوش نصیبی کہاں لگیا۔ پربھا نے ریل میں اسے اپنا لیا تھا، اور پھر پربھا نے اس کی خاطر بھی تو لڑائی کی تھی۔ لوہے کی بھاری سیاہ چھتوں کے نیچے اسے دو غاروں کے تاریک منہ نظر آئے جو صحن میں کھلتے تھے۔ ایک طرف کوئلے بڑے بڑے چولھے بنے ہوئے تھے جن پر بڑی بڑی دیگیں چڑھی کھد بد رہی تھیں، اور ان میں سے خوب بھاپ نکل رہی تھی۔ دوسری طرف ایندھن کے بوروں کی قطار کے نیچے ایک لمبا سا تختہ بچھا تھا جس پر ایک

لوہے کی تجوری رکھی تھی، کچھ مٹیالے رنگ کے کھاتے رکھے تھے، ایک دفتی کا قلمدان اور سیاہ روشنائی کی ایک بوتل۔ چولھوں کے پاس دیوار سے لگی کچھ ٹنکیاں رکھی تھیں۔ کچھ ٹنکیوں میں تانبے کی دیگچیاں وغیرہ بھری تھیں اور چند میں ادرک، گرم مسالے، بھینگا ہوا لہسن وغیرہ رکھا تھا۔ ایک پتلا سا کوئی گز بھر چوڑا گلیارا باہر کی طرف گلی میں کھلتا تھا۔ فیکٹری اس گلی کے بالکل آخر میں تھی۔

جس آدمی نے منو کو کھڑکی میں سے فیکٹری میں اتارا وہ کچھ ایسا عجیب سا تھا کہ منو کو تو متلی آنے لگی۔ بھاری بھرکم، پورے جسم پر کہیں خطوط نہیں، جیسے کوئی بھاری مسطح ستون ہو۔ گٹھا ہوا جانوروں کا سا چہرہ اور ایک ایک نقش بس گوشت کا ایک لوتھڑا، بڑے بڑے نمناک ہاتھ پاؤں جن پر گھٹے پڑے ہوئے، نسیں موٹی اور ابھری ہوئی، اس کے کنپٹی چہرے پر بھی بڑے عجیب سے سفید سفید داغ تھے، منو نے سوچا یہ ضرور کوڑھ کے داغ ہوں گے۔ اور یہی نہیں بلکہ اس کا سارا وجود، جو ہاتھ کے بنے ہوئے موٹے کپڑے کی صدری اور دھوتی میں لپٹا ہوا تھا۔ کچھ عجیب کھویا کھویا سا تھا اس کی لنگوٹی تو اور بھی اس کے احمق اور بے وقوف ہونے کا اعلان کر رہی تھی، جیسے ہی اس نے منو کو زمین پر ٹکایا، منو ایک دم الگ ہٹ گیا، اور پھر مسکرا کر اس کی صورت تکنے لگا۔ پھر اس نے گنپت کی آواز سنی۔

"ہے ... مہاراج چلو اپنا کام کرو۔"

منو نے سوچا کہ یہ اشارہ ہے کہ کھسک جاؤ۔ وہ کچھ گھبرا کر اُن تاریک کوٹھریوں کی طرف چلا۔

لیکن ان کوٹھریوں کے بالکل سامنے، چولھوں کی طرف منہ کئے ایک

چھوٹا سا، موٹا سا، زرد مٹی کی رنگت والا لڑکا کھڑا تھا اور اس نے منو کو کچھ ایسی شبہ کی نظروں سے دیکھا کہ منو کی گھبراہٹ اور بھی بڑھی۔ اور یہاں تک ہی نہیں اس لڑکے نے تو منو کو دھکا دینا شروع کیا، اور بڑا سا منہ کھول کر عجیب عجیب آوازیں نکالنے لگا۔ منو پریشان ہو گیا۔

"بونگا تم سے بیٹھنے کو کہہ رہا ہے"، گنپت نے تخت پر سے آواز دی، جہاں وہ وہاں بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا "وہ گونگا اور بہرا ہے نا"۔

جب منو کو اطمینان ہو گیا۔ تو وہ چولھوں کے پاس سے گذر کر کوٹھریوں کی طرف جانے لگا۔ ایک گورا سا لڑکا ململ کی قمیص اور دھوتی پہنے، بابوؤں اور صاحب لوگوں کی طرح مانگ نکالے، ایک بڑی سی دیگ سے گرم گرم بھاپ نکلتا پانی ایک ناند میں اُلٹ رہا تھا۔ ایک دم سے وہ غصہ میں بھر کر منو پر پھٹ پڑا۔

"دیکھو بے دیکھ نیچ گدھے"۔

منو اس کے پاس سے گذرا بھی نہ تھا کہ بہت سی بڈھی کھوسٹ جھریوں والی عورتیں، جو کوٹھریوں میں بیٹھی سیب چھیل رہی تھیں، ایک دم سے چیخنے لگیں۔

"ہائے ہائے، ارے جل گیا رے، ارے مر گیا۔ ارے جل مرا"

"بیٹھ بے سور۔ کیوں مٹکتا پھر رہا ہے" گنپت نے چیخ کر کہا۔ "کسی بھی عرق تیار کر رہا ہے۔ پھر یہ کیوڑہ کا عرق لے کر وہ سب گاہکوں کے یہاں پہونچائے گا۔ اور تجھے بھی لے جا کر سب دکانیں دکھا دے گا۔ پھر کل سے تو وہاں بوتلیں پہنچایا کرنا۔ جب تک چپکا بیٹھ۔ ادھر اُدھر دوسروں کے کام میں دخل مت دیتا پھر

چپکا بیٹھنا سیکھ، اچھا مت پھر۔ ہم لوگ تجھے یہاں نہ لاتے تو پولس میں بندھا بندھا پھرتا یا شہر میں کہیں بھوکوں مارا پھرتا، ادھر ادھر مٹک کر سب کے کام میں مت حرج کر"۔

پھر اس نے منو سے ایک چوکی کی طرف اشارہ کیا جس پر مٹی کی ایک موٹی تہہ جمی تھی۔ یہاں عموماً جوتے رکھے جاتے تھے لیکن نوکروں کے بیٹھنے کے لئے وہ جگہ مناسب سمجھی جاتی تھی۔

منو نے چاروں طرف دیکھا۔ موٹی موٹی دیواروں میں سے، جو مدتوں کی نمی سے گھس گئی تھیں، ادھر ادھر اینٹیں نکلی ہوئی تھیں سوائے ان مقامات کے کہ جہاں گوبر سے لیپا گیا تھا یا جہاں مکڑیوں نے لمبے لمبے باریک جال بُن دیئے تھے۔ یا جہاں سیاہ چکنا چالا اور کالوس لٹک رہی تھی۔ اور چمگادڑ لیے لٹکے تھے گویا وہ کوئی کھوہ یا غار تھا۔ اس کی نگاہیں ادھر ادھر گھومتی گھماتی گنپت کی نگاہوں سے دوچار ہوگئیں۔ لہٰذا اس نے موٹے موٹے لکڑیوں کے گدھوں کے انبار کو دیکھنا شروع کیا جس میں جگہ جگہ مکڑی کے جالے تھے اور لوہے کی چھت کو تکنے لگا جو تمام صحن پر ایک [illegible] طرح چھائی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ نہ تو کبھی جنت کی [illegible] دنیا سے ہوکر گذرتی ہیں اور نہ ہی کبھی سورج کی روشنی داخل ہوتی تھی۔ ہاں چھوٹے چھوٹے روزنوں اور دراڑوں میں سے وہ البتہ کچھوے کی [illegible] رینگتی رینگتی آسکتی تھی۔ وہ ابھی یہ غور کر ہی رہا تھا کہ گنپت نے ناند [illegible] گرم پانی ڈالا جس میں سے بھاپ کے بادل اٹھنے لگے اور اس کی [illegible] کے آگے اندھیرا آگیا۔ ایسی حالت میں اس نے اپنا جوتا نہ لیا تو [illegible] یا لگا کہ دیگیں، ٹینکیوں، گہری تاریک کوٹھریوں اور موٹی کھردری

دیواروں کی اس زمین و زر دنیا میں اس کا اپنا وجود بالکل مختصر اور حقیر ہو کر رہ گیا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں مل کر کسی قدر مطمئن ہونا چاہا مگر اسے ایسا محسوس ہوا کہ صحن میں جو اور تین نوکر کام کر رہے ہیں وہ زبانِ حال سے اس سے پوچھ رہے ہیں کہ تم کون ہو؟ یہاں کہاں سے آ گئے؟ اسے ایسا لگا جیسے وہ بن بلایا مہمان ہے۔ اور اس خیال ہی سے وہ چڑ چڑا گیا دیگچیوں کی گرم گرم بھاپ، اس کے ساتھ کوٹھریوں سے ایک عجیب طرح کی باسی، بساندی ہوا، پسینہ کی کھٹی کھٹی بُو اور اس پر بھنبھناتی ہوئی مکھیاں، منو کے پَر نہ ہوئے کہ اڑ جاتا۔

لیکن اسی وقت سیٹھ پربھو دیال آ گئے اور ان کے وجود سے فضا میں ایک نرمی اور حلاوت پھیل گئی۔

"او منو کہاں ہے!" پربھو دیال نے منو کو تلاش کرنے کے لئے فیکٹری کے اندھیرے میں اپنی آنکھوں کو چندھیانا شروع کیا۔

"وہ رہا" ۔ گنپت نے کوٹھری کے پاس سے اشارہ کیا "ابھی تو یہ بانور مرتے مرتے بچا، تلسی دیگچیوں میں سے ناند میں گرم پانی اُلٹ رہا تھا اور یہ چولھوں کے پاس جا کر کھسر پھسر کرنے لگا" منو اٹھا اور پربھو دیال کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"چل تجھے دکانیں دکھا لاؤں" ۔ مالک نے مسکرا کر کہا "سب گاہکوں کی دکانیں دیکھ لینا پھر تجھے وہاں سے امان لے جانا ہوگا تھوڑی سیر بھی کر لینا، اور مندر کو بھی چلے چلیں گے"

"ہاں ہاں لے جاؤ اسے۔ اور خوب اس کو خراب کرو۔ خوب سر چڑھاؤ۔ جیسے تم نے سب نوکروں کو کیا" ۔ گنپت نے

ترشی سے کہا۔

پربھو مسکرایا، مٹیالے رنگ کا ایک گھانہ اٹھایا اور باہر چل دیا منو بھی اشتیاق سے اس کے پیچھے ہو لیا۔ ویسے تو شام نگر بھی منو ایسے بلاس پوری پہاڑی لڑکے کی تخیل سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا تھا لیکن دولت پور تو اس سے بھی زیادہ پیچیدار اور کچھ ایسا مختلف چیزوں کا مرکب نکلا کہ منو کے تو قدم لڑکھڑا گئے۔ سب سے زیادہ تو اُسے یہ فکر تھی کہ اپنے آپ کو بخوبی سنبھال کے پربھو کیساتھ چپکا رہے تاکہ کہیں کھو نہ جائے

پربھو کے پیچھے پیچھے وہ بل کھاتی سڑکوں سے نکل کر مصروف بازار میں داخل ہوا پھر وہ بازار جھٹکیاں لیں مڑ گئے، پھر بازار سیٹیاں میں اور پھر محلہ چابک سواراں میں، اور اُسے بالکل یاد نہ رہا کہ بائیں مڑے تھے یا دائیں وہ حیران رہ گیا، اُسے تو بس اس بات کا یقین تھا کہ اگر وہ اکیلا ہو تو نہ تو آگے جا سکتا ہے نہ پیچھے۔ لہٰذا ایک آنکھ اپنے مالک اور ایک آنکھ زیادہ اشتیاق سے، دوکانوں پر رکھے، وہ پتلی ٹیڑھی میڑھی گلی سے گذرتا، سانولی، زرد، گندمی صورتوں، چمکتی آنکھوں اور سفید دانتوں کے پاس سے ہوتا چلا جا رہا تھا۔ سب لوگ ایسے ملے جلے تھے کہ صرف اپنے کپڑوں کی قطع اور رنگ سے ہی الگ الگ پہچانے جا سکتے تھے۔

"آؤ سیٹھ پربھو دیال، دالیں آ گئے" کسی نے آواز دی۔ پربھو رک گیا۔ منو بھی رک گیا۔ اور چاروں طرف کی دکانوں کو غور سے دیکھنے لگا کہیں مرتبان اور برنیاں رکھی تھیں جن میں سینکڑوں قسم کی طرح طرح کی مٹھائیاں رکھی تھیں، کہیں لوہے کے ہر سائز کے تالے رکھے تھے، مختلف رنگوں اور چھاپوں کے کپڑے، چمڑے کا سامان جیسے کہ پیٹیاں، زینیں اور گھوڑے

کے سازکی دوسری چیزیں سب دوکانوں پر آگے سائبان تھا اور وہ تختوں کی چوکیوں پر، خراد کے ستونوں کے سہارے بنائی گئی تھیں۔ سب سے نچلے حصہ پر دوکاندار بیٹھا فروخت بھی کرتا جاتا اور روپے بھی گنتا جاتا تھا۔ ایک دو منٹ بوکھلانے کے بعد منو نے دیکھا کہ پربھو کوئی پانچ گز آگے ایک دوکان سے لگا کھڑا ہے۔ دوکان میں تیل، عرق، عطر وغیرہ کی بہت سی بوتلیں سلیقے سے لگی ہوئی تھیں۔ ظاہر میں یہ کسی حکیم کی دکان معلوم ہوتی تھی کیونکہ بہت سے زرد رو مرد اور عورتیں زیورات اور رنگ برنگے ریشم کے کپڑے پہنے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ "یہ نیا لڑکا آیا ہے اور یہ اب آپ کے پاس عرق کی شیشیاں پہونچایا کرے گا"۔ پربھو نے منو کو کھینچ کر ایک منکے ایسی توند والے لالہ جی کے سامنے کر دیا جو نہایت آرام مگر ہوشیاری سے تخت پر ایک چکنا میلا سا گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔

"اچھا"۔ لالہ جی نے حامی بھری۔

پربھو نے عاجزی سے ہاتھ جوڑے، جھکا اور پھر آگے چل دیا۔ منو کتے کی طرح اپنے مالک کے پیچھے پیچھے چلا۔ اور فٹ پاتھ کی دکانوں کے سائن بورڈ پڑھتا جا رہا تھا۔ ہر دکان پر کم از کم دو اور نہ تین چار سائن بورڈ لگے ہوئے تھے۔ خدا جانے یہ بات تھی یا اس گلی میں ڈاکٹر ہی ڈاکٹر بھرے تھے کہ منو نے کم از کم پندرہ ڈاکٹروں کا نام پڑھا جو ان کی ڈگریوں کے دم چھلوں سمیت ہندستانی اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھا تھا۔ ایک دکان اور دکانوں سے ذرا مختلف تھی۔ اس کے اندر تمام کرسیاں میزیں وغیرہ لگی تھیں اور اس دکان پر لکھا تھا۔

"ڈاکٹر ہیرالال سوتی ایم بی بی ایس (پنجاب)، ایل آر سی پی۔

ایم آر سی ایس (انگلینڈ) ڈی (فی ایم (یورپول) ڈی او ایم ایس (برسٹل)

منو زور زور سے یہ نام اور القاب پڑھتا جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ اس کے کیا معنی، ایک دکان پر منو کی توجہ خاص طور پر کھنچ گئی۔ اس میں بہت سے رنگین چمک دار روشنی کے قمقمے، ایک بجلی کے تار سے ٹنگے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے، نہ کہیں موم بتی تھی، نہ تیل، تھا۔ منو کو بڑا تعجب ہوا لیکن شام نگر سے اس نے یہ سیکھا تھا کہ جو چیز سمجھ میں نہ آئے بس سمجھ لینا چاہیے کہ وہ انگریزی ہے۔ اس لئے اس نے رک کر دریافت نہیں کیا بلکہ آنکھیں پھاڑے سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا، آگے بہت سے مکانات تھے کہ ایک اونچی لمبی قطار تھی۔ نیچے دکانیں تھیں اور ان کے اوپر پہلی منزل کو بڑے بڑے ستونوں پر بنایا گیا تھا۔ ان ستونوں پر رنگ برنگے پھول پتے کھدے ہوئے تھے جیسے اس نے اپنی اردو کی تاریخ کی کتاب میں شاہجہاں کے دیوانِ خاص کی تصویر میں دیکھے تھے۔ ان سے آگے بڑھ کر منو کی نظر ایک اور دکان پر پڑی جس میں کچھ درزی بیٹھے کپڑے سی رہے تھے، ان میں سے ایک سنگر مشین سے سی رہا تھا۔ پھر ایک اور دکان پر جہاں سنار بیٹھا چھوٹے چھوٹے چمکیلے پتھر جڑ رہا تھا۔ پھر ایک نانبائی کی دکان پر اور آخر میں اس کی نگاہ پھلوں کی ایک دکان پر پڑی، جہاں سنترے، فرنوزے، کیلے، آم وغیرہ اپنی خوشبو اور رنگ سے احساس لطیف کو دعوت دے رہے تھے ایک بھبھوت ملے جٹا دھاری سادھو، کمر میں ایک زنجیر باندھے، منو کے پاس سے گذرا، زنجیر میں دو چیتھڑے لٹک رہے تھے جو مشکل اس کا آگا پیچھا چھپا سکتے تھے اور وہ بڑے مزے میں اپنی موٹے دانوں کی مالا ہلاتا

چٹیا بجاتا چلا جا رہا تھا۔ بھیڑ اور زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ شلواریں پہنے مسلمانوں دھوتیاں پہنے ہندوؤں اور پتلون والے بابوؤں کا ایک ریلا تھا کہ امنڈتا چلا آتا تھا۔ پربھو نے منو کی انگلی پکڑ لی۔ ایک بیل گاڑی کے پہیے کے چوکھٹے میں دھنس گیا تھا۔ پاس سے سسکڑ کر نکلا اور ایک پتلی سی گلی میں داخل ہو گیا۔ یہاں بہت سے چھوٹے چھوٹے مندر تھے جن میں سے بیوتاؤں کی مورتیاں جھانکتی نظر آ رہی تھیں۔ کسی سکھ بزرگ کے مزار کے پاس سے ہو کر وہ ہانپتا کانپتا شنو کے کنول مندر کے صحن میں داخل ہوا۔ سامنے ہی ایک متبرک حوض تھا۔ پربھو نے چنبیلی اور بیلے کے پھولوں کا ایک ہار خریدا۔ اُسی وقت سیڑھیوں کے نیچے والے صحن سے باجہ بجنے کی آواز آنے لگی، سب لوگ جلدی جلدی حوض کے آس پاس جمع ہو گئے۔ انسانوں کا ایک بحرِ غفیر ہاتھ اٹھا کر دعائیں بدبدانے لگا۔ منو نے اس سے پہلے کبھی اتنے آدمیوں کے بیچ میں سورج کی پوجا نہ کی تھی جواب، رات بھر کے لئے رخصت ہوتے ہوئے اپنی آخری کرنیں پھیلا کر حوض کے پانی میں آگ کے شعلوں کا سا رنگ پیدا کر رہا تھا۔ آخر لوگ پوجا سے فارغ ہو کر چلنے لگے جھٹپٹے کے اندھیرے میں مندر کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ پربھو نے کپڑوں کی وہ الا منڈر کے ایک بیوپاری کو پہنا دی جو میرے جواہرات کے زیور اور ریشم اور زردوزی کے کپڑے پہنے بڑا شاندار لگ رہا تھا۔ منو آنکھیں پھاڑے منہ کھولے، گونگوں کی طرح بجتی ہوئی گھنٹیوں کی گھنا گھن اور ہری اوم، ہری اوم کے نعرے سن رہا تھا۔ وہ دبا ہوا اپنے مالک کے پیچھے پیچھے ایک سائبان میں داخل ہوا جہاں کہیں پھولوں کے تختے اور سایہ دار

درختوں کے جھنڈ بھی تھے۔ یہاں بہت سے ننگ دھڑنگ دُبلے پتلے سادھو بیٹھے تھے۔ ان کے پاس خوشبو کی لکڑیاں اور جڑیں جل رہی تھیں، اور عقیدت مند لوگ پھل پھلاری پھول وغیرہ سے ان کو نذریں چڑھا رہے تھے، ان کے علاوہ کچھ ایسے سادھو بھی تھے جن کے داڑھی مونچھ صفاچٹ تھی، گیروے رنگ کے کپڑے، چڑھی ہوئی آنکھیں، اس ہستی کا دھیان کئے بیٹھے تھے جسے لوگ خدا کہتے ہیں لیکن جسے منوہر بھرپور پہچان سکا نہ سمجھ سکا۔

گھر واپس آتے ہوئے منو آج دن بھر کے واقعات کا دھیان کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نئی ہی دنیا میں آگیا ہو۔ اور وہ سوچنے لگا کہ مالک کا گھر کیسا اچھا ہے، یہاں ضرور مجھے سکھ نصیب ہوگا، خوب گھوموں گا پھروں گا اور رہی فیکٹری تو وہ کون سی ایسی صاف ستھری جگہ ہے کہ چلنے پھرنے سے میلی ہو جائے گی۔ معلوم نہیں کام کیا کرنا پڑے گا۔ خیر اچھی تو گذرے گی، بازار جانے کا خیال کا فی دل خوش کن تھا اور پھر کتنی ہی عجیب عجیب نئی نئی چیزیں۔ عجیب ہر طرح کی چیزیں، شام نگر سے بھی زیادہ عجیب! بالکل طلسماتی شہر تھا یہ۔ آج صبح جب وہ اپنے سفر کے بالکل اختتام پر پہنچا تھا تو اُسے ایک دم سے یاد آیا تھا کہ اس کی تاریخ کی کتاب میں لکھا تھا کہ دولت پور شمال ہندستان کے سب سے پرانے اور اہم ترین شہروں میں سے ہے۔ اُسے یاد آیا کہ یہ شہر مہاراجہ دولت سنگھ نے قائم کیا تھا۔ یہ راجہ راجپوت تھا اور اس کی حکومت اس شہر پر اس وقت تھی جب کہ رامائن کے ہیرو رام چندر جی اودھ میں بادشاہت کیا کرتے تھے تاریخ کی رُو سے اس شہر میں بہت سی لڑائیاں ہوئی تھیں اور "بہت سی"

سومناتھ کے مندر کی دولت کو لوٹنے والے محمود غزنوی نے بھی اس پر حملہ کیا تھا۔ منو سوچنے لگا کہ کیا محمود نے اس مندر سے بھی جواہرات اور سونا لوٹا ہوگا۔ جس میں وہ ابھی ابھی ہو کر آ رہا تھا۔ لیکن پھر اُسے یاد آیا کہ مغل اعظم شہنشاہ اکبر نے اس شہر کے تمام پجاریوں اور پنڈتوں کو روپیہ دیا تھا اور اپنے مذہب پر قائم رہنے کے لئے ان کی ہمت افزائی کی تھی۔ اس شہر کے باہر سکھوں نے مغلوں کو شکست دی تھی اور رنجیت سنگھ نے شہر کے تمام عمدہ مکانات اپنے محبوب امیروں وزیروں کو بانٹ دیئے تھے لیکن انگریزی سرکار نے غدر سے پہلے اس شہر کو پھر فتح کر لیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں ہندستان کے بادشاہوں کی وہ تمام شاندار تصویریں پھرنے لگیں جو اس کی تاریخ کی کتاب میں تھیں، گلے میں موتیوں کے ہار پہ ہار، کلاہوں اور صافوں پر طرے لگے ہوئے لباس میں ہیرے جواہرات ٹنکے ہوئے۔ اور وہ سوچنے لگا کہ کون جانے یہ شہر جب بنا ہوگا تو میرے گاؤں کا نام و نشان بھی نہ رہا ہوگا۔ شہر کے بڑے بڑے مندروں اور شاندار مسجدوں اور نئی پرانی دکانوں کے جمگھٹ سے اُسے گھبراہٹ ہو رہی تھی، اس سے تو شہر کے باہر ہی اچھا تھا جہاں ریل کا اسٹیشن تھا اور صاحب لوگوں کے سفید سے سارے بنگلے بنے ہوئے تھے۔ اُسے تعجب ہو رہا تھا کہ انگریزی سرکار نے ہرے سے شہر کو کیوں نہیں دیا اور پھر یہاں بنگلے بنا کر اس میں میز کرسیاں کیوں نہیں بچھا دیں۔ لیکن خیر یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ وہ یہاں تک پہونچ گیا۔ اگر پربھو اُسے نہ لے آتا تو شاید اب تک وہ بھوکا پیاسا کھویا ہوا ریل ہی میں بیٹھا رہتا۔ اُس نے دوڑ کر اپنے مالک کی انگلی پکڑ لی کیونکہ اس سوچ بچار میں وہ پیچھے رہ گیا تھا۔

"اُٹھ رے منو، اے منو، اُٹھ بیٹھ بس اب" صبح سویرے منو نے دور سے تلسی کی گونجتی ہوئی آواز سنی، پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے اس کا پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر ہلایا اور پھر کسی نے دھیرے سے اس کے بالکل پاس آکر کہا "منو اُٹھ بیٹھ، اُٹھ جا"

منو نے اپنی کیچڑ بھری آنکھیں مچمچا کر ذرا کھولیں اور نیند بھری آواز میں کراہنے لگا۔

"ارے اُٹھ بیٹھ، دیکھ تو سہی، ورنہ چھوٹے سیٹھ جی خفا ہونے لگیں گے"

منو نے جمائی لی، دونوں بازوؤں کو پھیلا کر ایک زور کی انگڑائی لی اور آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مَل کر چاروں طرف دیکھا۔ رخصت ہوتی ہوئی رات کا اندھیرا اب بھی سفید چادریں اوڑھے ہوئے اُن لوگوں پر چھایا تھا جو آس پاس کے مکانوں کی چھتوں پر چارپائیوں پر پڑے سو رہے تھے۔ لیکن پَو پھٹ چکی تھی۔ ہوا میں پہاڑوں کی صبح کا سارس تھا۔ اپنے گاؤں کے چاروں طرف کے چٹانی افق کا منظر منو کی آنکھوں میں پھرنے لگا۔ چٹانوں کے کنارے کنارے، پہاڑوں کے دامن میں چڑیوں کے گھبرائے ہوئے اڑتے ہوئے غول جیسے کسی نے آسمان پر دانے بکھیر دیئے ہوں، اور اس آسمان کے نیچے گایوں کے وہ گلے۔ شام نگر میں اُسے گھر کبھی شاذ ہی یاد آتا تھا کیونکہ وہاں وہ نسبتاً دیر سے اٹھا کرتا تھا، سورج نکل آتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے دل کو سمجھایا کہ گھر کی یاد یا بابو جی کے یہاں کا خیال کرنا فضول ہے۔ "اب اُن لوگوں کو میری قدر معلوم ہوتی ہوگی" وہ سوچنے لگا۔ "میرا چچا بھی ضرور خفا ہوگا، میں اُسے خط لکھ کر بتا دوں گا کہ میں اچھی طرح ہوں لیکن واپس آنا نہیں چاہتا"

"آؤ" تلسی نے کہا۔ اور ایک پھٹی ہوئی دری میں ایک میلی سی قمیص اور ایک چکٹ تکیہ لپیٹ کر اپنے بغل میں دبایا۔ یہی اس کے بستر کی کل کائنات تھی۔

منو سوئے ہوئے لوگوں کے بیچ میں سے پنجوں کے بل چلتا ہوا تلسی کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ سیڑھیوں کی ہوا گندی اور باسی تھی کیونکہ دروازے تمام رات بند رہے تھے۔ اندھیرے میں راستہ ٹٹولتے ٹٹولتے منو کی پیشانی پر پسینہ آگیا۔

"آ میں تجھے اٹھا کر اتار دوں" تلسی نے فیکٹری کے پاس کھڑے کھڑے کہا۔ لیکن منو الیا کو دگیا جیسے وہ پرانے زمانے میں پیڑوں پر چڑھا اترا کرتا تھا۔ تلسی ایندھن والے کونے کی طرف گیا اور دو انسانی گوشت پوست کے ڈھیروں کو جھنجھوڑا۔

"اے مہاراج اٹھو! اٹھو رے بونگا"

منو نے دیکھا کہ فیل پیکر ستون نما احمق اور گونگا بہرا قلی نیند میں ایک دوسرے سے لپٹے پڑے ہیں۔ اس نے ٹنکیوں کے اوپر سے جھانک کر انھیں خوب غور سے دیکھا۔ اور سوچنے لگا کہ یہ لوگ روز رات کو یہیں سوتے ہیں۔ اسے اپنی خوش نصیبی کا خیال کر کے خوشی ہوئی کہ چھت پر سوتا تھا جہاں مالک، مالکن، گنپت اور تلسی سویا کرتے تھے۔ اسے الگ پلنگ بھی ملا ہوا تھا حالانکہ پلنگ ذرا چھوٹا ضرور تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سب کس کی بدولت ہے۔ رات کو سوتے وقت اس نے پربھو اور پاربتی کو کھانا کھاتے وقت یہ کہتے سنا تھا کہ وہ اسے گود لے لیں گے۔ منو کو اپنی مالکن اچھی لگتی تھی۔ اس نے منو کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور روٹی کے ساتھ کھانے کو مکھن بھی الگ سے

دیا تھا۔ لیکن وہ بہت ہی خاموش طبیعت تھی۔ اس کا زرد، زیتونی چہرہ ہمیشہ سنجیدہ رہتا تھا۔ وہ شاذ ہی کبھی مسکراتی تھی اور بہت کم بات کرتی تھی۔ منو پر اس کا کافی رعب تھا اور وہ اس سے شرماتا بھی تھا۔

"چل رے منو چولھے میں سے راکھ نکال"۔ تلسی نے دھیرے سے مگر تحکمانہ لہجے میں کہا اور خود لوہے کی ایک ٹیڑھی سی سیخ لے کر چولھوں کو کھدیڑنے لگا۔

منو جھپ سے فرش پر اتر آیا اور راکھ نکالنے لگا۔ اوہ ہی ہی کر کے وہ ایک دم چیخا اور پیچھے کو گرا۔ چولھے کے بھوبل میں ایک جلتا ہوا انگارہ اس نے چھو لیا۔

"ارے بے وقوف"۔ تلسی نے اپنی خفت مٹانے کی کوشش کی کہ پہلے ہی سے منو کو آگاہ کیوں نہ کیا۔ "خیر خیر، تو بہت جلد ان سب باتوں کا عادی ہو جائے گا"۔ اس نے ہمدردی سے کہا۔

منو اپنا ہاتھ سہلاتا، اٹھتی ہوئی ٹیسوں کے درد سے منہ سکوڑتا، پیچھے کو ہٹ گیا۔ اگر کسی کام کو شروع کرتے ہی کسی خود اعتماد شخص کو ناامیدی سے دوچار ہونا پڑے تو اس کی مایوسی کا کیا پوچھنا اور ایک منٹ کے لئے منو اسی قسم کی ہولناک مایوسی میں گم ہو گیا۔

"ارے آ بھی۔ چل"۔ تلسی نے مسکرا کر کہا۔ "ان سب کی تو تجھے عادت پڑ جائے گی۔ ہاں ذرا احتیاط برتنا۔ کوئی ٹین وین کا ٹکڑا لے کر راکھ کرید۔ دیکھ وہ پڑا ہے ایک لوہے کا ٹکڑا"۔

گلیارے کے کواڑ کے پاس کوڑے کے ڈھیر میں سے منو نے ٹین کا ایک زنگ آلودہ مثلث ٹکڑا اٹھا لیا۔ اور پھر راکھ کے ڈھیر پر حملہ آور

ہوا۔ اس نے دھیرے دھیرے ٹین کو راکھ میں پھیرنا شروع کیا اور تلسی جو دھیر نکال رہا تھا اس سے الگ الگ ہی رہا۔ کیونکہ نہ صرف اس کی حالت دودھ کے جلے چھاچھ پھونک پھونک کر پینے والے کی سی ہو رہی تھی، بلکہ بجھے ہوئے کوئلوں کو ٹین سے کریدنے میں اُسے کچھ ایسا ہی احساس ہوتا تھا جیسا گاؤں میں اپنے چچا کے کیلوں جڑے جوتے پہن کر ریتے میں چلتے وقت ہوتا تھا۔ لیکن جب سب کوئلے الگ ہو چکے اور منو نے سلیٹی رنگ کی راکھ میں اپنا ہاتھ ڈالا تو اس نے ایک نرم گرم جذبہ محسوس کیا جیسے ہاتھوں پر سرسراتا ہوا ریشم ہو۔ وہ کام کرتا رہا اور یہ دونوں جذبات اس کے ذہن میں کش مکش کرتے رہے۔

"اچھا تو ابھی تک تم لوگوں نے آگ بھی نہیں جلائی"، گنپت کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی اس کا وجود کھڑکی پر آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ کمر تک ننگا تھا اور ایک چڑچڑی تیوری اس کے بکرے کی سی شکل پر نمایاں تھی۔

"جلدی کرو منو۔ جلدی کرو"، اس کی یہ خاص عادت تھی کہ مالک کا حکم فوراً دوسرے مزدوروں تک پہنچا دیتا تھا اور غالباً اسی ترکیب کی وجہ سے اُسے فیکٹری میں داروغہ کے قسم کی جگہ حاصل ہو گئی تھی۔

منو نے جلدی جلدی ہاتھ بڑھا کر پھرتی سے کام کرنا شروع کر دیا اور آنکھ اٹھا کر گنپت کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ کیونکہ اُسے گنپت سے ویسا ہی ڈر لگتا تھا جیسے اپنے چچا سے، یا شام نگر والے باوجی کی بیوی سے۔ وہ اپنے دل ہی دل میں کہنے لگا کہ "میری بھی یہ کیا کم بختی ہے کہ اتنی آسانی سے یہ نوکری مل گئی تو اب یہ ظالم یہاں موجود ہے۔ خیر اتنا ہی بہت ہے کہ مالک تو دیالو ہیں اور مالکن نے کھانے کے ساتھ الگ سے مکھن بھی دیا تھا"۔

"اب ان بجھے ہوئے کوئلوں کو یہاں ڈال بھٹی میں"، تلسی نے منو

کے خیالات کا بہاؤ روک دیا۔ وہ خود کوٹھری میں سے لکڑیاں نکال نکال کر جما رہا تھا۔

"مہاراج اور بونگا کہاں ہیں"، گنپت نے کھڑکی میں کھڑے کھڑے جمائی لے کر کہا "وہ لوگ ابھی تک نہیں آئے"

"اٹھ رے مہاراج! اُٹھ بے بونگا"، تلسی نے آواز دی۔ گلیارے کے دروازے پر کھٹکا ہوا اور تلسی اُدھر جانے ہی والا تھا کہ گنپت ایک دم کھڑکی سے اندر کودا اور بولا۔

"میں ان کی خبر لیتا ہوں"۔ اور بڑبڑاتا ہوا گلیارے میں سے گذرا "ان لوگوں نے اتنی دیر سے کام شروع کیا اور وہ بے ڈھنگے اب تک اٹھے بھی نہیں۔ معلوم نہیں ہمارے پیچھے فیکٹری میں کیا ہوتا رہا ہوگا۔ ہر شخص سست نظر آتا ہے۔ بھلا ان حرامیوں کو اپنی ذمہ داری کا کبھی احساس ہو سکتا ہے؟ میں اور پرجا تو چلے گئے اور یہ لوگ مزے میں چھٹی منا رہے"

"اٹھو بے سور و کتو"، گنپت نے زمین پر سوئے ہوئے مزدوروں کو ٹھوکر مار کر کہا۔

بونگا آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ مگر مہاراج بے سدھ پڑا رہا۔

"اُٹھ بے ہاتھی کے بچے"، گنپت نے چیخ کر مہاراج کو پورا پلٹا دیا

"ہاں مالک"، مزدور کی آواز آئی۔ اب کہیں اس کی روح نیند سے بیدار ہو کر پھر جسم میں لوٹ رہی تھی۔ مگر پھر بھی وہ بلا تک نہیں۔

گلیارے کی کنڈی پھر ہلی

"اچھا۔ اچھا ۔۔۔ ۔۔۔ ٹھہرو سہی"، گنپت چیخا۔ اور اس نے

جلانے کی ایک لکڑی لے کر زور زور سے مہاراج کو پیٹنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی آنکھیں جو غصہ سے سرخ ہو رہی تھیں نوکر کی آنکھوں سے چار ہوئیں جو تھکن اور نیند کی کمی سے سرخ ہو رہی تھیں۔

"چل بے سؤر" گنپت مارنے سے بالکل تھک گیا تھا۔ "سورج نکل آیا۔ دھوپ پھیل گئی اور اب بھی تجھے سلائی ہی سوجھ رہی ہے"۔

مہاراج کھڑا ہو گیا اور ایک تھکی ہوئی جمائی لی۔ ایسا لگتا تھا اُسے مار سے کچھ زیادہ چوٹ نہیں آئی ہے۔ ہاں وہ جمائیاں برابر لے رہا تھا۔ اگر اسے درد اور تکلیف کا مظاہرہ سمجھا جاتا۔ اس نے اپنی احمقانہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ پہلے اس کی آنکھیں نیند کی کمی سے سرخ ہو رہی تھیں۔ لیکن اب ان میں آنسو جھلک رہے تھے۔

"لکڑی کے لٹھے کو جگانے کے لئے لکڑی کا لٹھ ہی چاہئے" گنپت بولا "اگر روز صبح تڑکے اٹھ کر کام میں نہ لگا تو یاد رکھنا تیری یہ موٹی موٹی ہڈیاں سب توڑ دوں گا"

اتنے میں دروازے پر کنڈی کھڑکھڑانے کی آواز اور بھی تیزی سے آنے لگی۔ کیونکہ اس وقت وہ دروازے کے بالکل پاس تھا، جگائے ہوئے قلی کی آہ اور کراہ الگ سنائی دے رہی تھی۔ گنپت نے جھنجھلا کر لکڑی ایک کونے میں پھینک دی اور دروازہ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ منوسے اس کی آنکھیں چار ہوئیں جو آنکھوں میں آنسو بھرے، نظر بچا کر مہاراج کی طرف ترحم کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"اپنا کام کر بے سؤر" گنپت نے کہا "کسی سے ہمدردی کی تو

یاد رکھنا۔ تجھ پر بھی ایسی ہی پڑے گی۔ تو اپنا کام کر ورنہ یہی لکڑی تیری ہڈیوں پر توڑ دوں گا"

دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز پھر آئی

"ٹھہرو تو سہی۔ ارے ٹھہرو تو کھوسٹ بڑھیو!" گنپت نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا

"یہ تم کر کیا رہے ہو؟ صبح صبح رام نام کے وقت ان لڑکوں کو پیٹ رہے ہو"۔ لچھی نے اندر داخل ہو کر گنپت کی طرف آنکھ مار کر کہا۔ وہ چھوٹے سے قد کی گداز جسم کی عورت تھی۔ اس کے چھوٹے سے گول چہرے پر ایک ناز بھری مسکراہٹ کھیلتی ہوئی اور بلاق کا لال موتی اس کے بھرے بھرے لبوں پر دمکتا ہوا۔

"رام۔ رام سیٹھ جی" لچھی کے پیچھے دو بوڑھی عورتیں اور داخل ہوئیں۔ ان کے بال سفید تھے، کمر جھکی ہوئی، آنکھیں دھندلی اور برسوں کی محنت جھریوں کی صورت میں ان کے چہروں پر نمایاں تھی۔ انھوں نے اپنے لہنگوں کو گھٹنوں تک اٹھا لیا کہ گلبیارے کے پانی سے بھیگ نہ جائیں اور اپنے جھیر جھیر دوپٹوں کو سمیٹ کر چلنے لگیں۔

گنپت لچھی کو دیکھ کر نرم پڑ گیا اور منو کی آنکھ بچا کر تخت کے نیچے سے اپنا حقہ لینے چلا۔

"اے تلسی ہمارے چراغوں میں تھوڑا سا تیل ڈال دے اور ذرا سی روئی دے کہ بتیاں بنالیں"۔ لچھی نے کہا۔ یہ عورتیں اندھیری کوٹھریوں میں تیل کے چراغ کے آگے کام کیا کرتی تھیں۔

"اچھا۔ اچھا۔ تم کام تو شروع کرو" گنپت نے چولھے کی آگ

سے چلم سلگاتے ہوئے کہا۔ تلسی نے ابھی ابھی کوئلوں پر تھوڑا سا مٹی کا تیل ڈال کر ماچس دکھائی تھی۔ شعلے تو نکلنے لگے تھے، مگر کوئلوں نے ابھی آگ نہیں پکڑی تھی۔ گنپت کو چلم بھرنے کے لئے ذرا ٹھہرنا پڑا۔

منو کو اپنے پاس گنپت کی موجودگی بہت کھلنے لگی۔

"جلدی سے ان دونوں چولھوں میں سے راکھ نکال، کنیا کا بچہ"

تلسی کو اپنی چلم بھرنے کی جلدی پڑی تھی۔

"ارے بے مروت! چھوڑ ان لڑکوں کا پیچھا"، لچھمی بولی اور آ کر سیب گن لے گنتے ہیں، ورنہ پھر کہتا پھرے گا کہ میں نے چرا لئے"

گنپت کوٹھری میں گھس گیا۔

تلسی بھی تیل کی شیشی اور بتی بنانے کی روئی لئے اس کے پیچھے پیچھے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ مہاراج گنومئیں پر پہنچ گیا تھا اور سیب دھونے کے لئے ٹنکیوں میں بھرنے کو بالٹی پر بالٹی پانی مشین کی طرح کھینچے جا رہا تھا۔

بونگا، نیند کی سستی دور کرنے کی کوشش میں باقی دونوں چولھوں میں لکڑیاں جما رہا تھا۔ جن میں تلسی اب تک نہیں جما سکا تھا۔

منو غور سے مٹی کا تیل چھڑکے ہوئے کوئلوں میں نکلتے ہوئے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا ذہن بالکل خالی تھا اور ہاتھ بغیر کسی خاص ارادے کے راکھ کو الٹ پلٹ کر رہے تھے۔

کچھ دیر تک خموشی چھائی رہی۔

انگنے میں، کچی مٹی، سڑے ہوئے پھلوں، کچے اچار، کڑوے تیل

تیز مصالحوں، کیوڑہ اور گلاب کے عرق کی ملی جلی بو لئے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اس پرسے گذرتا ہوا کھلے ہوئے دروازے سے نکل گیا یکایک منو کو کرتے کے اندر سردی سی لگی اور راکھ اڑ کر اس کے لمبے لمبے بالوں پر بکھر گئی۔

وہ اپنے دل میں سوچنے لگا کہ یہ جگہ کیسی عجیب ہے، مگر شاید میں بہت جلد اس کا عادی ہو جاؤں گا۔ یہ سب لوگ بھی پہاڑی ہیں اور بابوؤں کی طرح بالکل نہیں ہیں سوائے گنپت کے۔ وہ البتہ شہر کا رہنے والا ہے ہوا کے اس جھونکے نے، چولھے میں سے نکلتی ہوئی دھوئیں کی لہروں کو تمام فیکٹری پر پھیلا دیا اور منو کے خیالات بھی منتشر ہو گئے۔ نتھنوں میں دھواں گھس کر اس کا دم جیسے گھٹنے سا لگا۔ منہ میں دھوئیں کا کڑوا کڑوا مزہ محسوس ہونے لگا اور پھر اُسے ایسا لگا کہ دھواں حلق سے بھی نیچے جا رہا ہے اور کھجلی سی ہو رہی ہے۔ وہ کھانسا اور کاڑھے ملغم کا ایک بڑا خوراک زور سے تھوکا کان تو جیسے سن ہو گئے تھے۔ لیکن دھوئیں کے ان بادلوں میں کہیں سے اس کے کانوں میں زور زور سے چلانے اور گالا پھاڑنے کی آواز آنے لگی۔

"ارے کہاں ہو تم سب کے سب۔ کہاں ہو تم، سؤر کے بچو۔ ارے او پربھو باہر تو نکل مادر ... ... تو۔ اوہ ... کھوں کھوں"

ایک لمبی سی ضیق النفس قسم کی کھانسی کے دھچکوں میں وہ آواز ڈوب گئی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کھانسی میں تبدیل ہو گئی۔ کیونکہ جب چیخنے کی آواز نہیں آتی تھی تو کھانسی ہی سے اس کا تمام غصہ اور تیزی ظاہر ہوتی تھی۔ دھچکے تھے کہ برابر آئے ہی جا رہے تھے جیسے کھوکھلی ہنسی کے قہقہے۔

منو کان لگا کر غور سے سننے لگا۔ اب اُسے ایک اور آواز سنائی

دینے لگی، پہلی سے مختلف، کیونکہ یہ کسی بڑھیا عورت کی آواز لگتی تھی۔

"نمک حرام، نمک حرام کہیں کے، نگھرے، گندے پہاڑی گندے تلچھٹ۔ اُف یہ دھواں۔ یہ دھواں۔ یہ ان کا دھواں بند کواڑوں اور کھڑکیوں سے بھی تو اندر چلا آتا ہے۔ ہائے ہائے یہ مرجائیں۔ ان ہی چولھوں میں ان کا منھ جھلس جائے۔ ہمارے گھر کا ستیاناس کر دیا۔ ابھی پچھلی برسات میں سفیدی کروائی تھی اور کالا بھٹ کوئلہ دیواروں کو۔ ہائے۔ ہائے، ارے کہاں ہو تم سب کے سب"

منو سوچنے لگا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ کہیں یہ اُن شام نگر والی بی بی جی کی آواز تو نہیں۔ اگرچہ یہ آواز اُتنی سخت نہیں تھی اور کسی قدر بھی ہوئی بھی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر تلسی کی طرف دیکھا اور پوچھنے ہی والا تھا کہ یہ کون ہے؟ کہ تلسی نے دھیرے سے کہا۔ "ش ش"۔ تلسی کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور وہ جلدی جلدی آگ دہکانے کے لئے پنکھا کر رہا تھا۔ منو کو تلسی کے چہرے پر خوف اور ہراس کے آثار دکھائی دیئے، اور فوراً ہی تلسی اپنی ساری دردناکی بالائے طاق رکھ کے اوندھا ہو کر چولھے میں جھپا جھپ پھونکیں مار۔ چولھے میں تو آگ کے نام خاک بھی نہیں دہکی۔ البتہ دھوئیں کے [illegible] ٹے موٹے بادل اوپر اٹھ اٹھ کر ٹین کی چھت سے ٹکرانے لگے۔

"کہاں ہو تم لوگ! اے پربھو، اور گنپت۔ کہاں ہو۔ چلو ادھر"

رائے بہادر مسٹر ٹو درمل بی اے ایل ایل بی وکیل، ممبر شہر میونسپل کمیٹی چیخ رہے تھے۔ سیاہ الپاکے کی اچکن، سفید چوڑی دار پائجامہ اور سر پہ بڑا سا

صاف جس کے نیچے سے ان کا سیاہ لمبوترا چہرہ جھانک رہا تھا۔ اپنے گھر کے باہر والے برآمدے میں کچی اینٹوں کے فرش پر زور زور سے چھڑی مار کر چیخے جا رہے تھے۔

"ہاں ہاں کہاں ہیں یہ سب کے سب۔ کہاں ہیں یہ سب، نمکحرام"

لیڈی ٹوڈرمل بھی کھدر کی ایک باریک ساری پہنے، اپنے سوکھے سیاہ جسم کو چھپاتی باہر آگئیں۔

"آتے کیوں نہیں ہو۔ باہر کیوں نہیں نکلتے ہو۔ کتیا کے بچو"، مسٹر ٹوڈرمل کا حسیم مغرور لڑکا رام ناتھ چیخا "رائے بہادر تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا کچھ بندوبست کرو، ورنہ تمھیں یہاں سے نکلنا پڑے گا"

ساری فیکٹری پر خموشی چھا گئی، ایسا لگتا تھا کہ ذرا سے بہانے سے اب طوفان آیا کہ آیا۔ بحران کے اس عالم میں دھوبیوں کے دل کے دل بل کھاتے لپٹتے، کھلتے، نکلتے چلے جا رہے تھے۔

"جاؤ جاؤ"، گنپت نے گلیارے میں آکر کہا "تم اپنے گھر کے رائے بہادر ہوگے۔ تمھیں ہم سے کیا مطلب"

"اچھا، نہیں تو؟ ہمیں تم سے بھلا کیا مطلب؟ گلی میں تو نکل کر آ حرامزادے میں تجھے بتاتا ہوں"

"ارے ان کمینوں کے منھ نہ لگ بیٹا!" لیڈی ٹوڈرمل بولیں "چلو یہاں سے، بھلا ہم شریف کہاں اور یہ پہاڑی پنچ کہاں"

وہ تو اسی جگہ بات ختم کر دیتیں خاص کر اس وجہ سے اور بھی کہ مسٹر ٹوڈرمل اور ان کا بیٹا صبح ہی صبح، شہر کے باغات دیکھنے تانگے میں نکل

جانے والے تھے۔ مگر گنپت دوڑ کر دروازے پر آگیا اور رام ناتھ کو زور سے برامدے میں دھکا دیا۔

"ارے یہ منہ زوری ذرا دیکھو"۔ رائے بہادر نے زور سے اپنی چھڑی فرش پر پٹخی اور چیخنے لگے کیونکہ ان کا لڑکا ان ہی پر آگرا تھا اور وہ گرتے گرتے بچے۔

"ارے یہ گستاخی! اس گنپت کو دیکھو" لیڈی ٹوڈرمل اپنی باریک آواز میں چیخیں۔

لیکن اس عرصہ میں ان کا بیٹا گنپت پر جھپٹ پڑا اور اس کو مکے مارنے شروع کئے۔ کالج میں اس نے مکے بازی سیکھی تھی اور اس وقت وہ انہی قواعد کے مطابق مکے پہ مکہ مارے جا رہا تھا۔

منو، تلسی اور بونگا دوڑ کر دروازے پر پہنچے۔ ڈر کے مارے ان سب کے ہوش خطا ہو رہے تھے۔ گنپت نیچے نالی میں گر پڑا تھا لیکن پھر اٹھ کر بے سود کوشش میں اس کے سخت ہی منہ پر دھڑا دھڑ مکے پڑ رہے تھے۔ ناک سے خون جاری ہو گیا تھا۔

"ارے چھوڑ دو۔ چھوڑ دو اسے"، مسٹر ٹوڈرمل پریشانی سے کانپتے ہوئے، اپنے دروازے کی محفوظ حدود میں کھڑے چلائے جا رہے تھے۔

"بدمعاش کہیں کا۔ بے لگام جانور۔ شرابی۔ نیچ۔ کمین" لیڈی ٹوڈرمل ہاتھ پھیلا پھیلا کر اپنا طوفان جاری کئے تھیں جیسے ہاتھوں سے بددعائیں برسا رہی ہوں۔ آس پاس کے گھروں کی کھڑکیوں میں۔ اور دور تک، تمام عورتیں جمع ہو گئیں اور ڈر ڈر کر ایک دوسرے سے کھسر پھسر کرنے لگیں

یکایک گلیارے میں سے منو، تلسی اور بونگا کے پیچھے سے

پربھو اسٹیٹ سے نکلا اور عین لڑائی کے بیچ میں کود کر فوراً گنپت کی کمر پکڑ کر اُسے اپنے پیچھے لے لیا، خود رام ناتھ کی مار کی زد میں آگیا اور کہنے لگا۔

"بابو جی آپ مجھے ماریئے، آپ کا جو جی چاہے وہ کیجئے، پر اسے چھوڑ دیئے یہ بے وقوف ہے، ناسمجھ ہے"

"چھوڑ دو بیٹا، چھوڑ دو ان کم بختوں کو، خاک ڈالو ان کے منہ پر ہمارا جینا مشکل کر دیا، آسمان پر دماغ چڑھ گیا ہے کمینوں کا"

"تمھیں اس طرح لڑائی مول نہیں لینی چاہئے گنپت" پربھو نے اپنے ساتھی کو نیکٹری کے حدود میں لاکر کہا۔ "گھر والا جانے اور وہ جانیں ہمیں ان باتوں سے کیا مطلب۔ خواہ مخواہ کو تم نے مار کھائی۔ واہ بھئی" گنپت کڑوا منہ بنائے ہوئے واپس ہوا۔ اس نے سب لڑکوں کو دھکا دے کر رستہ صاف کیا، اپنے دشمن سے مات کھانے کے بعد اب اس کا غصہ بے چارے مزدوروں پر اُتر رہا تھا۔

"شانتی، شانتی" پربھو نے اپنے خاص منکسر لہجے میں کہا، "غصہ میں ایسا قابو سے باہر ہونا اچھا نہیں ہے"

منو دو ٹینکیوں کے درمیان کیچڑ میں گر پڑا تھا، تلسی کا گھٹنا چھل گیا تھا۔ اور بونگا تخت کے پاس لڑھک گیا تھا سب چپکے سے اپنی اپنی جگہ سے اٹھے اور کام میں لگ گئے، منو پھر راکھ نکالنے لگا، بونگے نے مٹی سے برتن مانجنے شروع کر دیئے اور تلسی دیگچوں میں پتیاں وغیرہ بھرنے لگا، مہاراج جوانمردوں کی طرح پانی بھرے جا رہا تھا، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، اب بھی پانی کھینچ کھینچ کر بھرے جا رہا تھا۔ اس کی پنڈلیوں کی نیلی نیلی موٹی رگیں اُبھر آئی تھیں اور کسی جانور کی آنتوں کی طرح لگتی تھیں۔

"اے مہاراج! اس دیگچے میں پانی ڈال"

مہاراج نے پھلوں کی ٹنکیوں کے بجائے دیگچے میں پانی بھرنا شروع کیا۔

"چل اے منو، اوپر تیرا کچھ کام ہے"۔ پربھو نے کہا۔ منو نے سر اٹھا کر اپنے مالک کی طرف دیکھا، پربھو نے اپنے منھ کی طرف اشارہ کیا مطلب یہ تھا کہ منو کے کھانے کے لئے کوئی لذیذ چیز اوپر رکھی ہوئی تھی۔

اگر پربھو کا یہ خیال تھا کہ گنیت اور مسٹر ٹوڈرمل کے لڑکے کی لڑائی کوئی ایسی بات تھی جسے وہ اپنے ہمسایوں کے آگے ہاتھ جوڑ کر ختم کر سکتا تھا تو مسٹر ٹوڈرمل اسی پر بس کرنے والے اسامی نہ تھے۔ کیونکہ مسٹر ٹوڈرمل کی پہنچ اونچے ٹھکانوں تک تھی۔

مسٹر ٹوڈرمل بیس سال تک، یا غالباً اس سے بھی زیادہ عرصہ تک دولت پور کی کچہری میں ایک نمایاں حیثیت رکھ چکے تھے، اور انھوں نے بہت سے پریشان حال لوگوں کو اپنی شاندار وکالت کے ذریعہ بچایا تھا۔ چنانچہ گورنمنٹ آف انڈیا نے انھیں دولت پور کی کچہری میں پبلک پراسیکیوٹر کا عہدہ عطا کر کے ان خدمات کا کھلم کھلا اعتراف کر لیا تھا۔ اگرچہ انھیں اس عہدہ سے پنشن لئے مدت گذر چکی تھی مگر اب بھی گورنمنٹ آف انڈیا میں ان کا بہت احترام کیا جاتا تھا، کیونکہ انھوں نے جنگ کے سلسلہ میں بڑی بڑی خدمات انجام دی تھیں۔ کم از کم بیس ہزار روپیہ تو وائسرائے فنڈ ہی میں دیا ہوگا۔

ان کی جنگی خدمات کے سلسلہ میں ان کو کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا تھا، اور شہری خدمات کے عوض انھیں دولت پور میونسپل کمیٹی [illegible]

نمبر بنا دیا گیا تھا۔ یہ اعزاز دولت پور کے لوگوں کو ان کی عزت کرنے اور انھیں بڑا آدمی سمجھنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ اب یہ اور بات تھی کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات ذرا کم آتی تھی کہ نائٹ کمانڈر اور میونسپل کمشنر کا مطلب کیا ہے!

پچھلی مرتبہ جب سیاسی تحریک شروع ہوئی تو رائے بہادر صاحب مع اپنے بال بچوں اور مال دولت کے، دولت پور کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو گئے تھے اور ان کی اس حرکت سے کچھ لوگوں نے انھیں "غدار" بھی کہا تھا لیکن لوگ اُن سے ڈرتے بہت تھے اور یہاں تک کہ جب رائے بہادر صاحب اپنے گھڑ گھڑاتے ہوئے تانگے پر بیٹھ کر نکلتے تھے جس میں گھوڑا جتا رہتا تھا اور ان کا بیٹا اُسے ہانکتا تھا تو جو لوگ دل سے ان کی عزت نہیں بھی کرتے تھے، وہ بھی ہاتھ جوڑ جوڑ کر "رائے صاحب"، "رائے صاحب" کیا کرتے تھے۔ رائے صاحب کو ان کی اس ظاہر داری پر شک تو ضرور ہوتا تھا اور وہ شہر سے باہر اپنے تین بنگلوں میں سے کسی ایک میں رہنے بھی چلے جاتے لیکن مشکل یہ تھی کہ ان تینوں بنگلوں میں انگریز کرایہ دار رہتے تھے اور ان کا معقول کرایہ بھی آتا تھا۔ اس کے علاوہ لیڈی ٹوڈرمل بے چاری جاہل تھیں اور انھیں انگریزی طرزِ رہائش سے واقفیت نہ تھی، لہٰذا سول لائن میں انگریزوں کے درمیان رہنے میں انھیں کوفت ہوتی۔ شہر کے گھر میں رہ کر جو ادھر ادھر گپ شپ کرنے کا اور گلی کی عورتوں سے کبھی کبھی لڑنے کا موقعہ ملتا تھا وہ سول لائن میں کہاں نصیب ہوتا!

ادھر کئی سال سے مسٹر ٹوڈرمل اور لیڈی ٹوڈرمل نے کئی مرتبہ چاہا بھی کہ فیکٹری کے دھوئیں وغیرہ سے بچنے کے لئے ہجرت کر جائیں۔ لیکن پاس پڑوس کے لوگ، مسٹر ٹوڈرمل کی تمام غداری و وفاداری بھلا کر، اُن کے

قدموں پر اپنا سر نیاز جھکا دیتے تھے اور انگریزی سرکار میں جوان کی عزت تھی اس کا بیان کر کر کے، ان سے درخواست کرتے تھے کہ انھیں اپنے سائے سے محروم نہ کریں۔ لہٰذا مسٹر ٹوڈرمل نے طے کر لیا تھا کہ جیسے وہ اتنے دن اپنے بھائی بندوں میں زندہ رہے اُسی طرح اب مرتے دم تک اُن کے ساتھ ہی رہیں گے۔

یہ تو بات سچ ہے کہ انھوں نے اِس فرسودہ گھر میں اپنی رہائش کو زیادہ آرام دہ بنانے کے لئے مکان وارثی دت برادرز سے کہا تھا کہ فیکٹری والوں کو نکال دیا جائے۔ لیکن دت برادرز بھلا ان فضول پڑی ہوئی کوٹھریوں سے جو کرایہ وصول ہو رہا تھا اُس سے کیوں دست بردار ہونے لگے تھے۔ اس کے بعد مسٹر ٹوڈرمل نے خود فیکٹری والوں کو بھی دبانا چاہا، اور اس طرح یہ جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ بات نہ سر ٹوڈرمل کو سوجھی نہ کسی اور کو کہ ایک کمپنی ان کوٹھریوں پر بنوا دی جاتی۔ اب انھوں نے یہ سوچا کہ پبلک ہیلتھ آفیسر ڈاکٹر ایڈورڈ مارجد بینک کو ایک خط لکھ کر شکایت کریں۔ چنانچہ انھوں نے لکھ ہی مارا۔

بخدمت ڈاکٹر ایڈورڈ مارجو رینک اسکوائر۔ ایم اے ڈی پی ایچ ایل آر سی پی۔ ایم آر سی ایس آر ایف۔ آکسن،

از طرف رائے بہادر سر ٹوڈرمل بی اے۔ ایل ایل بی۔ کے سی آئی ای۔ ایڈوکیٹ ہائی کورٹ آف پنجاب۔ ریٹائرڈ پبلک پراسیکیوٹر۔

دولت پور

جناب عالی!

نامہ و پیغام اور خط و کتابت کے ذریعہ ایک انسان دوسرے

انسان تک اپنی دلی عقیدت اور احترام کا پیغام پہونچاتا ہے۔
اور مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اس سلسلہ میں جو کوتاہی
مجھ سے سرزد ہوئی ہے وہ میری نظروں میں ایک ایسی غلطی ہے
جس کی شدت میں کسی عذر سے کمی واقع نہیں ہو سکتی۔ لہذا
آج مجھے اس مکتوب کے ذریعہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے
ہوئے بے حد شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔ بہرحال میں
نہایت خلوص کے ساتھ آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ
جناب کا اسم گرامی میونسپلٹی کے اندر بھی اور باہر بھی، ایک
مربی کی حیثیت سے، میرے ذہن کے پردوں پر ایک لافانی
نقش بن گیا ہے۔

چنانچہ میں جناب سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ کوچہ بلی ماراں
میں تشریف لائیں اور ملاحظہ فرمائیں کہ میرے گھر کے پاس جو
اچار کا کارخانہ ہے۔ اس سے جو دھواں نکلتا ہے وہ تمام
گلی میں بھرتا ہے۔

اگر جناب تکلیف فرمائیں گے تو میں اس کو اپنی عزت افزائی
سمجھوں گا کیونکہ ابھی مورخہ ۲۶ ماہ رواں کو میرے لڑکے نے
جب کارخانے والوں سے چولھوں کے دھوئیں کے متعلق کہا
تو گنپت نامی ایک شخص نے حملہ کر دیا۔ اور اگرچہ میرے بہادر
بیٹے رام ناتھ نے اس کی ناک پکی کر دی، مگر اس کو خود بھی چوٹ
آئی۔ اس کے جسم پر نیل پڑ گئے ہیں۔ بدن اکڑ گیا ہے اور
انگلیاں رہ گئی ہیں۔

میں نے حکومت کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ آپ پر بخوبی روشن ہیں۔ میں نے بیس ہزار روپیہ وائسرائے کے وار فنڈ میں دیا ہے جس کے عوض میں مجھے نائٹ کا اعزاز عطا ہوا۔ مجھے امید ہے کہ حکومت عالیہ کی جو خدمات میں نے سرانجام دی ہیں۔ ان کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ یہاں تشریف لائیں گے اور مجھے اس دھوئیں کی مصیبت سے نجات دلائیں گے۔ کہ یہ دھواں ہمارے میرے اور میرے گھر والوں کے لئے باعث پریشانی اور تکلیف بنا ہوا ہے۔

میری بیوی کی طرف سے سزار جوبینک کی خدمت میں سلام و نیاز۔

آپ کا وفادار خادم اور درخواست کنندہ

ٹوڈرمل

بدقسمتی سے ہیلتھ آفیسر نے اس خط کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا، جب ڈاکٹر مارجوربینک نے نہ تو خط کا جواب لکھا اور نہ ہی گلی کا معائنہ کرنے آئے تو سر ٹوڈرمل کو غصہ آگیا۔ اور وہ میونسپل کمیٹی کی میٹنگ کا بے صبری سے انتظار کرنے لگے جو یکم ستمبر کو منعقد ہونے والی تھی۔ اس دن وہ صبح ہی صبح مع اپنے سائیس کے ایک ٹم ٹم پر سوار ہو کر نکلے۔ یہ ٹم ٹم تانگے کے علاوہ تھی اور صرف خاص اور اہم موقعوں پر نکالی جاتی تھی۔ پہلے تو وہ شہر کے باغات وغیرہ میں گھومتے رہے اور پھر میونسپل کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کرنے کے لئے روانہ ہو گئے جو ٹاؤن ہال میں ہونے والی تھی۔ انھیں یہ خیال پہلے ہی سے تھا کہ کہیں دیر نہ ہو جائے اور اس بوکھلاہٹ میں وہ میٹنگ کے وقت سے

تقریباً ایک گھنٹہ پہلے پہونچ گئے۔

ستمبر کی گرمی اور دل میں بھری ہوئی شکایت کی آگ، دونوں نے مل کر انھیں پسینے پسینے کر دیا۔ اور وہ غصہ میں بھرے ٹاؤن ہال کے برآمدے میں ٹہلنے لگے۔ بیچ بیچ میں دمہ کا ایک آدھ دھچکا بھی اُٹھتا جاتا تھا۔

آخر کار ٹاؤن ہال کے کالنی کے گھنٹے نے دس بجائے اور وہ کمیٹی کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

ابھی کوئی نہیں آیا تھا۔ ٹوڈرمل پہلے ممبر تھے جو آئے۔ آدھے گھنٹے تک وہ اکیلے بیٹھے رہے۔ کسی اور کا پتہ نہ تھا۔ پھر ایک چپراسی آیا اور جھاڑن سے میز کرسیاں صاف کرنے لگا۔

آدھ گھنٹے بعد سکریٹری صاحب، مسٹر ہیم چند بی اے (کینٹب) آئے، نوجوان آدمی تھے، آنکھوں پر نازک سی عینک لگائے۔ آنے کے ساتھ ہی نہایت احترام کے ساتھ مسٹر ٹوڈرمل کے سامنے دوہرے ہو گئے جیسے وہ ہر ممبر کے سامنے دوہرے ہوا کرتے، کیونکہ ان کی نوکری ان ممبروں ہی کی خوشنودی پر منحصر تھی۔

"ساڑھے گیارہ بجے ہیں بابو ہیم چند" مسٹر ٹوڈرمل نے اپنی سونے کی گھڑی جیب سے نکالی جس کی موٹی سی چاندی کی زنجیر ان کے فراک کوٹ کی اندرونی جیب میں اٹکی ہوئی تھی۔

"اور یہاں اب تک کوئی نہیں آیا"

"آپ تو جانتے ہیں یہ لالہ لوگ کیسے ہوتے ہیں" ہیم نے راکھ جھاڑ کر پچھلی میٹنگ کی روداد لکھنے کے لئے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وقت کی پابندی تو

بالکل کر ہی نہیں سکتے یہ میونسپلٹی کیا چلائیں گے "

اور یہ بات تھی بھی سچ۔ سر ٹوڈرمل کو معلوم تھا کہ میونسپل کمیٹی کے بیشتر ممبر جاہل لٹھ بند تھے جنھیں دستخط کرنا بھی نہ آتا تھا۔ اور جب کسی کاغذ پر دستخط کی ضرورت پڑتی تھی تو انگوٹھے کا نشان لگاتے تھے۔ کمیٹی میں جتنی باتوں پر بحث ہوتی تھی۔ وہ اُن کے خاک بھی پلّے نہیں پڑتی تھی۔ بھلا وہ لوگ کیا سمجھتے کہ دت برادرز اور اچار کے کارخانے داروں اور ہیلتھ آفیسر کے خلاف سر ٹوڈرمل کو کیا شکایات تھیں۔ ہیلتھ آفیسر نے ان کی درخواست کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور انھوں نے ایک بڑی زوردار تقریر تیار کی تھی۔ جس میں کمیٹی سے درخواست کی گئی تھی کہ ہیلتھ آفیسر کو برطرف کر دیا جائے۔ لیکن ہندستانی کے لمبے چوڑے الفاظ ان پنجابی لالاؤں کے بھلا کیا سمجھ میں آئیں گے۔ یکایک ہیم چند بولا۔

" سر ٹوڈرمل ایڈورڈ مارجوریبنک نے مجھے آپ کا وہ خط دکھایا تھا جو آپ کے پڑوس والے اچار کے کارخانے کے دھوئیں کے متعلق تھا۔ ویسے تو انھیں گلیوں کا معائنہ کرنے کا وقت خدا کم ہی ملتا ہے۔ مگر کہتے تھے کہ آپ کے ساتھ جا سکتے ہیں۔ لوکل سیلف گورنمنٹ ریگولیشن کی دفعہ تین سو سترہ۔ پیرگراف ....

کے مطابق ... ... "

" مسٹر ہیم چند " سر ٹوڈرمل بولے " میں چاہتا ہوں کہ آج کی میٹنگ کی کارروائی میں آپ ہیلتھ آفیسر کے خلاف شکایت

... ...

" رائے بہادر صاحب " ہیم چند بولے " آپ تو جانتے ہیں کہ

میونسپل کونسل میں کسی بات پر بحث کرنا کس قدر دشوار ہے ،
بیشتر ممبر صرف حکومت کے پٹھو ہیں اور شہری معاملات میں
الف کے نام بے نہیں جانتے ۔ وہ لالہ چرنجی لال اُٹھ کھڑے
ہوں گے اور تین گھنٹہ کی ایک لمبی چوڑی تقریر جھاڑ دیں گے ،
شیخ افتخار الدین گھنٹہ بھر تک زہراُگلتے رہیں گے ۔ اور سردار
گھڑک سنگھ اپنی داڑھی ہلانے لگیں گے اور آپ کی تجویز پر کبھی ووٹ
نہ لیا جائے گا کیونکہ ہر شخص اپنی الگ گاتا رہے گا اور کوئی یہ نہ
چاہے گا کہ کسی انگریز افسر کو برطرف کیا جائے کیونکہ اگر حکومت کا
اپنا کوئی مطلب نہ ہوگا تو وہ فوراً میونسپلٹی وغیرہ کا خاتمہ کر دے
گی ۔ ایڈورڈ مارجوریبنک اس وقت دفتر میں موجود ہیں میں ابھی ان
سے جاکر کہتا ہوں کہ آپ کے ساتھ جاکر اس کارخانے کو دیکھ لیں ۔
آپ ہمیشہ حکومت کے خیر خواہ رہے ہیں ۔ اب اس ضعیفی میں
خواہ مخواہ کسی انگریز کو اپنا دشمن کیوں بناتے ہیں "

"بہت ٹھیک ہے ۔ بہت اچھی بات " سر ٹوڈرمل نے جواب
دیا ۔ دراصل انھیں خود بھی شارع عام پر جھک جھک کرنے کے خیال سے
کوفت ہو رہی تھی اور اب اس طرح سیکریٹری نے ایک باعزت سمجھوتے کی
ترکیب بھی بتادی تھی ۔ انھوں نے اپنے تخیل ہی میں اپنے آپ کو ایک انگریز
کے پہلو میں بیٹھے اپنے پرانے شہر کی گلیوں سے گذرتے دیکھا اور اس تصور سے
نہایت محظوظ ہوئے ۔ ایسی صورت میں جو عزت افزائی ہوتی وہ تو ظاہر ہی ہے
کیونکہ اگرچہ ہندستانیوں کو ہندستان میں انگریزوں کی موجودگی کھٹکتی تو ضرور
ہے مگر پھر بھی بہت سے ہندستانیوں کے دلوں میں اپنے گوری چمڑی والے

آقاؤں کی قدر ہوتی ہے اور وہ اُن کی قربت سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔" اچھی بات ہے"۔ اور سر ٹوڈرمل راضی ہو گئے۔

ہیم چند جاکر ڈاکٹر مارجوربینک کو بلا لائے

ڈاکٹر مارجوربینک آئے، پستہ قد، موٹے سے، کوئی چالیس برس کے آدمی تھے، چکنی چاند، باریک سنہری مونچھوں کے نیچے ایک خوشگوار سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ بریچیس اور جیکٹ پہنے تھے اور پولو کی ٹوپی ہاتھ میں تھی۔

"گڈ مارننگ سر ٹوڈرمل"۔ انھوں نے ہاتھ ملایا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ کے خط کا جواب دینے کے لئے مجھے وقت نہیں ملا۔ بات یہ تھی کہ میں لاہور جم خانہ کی طرف سے ذرا کرکیٹ کھیلنے چلا گیا تھا"۔

"گڈ مارننگ صاحب"۔ ٹوڈرمل نے جواب دیا اور اتنا جھکے کہ ان کے شایانِ شان نہ تھا۔

"میری موٹر میں چلئے"۔ مارجوربینک نے جلدی سے کہا۔ اور انگریزوں کی طرح وہ بھی ٹینس، کرکٹ، پولو وغیرہ کھیل کر اور شراب پی کر جوان رہنے کی کوشش کرتے رہتے تھے اور اس طرح اپنی تندرستی اور بیوی کی خوشنودی کو برقرار رکھتے تھے اور اسی وجہ سے ان کی بات بات سے پھرتی ٹپکتی تھی۔ "میری بیوی ابھی "گھر" سے بالکل نئی فورڈ لائی ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ دیکھ کر ضرور خوش ہوں گے"۔

پھر وہ تیزی سے موٹر کی جانب بڑھے۔ دراصل اس تیزی میں ایک راز اور بھی تھا اور وہ یہ کہ وہ سر ٹوڈرمل کی کھلی ٹم ٹم میں جانے سے بچنا چاہتے تھے، کیونکہ پھر وہ "کالے لوگ"، چاروں طرف سے انھیں گھور گھور کر دیکھتے

اور سلام کرتے۔

سر ٹوڈرمل کا وہ خواب کہ کھلی ٹم ٹم میں صاحب کے ساتھ نکلیں اور سب لوگ دیکھیں، خاک میں مل گیا۔ چنانچہ جتنی شرافت سے ممکن تھا، انھوں نے "بہت اچھا صاحب" کہا۔ اور ذرا گھبرائے ہوئے آخر موٹر میں بیٹھ ہی گئے۔ ڈاکٹر مارجورینک بھی آکر ان کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

"رائے صاحب کی کوٹھی چلوں حضور" سکھ شوفر سوچا سنگھ نے پوچھا۔

"ہاں" مارجورینک نے جواب دیا

اگرچہ سر ٹوڈرمل کو اس بات کا افسوس ضرور تھا کہ موٹر کی چھت انھیں دنیا کی نظروں سے چھپائے ہوئے ہے۔ مگر جب کار تیزی سے دوڑنے لگی تو انھیں اسپرنگ کے گدوں پر جھکولے کھانے میں بڑا ہی مزا آیا۔

ڈاکٹر مارجورینک کو یہ معلوم نہ تھا کہ گھنٹہ گھر کے بعد پھر گلیاں بہت پتلی ہو جاتی ہیں۔ اور کوچہ بلی ماروں میں موٹر نہ جا سکے گی۔

سر ٹوڈرمل ہیلتھ آفیسر کے ساتھ بازار مائی سیواں سے ہوتے ہوئے چلے۔ راستہ میں وہ تمام دوکانداروں کی طرف گردن ہلاتے جاتے تھے اس سے بحث نہیں تھی کہ آیا دوکان دار انھیں اس انگریز کی معیت میں دیکھ بھی رہے ہیں یا اپنے کام میں مصروف ہیں۔

ڈاکٹر مارجورینک کو اس سے پہلے کبھی ایسے ڈھیر کے ڈھیر گندے بچوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا جو نہایت ڈھٹائی سے ایک ایک پیسہ کی بھیک مانگ رہے تھے۔ کوچہ بلی ماروں پہنچتے پہنچتے مارجورینک کی غصہ کے مارے بری حالت ہو گئی۔ چاروں طرف سے عورتیں اور مرد اپنی اپنی دوکانوں میں کھڑے

ہو ہو کر آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ غصہ کے مارے صاحب نے اپنا سر جھکا لیا۔ جگہ جگہ گوبر، گھاس پھوس، تنکوں، ٹوٹے پھوٹے برتنوں، باسی کوسی کھانا اور دوسرے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پڑے تھے۔ سر ٹوڈرمل سے ہی کون سا سہارا مل رہا تھا۔ وہ تو اور بھی مشکلیں پیدا کر رہے تھے۔

"صاحب یہ دیکھئے میونسپلٹی کے مہتر اپنا کام بالکل ٹھیک سے نہیں کرتے"

اسی وقت کسی گھر والی نے گلی میں ایک مٹھی کوڑا پھینکا جو صاحب کے بالکل سر پر پڑتے پڑتے بچا۔

ڈاکٹر مارجورینک نے زور سے اپنا منہ بھینچا اور مٹھی کس لی ایک دو منزلہ مکان کے اوپری حصے سے، جس میں پت نالہ نہیں تھا۔ بیچوں بیچ گلی میں، کسی دیندار ہندو کے نہانے کا پانی چھل چھل گر رہا تھا۔ ڈاکٹر مارجورینک تو بالکل ہاتھ ملنے لگے۔ "اُف یہ ہندستان"

"وہ میرا گھر ہے جناب اور وہ اُسی کے پاس کارخانہ ہے" سر ٹوڈرمل نے مطلع کیا۔

"آئی سی" مارجورینک نے جواب دیا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس گندی مرطوب گلی میں کب تک کھڑے رہیں۔ فرض انھیں آگے بڑھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ انھیں اپنے پیچھے عجیب کانا پھوسی، کھسر پھسر سنائی دے رہی تھی۔ پیچھے تو جا نہیں سکتے تھے لہٰذا ہچکچاتے ہوئے وہ آگے بڑھے۔

"اے پربھا چل اب نکل باہر اب" لیڈی ٹوڈرمل ساری کا پلو منہ پر لئے پکارتی ہوئی اپنے دروازے پر آ گئیں۔ ڈاکٹر مارجورینک کارخانے کے صحن میں داخل ہوئے۔

"گٹ نون"، منو نے استقبال کیا۔ وہ صرف دھوتی باندھے باقی جسم سے ننگا، تخت پر بیٹھا تھا۔ صبح، دوپہر، سہ پہر، شام اور رات کا انگریزی سلام اس نے شام نگر والے، چھوٹے بابو سے سیکھا تھا اور اس وقت اسے اپنے علم کو کام میں لانے کی سوجھی۔

"گڈ مارننگ"۔ مارجورینک ایک دم سے گھبرا کر بولے۔ انھوں نے صحن کا اچھی طرح معائنہ کیا، کیچڑ بھرا گلیارا، پھلوں سے لدے ہوئے کٹہل اور چولھوں پر رکھی ہوئی بڑی بڑی دیگچیاں۔ گرمی غضب کی تھی اور وہ پسینہ میں شرابور ہو رہے تھے۔ انھوں نے جیب میں سے رومال نکالا اور اپنے گنجے سر پر سے پسینہ کی بوندیں پونچھنے لگے۔ البتہ انھوں نے اس کی احتیاط رکھی کہ پسینہ پونچھتے وقت آنکھیں نہ ڈھک جائیں کیونکہ پیچھے سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ اور ان کو یہ ڈر ہو رہا تھا کہ کہیں کسی کونے کھدرے سے کوئی سیاہ فام ہاتھ میں خنجر لئے ان پر جھپٹ کر انھیں قتل نہ کر ڈالے۔

اس سراسیمگی سے بچنے کے لئے جو وہ ذرا مڑے تو پربھاکر ان کے سامنے کھڑا سلام کر رہا تھا۔

"آپ یہاں مالک"، انھوں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندستانی میں کہا۔

"جی جناب"، پربھاکر کے مارے کانپ رہا تھا اور پیلاہلدی پڑ گیا تھا

"اچھی بات ہے رائے بہادر"، صاحب نے سر ٹوڈرل سے مخاطب ہو کر کہا "میں دیکھوں گا کہ اس معاملہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں اتنے لوگ میرا راستہ روکے نہ کھڑے رہیں۔ کیا آپ

انھیں ہٹا نہیں سکتے "

"جاؤ" سر ٹوڈر مل نے چلا کر کہا اور چاروں طرف جو لوگ، عورتیں بچے وغیرہ گلی کے نکڑ پر جمع ہو گئے تھے ان کو اپنی بڑی سی چھڑی دکھائی۔ اب جا کر انھیں صاحب کی پریشانی کا اندازہ ہوا۔ "میں آپ کو پہنچانے چلتا ہوں صاحب"

"گڈ آفٹرنون صاحب" منو نے فیکٹری کے کیوڑ کے پیچھے سے جھانک کر شرارت کے لہجے میں کہا۔ مارجوریبنک اس اجنبی آواز پر چونک پڑا۔ ان کی ابروؤں پہ بل آیا لیکن جب انھوں نے ایک پھٹے حال کتھئی رنگ کے لونڈے کو انگلش بولتے دیکھا تو ان کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

پربھا غریب کے اوسان ٹور کے مارے خطا ہو گئے تھے اُسے یقین تھا کہ صاحب ضرور جیل خانے بھجوا کر ہی رہیں گے۔ دوڑ کر وہ فیکٹری کے اندر پہنچا اور دو اچاریاں بھر کر مربہ اور اچار نکالا۔ پھر اس نے اچاریاں منو کو پکڑائیں اور اُسے ساتھ لئے لیڈی ٹوڈر مل کی خدمت میں حاضر ہوا جو ابھی تک اپنے گھر کے ہال میں کھڑی چلائے جا رہی تھیں "

"اب ٹھہر جا! ذرا دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ تمھیں ایسا ناچ نچاؤں گی کہ یاد ہی کرو گے! آسمان پر دماغ چڑھ گیا ہے"

پربھا ہاتھ جوڑے ہوئے لیڈی ٹوڈر مل کے پاؤں پر گر پڑا۔

"ماتا جی معاف کیجئے۔ ہمارا قصور معاف کیجئے۔ یہ نذر قبول کیجئے یہ حقیر نذر قبول کر کے ہماری عزت افزائی کیجئے اور ہمیں معاف کیجئے"

"یہ بدمعاش یہاں کیا کرنے آیا ہے؟ اب یہ کیا چاہتا ہے میں

اسے نکلوا کر رہوں گا۔" سر ٹوڈرمل واپس آکر بولے۔ اب انھیں اپنی بڈھی ہڈیوں میں ایک نئی طاقت عود کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ کیونکہ دنیا نے دیکھ لیا تھا کہ ایک انگریز سے ان کی دوستی تھی۔

"اب معاف کر دو۔ چلو خیر ہم معاف کر دیں گے" لیڈی ٹوڈرمل نے کہا۔

"خواہ مخواہ ہم کیوں انھیں جیل بھجوانے کا گناہ اپنے سر پر لیں ویسے ہی پاپ کی گٹھری بھاری ہے"

"اچاریاں رائے صاحب کی خدمت میں پیش کرنو" پربھا نے کہا۔

امیر ہونے کے باوجود بھی رائے صاحب لالچ میں آ ہی گئے پربھا کے لئے تو یہ بہت ہی خطرناک معاملہ تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ رائے صاحب اُسے ضرور جیل بھجوا کر رہیں گے۔

لیکن منو کے لئے اس واقعہ کی اہمیت ایک مذاق سے زیادہ نہ تھی اور وہ بیٹھا ہوا، مہاراج، تلسی اور بونگے سے ڈینگ مار رہا تھا کہ میں پہلے بھی ایک انگریز سے مل چکا ہوں اور مجھے اُن کی بولی بھی آتی ہے۔

انسان کی طبیعت اپنے ماحول کی وجہ سے لاشعوری طور پر بدلتی رہتی ہے۔ منو بھی اس وقت یانوسی کارخانے کی اس عجیب تاریک ہولناک زندگی کا جلد عادی ہو گیا۔

روزانہ وہ آدھی رات گذرنے کے بعد سوتا اور صبح تڑکے ہنوز نیند پوری بھی نہ ہو چکتی کہ اٹھ بیٹھتا۔ اُٹھنے کے ساتھ ہی وہ کام کاج کے لئے کارخانے میں انسانا، تھکا ہوا، پپوٹے نیند سے بوجھل، بدن تمتمایا ہوا

اور سست جیسے کسی نے اس کی ساری طاقت نچوڑ لی ہو اور اصلی منو کا صرف ایک دھندلا سا خاکہ رہ گیا ہو۔

لیکن وہ کام میں کافی ہوشیار ہو چلا تھا۔ اس کا سب سے پہلا کام تو یہ تھا کہ بجھے ہوئے کوئلے اور راکھ الگ الگ کرے، اور پھر وہ تلسی کو آگ جلانے میں مدد دیتا تھا، اور پھر وہ دونوں کچھ دیر تک ڈر کے مارے سہمے رہتے کہ کہیں امیر ہمسایوں کی طرف سے پھر طوفان نہ پھٹ پڑے۔ کیونکہ باوجود پربھا نے انھیں اچار مربے اور عرق وغیرہ دے کر راضی کر لیا تھا۔ لیکن کون جانے کس وقت وہ ان تحفوں کو بھول جائیں۔

پھر گنپت آجاتا اور ان کو ڈانٹنا، ڈپٹنا اور دھونا شروع کرتا۔ ہمسائے کے لڑکے سے لڑائی کے بعد اب وہ کسی قدر نرم پڑ گیا تھا۔ یہاں تک کہ پربھا کے ساتھ صبح کے وقت مندر بھی چلا جایا کرتا تھا۔ مندر کے متبرک حوض اور دیوی دیوتاؤں کے استھان کا طواف کرنے میں کافی عرصہ لگتا تھا، اور دن کافی چڑھ آتا تھا۔ دن کا کھانا کھانے کے بعد وہ مزید آرڈر لینے کے واسطے بازار چلا جاتا اور پھر شام کو اپنی جاپانی بائسکل پر بیٹھ کر ادھر اُدھر گھومتا اس طرح اس کا منحوس سایہ زیادہ تر وقت غائب ہی رہتا۔ پھر بھی یہ ڈر ضرور لگا رہتا کہ نہ جانے کب وہ ٹپک پڑے، اور اگر وہ کسی لڑکے کو اونگھتا دیکھ لیتا تو بس اس کی شامت آجاتی! منو اکثر سوچتا کہ اس شخص کو ہو کیا گیا ہے، ہمیشہ ایسا جل کٹڑا کیوں بنا رہتا ہے؟ جب دیکھو ماتھے پر تیوری، زبان پر گالی، مارنے کے لئے مکا تنا ہوا تیار! منو کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ گنپت امیر آدمی کا بیٹا تھا وہ بڑے ناز و نعم اور چاؤ چوچلوں سے پلا تھا۔ لیکن اُسے اپنی قسمت کا رونا تھا کیونکہ اس کے باپ نے اپنی ساری دولت سٹہ میں ہار دی تھی۔ اب گنپت

پیسہ پیسہ کو محتاج اور اپنی روزی آپ کمانے پر مجبور تھا۔ اگرچہ پربھا نے گنپت کو اپنا ساتھی بنالیا تھا اور وہ پربھا کے بدولت کافی آرام سے بھی رہتا تھا، مگر پھر بھی اُسے نہ تو کام کرنے کا ڈھنگ ہی آتا تھا اور نہ اس سے محنت ہی ہوتی تھی اور وہ دل میں خوب جانتا تھا کہ مفت خوری کر رہا ہے۔

اسے بڑا آدمی بننے اور دولت جمع کرنے کی بہت خواہش تھی، لیکن ناکامیابی کے ڈر کے مارے اس نے ایک عجیب بے حیائی اور ڈھٹائی اختیار کر لی تھی اور یہی صفات اس کو اپنا مقصد حاصل کرنے سے باز رکھتی تھیں۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں جو ایک نفرت سی جھلکتی تھی اُسے دیکھ کر لوگ اپنا منہ پھیر لیا کرتے تھے۔ اور جب وہ اپنے لب بھینچ کر ڈھٹائی سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا تو ایسا لگتا جیسے کوئی مکروہ شخص ابھی کسی کو قتل کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔

یہاں منو، بابو جی کے گھر کے برابر بھی نہ ہنستا بولتا تھا۔ گنپت کا خوف ہر وقت اس کے دل پر چھایا رہتا۔ کبھی کبھی صبح کے وقت اس کو اس بلا کا احساسِ تنہائی ہوتا کہ اس کا دل ڈوبنے لگتا، خود اعتمادی ختم ہو جاتی اور چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا۔ اور وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر بوکھلا یا پھرتا اُسے ایسا لگتا کہ صبح کے وقت وہ کسی سے آنکھیں نہیں ملا سکتا۔ خاص کر اپنے مالک اور مالکن سے۔ اور وہ بھی اس ڈر سے کہ اگر انھوں نے ذرا بھی محبت سے کوئی بات کہی یا محبت کی نظر سے دیکھا بھی تو وہ پھوٹ پڑے گا، مایوسی کے ان تاریک دوروں کے درمیان اس کے لئے تسکین کا صرف ایک ہی سامان تھا اور وہ اس کے اور دوسرے قلیوں کے درمیان خاموش ہمدردانہ دوستی تھی۔

جب گنپت چلا جاتا تو وہ سب کے سب راکھ جھاڑتے وقت، کنوؤں سے پانی کھینچتے وقت، تاریک کوٹھریوں میں پھل چھیلتے وقت، اور دیگچوں میں عرق کو اُبال کھاتا دیکھتے ہوئے، کوئی پہاڑی نغمہ اٹھا لیتے اور گانے لگتے۔ درد بھرا گیت کس بول کے سیدھے سادے لفظوں سے نکلتا اور پھر تیزی کے ساتھ ایک دل سوز لے میں ابھر کر ایک درد بھری گونج میں بھٹکنے لگتا۔ رفتہ رفتہ لے کا کھنچاؤ مدھم پڑ جاتا اور الفاظ اپنے درد بھرے نغمے میں لپٹے ہوئے دھیرے دھیرے ایک دل دوز خاتمے میں گم ہو جاتے۔ ان درد بھرے نغموں کے علاوہ، وہ لوگ موسم کے مطابق، کبھی کبھی لوک گیت بھی گاتے۔ زندگی سے بھرپور اور توانائی سے لبریز اور اس طرح اپنی اس اداس زندگی میں کسی قدر رنگینی بھر لیتے۔ اس وقت منو میں اپنے بچپن کی جولانی اور جودت ابھر آتی۔ اس کی حرکات میں تیزی آجاتی۔ وہ ہر ایک سے چہل کرتا، کوٹھری میں بیٹھی ہوئی عورتوں کے پھل چرا چھپا کر انھیں چھیڑتا، اور خاص کر مہاراج اور بونگا کو اپنی ظرافت کا تختۂ مشق بناتا۔

کبھی کبھی وہ مچان کے پاس تخت پر، ایک لکڑی کی کنگھی اور سستا سا آئینہ لے کر بیٹھ جاتا، اور آڑی مانگ نکال کر اپنے بال سنوارنے لگتا، جیسے اس نے شام نگر میں چھوٹے بابو کو کرتے دیکھا تھا۔ لیکن اس کے بال تھے کہ کسی طرح تہذیب و تمدن کے اس قاعدے کو مانتے ہی نہ تھے۔ عاجز آکر وہ تلسی کا پیر سوپ لے کر اس سے اپنے بال دھوتا اور تلسی کا ہی خوشبودار تیل چرا کر اپنے بالوں میں خوب چپڑتا۔ پھر اس کے بال نرم اور سیاہ ہو کر چمکنے لگتے اور آسانی سے مانگ نکل آتی۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ گنپت کے آتے کے ساتھ ہی فوراً مانگ بگاڑ دینی ہوتی تھی۔ کیونکہ ایک دن اس نے منو کو مانگ

نکالتے دیکھا تھا تو کافی مرمت کی تھی کہ میری برابری کرتا ہے۔

منو کا دل چاہا کرتا تھا کہ مالک کے قلمدان کے پاس پنسل وغیرہ بنانے کے لئے جو بلیڈ رکھا رہتا تھا اُسے کبھی اپنے گالوں اور ٹھوڑی پر پھیر کر دیکھے۔ لیکن ابھی تک اس کے گال اور ٹھوڑی پر بال تھے ہی کہاں؟ اس کا دل چاہتا کہ کاش وہ بہت جلدی بڑا ہو جائے اور اس کے ڈاڑھی نکل آئے کیونکہ وہ جلد از جلد مرد بن کر سب پر اپنی شانِ مردانگی ظاہر کرنا چاہتا تھا جیسے شام نگر کے چھوٹے بابو تھے۔ لیکن اسے یہ دیکھ دیکھ کر بہت مایوسی ہوتی تھی کہ جب سے وہ گاؤں سے آیا، اس کی لمبائی اور چوڑائی میں ذرا بھی اضافہ نہیں ہوا۔ بہرحال اُسے یہ اطمینان تو تھا کہ کافی ورزش کر رہا ہے۔ فیکٹری سے پیتل کے عرق سے بھرے ہوئے برتن، مختلف دوکانوں تک لے جانا کافی خوش گوار ورزش تھی اور اس وجہ سے اور بھی کہ اس سلسلہ میں فیکٹری کے تاریک ماحول سے نجات مل جاتی تھی۔ اور بازاروں میں عمدہ ملبوسات پہنے ہوئے لوگ اور عجیب و غریب دکانیں دیکھنے میں آتی تھیں لیکن کم بختی یہ تھی کہ گنپت وقت کا بہت خیال رکھتا تھا اور اگر واپس آنے میں دیر لگی یا اس نے قلیوں کو دھیرے دھیرے آتے یا بازار میں کہیں سیر کرتے دیکھ لیا تو بس آگئی شامت! کیونکہ اس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ ایک ہفتہ تک باہر جانا موقوف، بس فیکٹری میں گھٹنے کام کیا کرو۔ اور مہاراج کو باہر کے کاموں کے لئے بھیجا جاتا۔ بھلا لکڑی کے کندے کو کیا؟ - چاہے باہر بھیجو چاہے اندر۔

اس طرح اس تاریک تہہ خانے میں روزانہ کام جاری رہتا، دہکتے چولھوں کی تپش، اُبلتے ہوئے عرق کی بھاری بوتلیں، اچار کے

مصالحے، مربے کا شیرہ، مٹی، راکھ ——— یہ سب مل جل کر چھائے رہتے۔ راستوں میں مٹی اور راکھ کی ایک چکنی سی تہہ جم جاتی۔ اس پر سے کنڈالوں کا پانی گرتا جن میں پھل بھیگتے رہتے تھے۔ اور مزدوروں کے ننگے ننگے تلوؤں پر اس کی ایک موٹی سی تہہ جم جاتی۔ وہ لوگ ادھر ادھر صرف ایک لنگوٹی باندھے ننگے بدن دوڑا کرتے، گرم پانی جو لامتناہی طور پر ہر وقت ابلتا رہتا تھا، ایک دیگچے سے دوسرے میں الٹتے، پھر خالی دیگچوں میں پانی بھرتے، چیتھڑوں اور چکنی مٹی سے عرق کھینچنے کی نلکیوں کو اپنی اپنی جگہ لگاتے رہتے۔ بوتلوں کو ٹھنڈا کر کے رکھتے، پھر پھلوں کو دھوتے۔ جب سے دیگچیاں مجھ چکتیں وہ عورتوں کو پھل چھیلنے میں مدد دیتے رہتے۔ کنوؤں سے پانی کھینچ کر لاتے، یا اپنے مالکوں کو اچار اور مربے بنانے میں مدد دیتے رہتے۔ صبح تڑکے سے لے کر آدھی رات تک وہ گھنٹوں کے گھنٹوں کام کرتے رہتے۔ ان کے جسم جیسے مشین ہو گئے تھے کہ انھیں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں کی حرکت بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ صرف پسینہ کی دھار جو ان کی پیٹھ پر سے پھسلتی ہوئی ٹپکتی تھی، انھیں جھنجھوڑ کر خبردار کرتی تھی کہ وہ کسی محنت شاقہ میں مصروف ہیں یا جب وہ باری باری سے گھر جاتے، مالکن کے ہاتھ کا پکایا ہوا دال چاول کھاتے تو انھیں بہت تھکن محسوس ہوتی، نیند سے آنکھیں بند ہونے لگتیں اور کام پر واپس جانے کو دل نہ چاہتا۔

جب گرمیاں گذر گئیں اور جاڑا آیا تو منو کا دل فیکٹری میں لگنے لگا۔

وہ تاریک کوٹھریاں جن سے وہ اپنے آنے سے چند ماہ تک اجنبیت سی محسوس کرتا تھا۔ اب اتنی بھیانک نہ لگتی تھیں۔ الماریوں میں

جوا چار اور مربوں کے ڈبے چنے رہتے تھے اُن سے بھی اس کی نگاہیں مانوس ہو چلی تھیں۔ وہ اُن دونوں چولھوں کا بھی عادی ہو گیا تھا جو پہلے اُسے منہ پھاڑے پوپلے دیوؤں کی طرح کبھی آتشیں پھنکاریں مارتے اور کبھی ٹھنڈی آہیں بھرتے معلوم ہوتے تھے۔ اور پھر جاڑوں میں سانپوں کا بھی تو ڈر نہ رہا تھا حالانکہ گرمیوں میں اس نے خود ہی اپنی آنکھ سے ایک بہت بڑا مونچھوں والا سانپ چولھے کے پاس والی کوٹھڑی میں لکڑیوں کے ڈھیر پر بیٹھا دیکھا تھا ایک دن مہاراج نے دو سانپوں کی لاشیں نیچے سے نکالی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا لڑتے لڑتے مر گئے ہیں۔ اور پربھا کو ایک دو مونہی مربے کے ایک ٹین میں مری ہوئی ملی تھی۔

جاڑوں کے آنے سے اب فیکٹری کے صحن میں اتنی گرمی اور گھٹن بھی نہیں رہتی تھی۔ اور انسان دہکتے ہوئے چولھوں کے سامنے بیٹھ کر اپنے جسم پر آگ کی سرخ گرمی کو اثر انداز ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ آج صبح ہی منو کس اشتیاق سے کوئلوں پر سے لپکتے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ آگ سے تو جیسے اُسے عشق تھا کیونکہ اس کی وجہ سے منو کے زرد جسم اور چاروں طرف دیواروں پر جمی ہوئی مٹیالی اینٹوں کا رنگ بالکل سرخ ہو گیا تھا۔

ویسے تو فیکٹری میں ٹین کی چھتیں ایسی تاریکی پھیلائے رکھتی تھیں جیسے پوری کائنات پر رات ایک سیسہ کی چادر کی مانند چھائی ہو لیکن اس تاریکی میں منو کو جس نرمی اور گرمجوشی کی ضرورت ہوتی تھی، وہ اسے آگ کے ان شعلوں سے ملتی جو اس پاس کی دیواروں پر بھوتوں کی طرح ناچتے رہتے تھے۔

جب بہار آئی تو پھر تو منو کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا کیونکہ بہار

کے زمانے میں صبح ہی صبح آموں کے ٹوکرے آیا کرتے تھے، بڑے بڑے، سبز سبز کچے آم! جیسے وہ اپنے گاؤں کے باغوں میں سے چُنا یا کرتا تھا، صبح تڑکے، بورے کے بورے ان آموں سے بھر بھر کر لائے جاتے تھے۔ انھیں قلی لایا کرتے تھے جو عمر میں منو سے بھی بڑے ہوا کرتے تھے۔ ان بوروں کو بڑے بڑے کنڈالوں میں خالی کر دیا جاتا تھا۔ اور کبھی اور وہ بڑھیاں انھیں اچار اور مربے بنانے کے واسطے چھیلنے کو جٹ جاتی تھیں۔

ان پھلوں کو دیکھ کر منو کا دل دھک دھک کرنے لگتا تھا، اور وہ بے صبری کے ساتھ منتظر رہتا۔ اور وہی کیا سب ہی رہتے تھے، کہ کب گنپت باہر جائے اور کب پھل کھائے جائیں۔

لیکن آموں کے لئے منو کا یہ اشتیاق آخر رنگ لا کر ہی رہا۔ آم تو اگر پکا ہو تب بھی حد سے زیادہ کھانا نقصان کرتا ہے۔ ایک آدمی کے لئے ایک بڑا آم کافی ہے، چھوٹے ہوئے تو پانچ چھ چوس لئے، اس کے بعد اس کی گرمی دور کرنے کو لسی یا ٹھنڈائی کا ایک گلاس بھی چاہئے۔ اور کچا آم تو چھوٹا سا بھی نقصان کرتا ہے۔

منو چپکے سے جاتا، کچے آموں میں سے جو سب سے پکا پھل اسے دکھائی دیتا چھانٹ لیتا، اپنے بائیں ہاتھ میں وہ آم لیتا۔ چوستا جاتا اور دہنے ہاتھ سے مزے مزے میں کام کرتا جاتا۔ ظاہر ہے کہ آم پکے تو ہوتے نہیں تھے اچار مربہ تو کچے ہی آموں کا پڑتا ہے۔ آم کے کھٹے تیز رس سے منو کے دانت کھٹے ہو گئے لیکن چھپنے کا شوق! اس نے اتنے کچے آم کھائے، اتنے کھائے کہ آخر آنکھیں دکھنے آ گئیں۔

گنپت کے سامنے منو کی دکھتی ہوئی آنکھوں سے بڑھ کر اور کیا

ثبوت ہو سکتا تھا کہ وہ آرام چرا کر کھا تا رہا ہے۔

ایک دن صبح کو اس نے دیکھا کہ منو زور زور سے آنکھیں مل رہا ہے پاس جا کر اس نے زبردستی اس کا ہاتھ جو الگ کیا تو آنکھیں خون کبوتر بنی ہوئی تھیں۔ کس کس کر چار چانٹے لگائے۔

منو کے دہاڑنے پر پربھا نیچے اتر کر آیا۔

"ارے بے وقوف پہلے آم کو دو چار دن پیال میں دبا دیتا جب پک جاتے تو کھاتا۔ ایسے ہی کیوں کھایا؟" اس نے منو کو اپنی آغوش میں لے کر گنپت کے مزید وحشیوں سے بچاتے ہوئے کہا۔

منو ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔

"تم ہی اسے بگاڑتے ہو۔ تمہیں نے اسے چور بنایا ہے" گنپت چیخے جا رہا تھا۔

"چل میں تجھے ڈاکٹر کے یہاں سے دوائی دلا دیتا ہوں، آنکھ میں ٹپکا لینا" پربھا منو کو اپنے ساتھ لے چلا۔

"تم ہی اسے بگاڑتے ہو پربھا تمہیں تجارت کرنا خاک نہیں آتا" گنپت نوں نوں کرتا رہا "یہ سؤر کچھ کام وام کرتے نہیں سارے دن یہاں پسرے ہوئے پھل کھاتے رہتے ہیں۔ بھلا جب تک انہیں لکڑی سے ٹھیلا نہ جائے یہ کام کرنے والے ہیں! چلو اب پانچ چھ دن کے واسطے ایک مزدور اور کم ہو گیا۔ اور سال بھر میں سب سے زیادہ کام کا وقت ہے، ہم ایک منٹ نہیں کھو سکتے۔ اور مجھے ابھی روپیہ لینے سفر پر جانا ہے" منو اور پربھا گلی میں نکل آئے تھے۔

گیسٹ جب دولت پور سے باہر چلا گیا۔ تو چاروں طرف امن و امان ہو گیا۔ لوگوں کو چین اور اطمینان نصیب ہوا۔

چند دن تک منو آشوب چشم اور بخار میں پڑا رہا۔ لیکن شام نگر میں جو وہ ورما سے لڑنے کے بعد بیمار پڑا تھا اس بیماری میں اور اس میں بہت فرق تھا۔ یہاں اپنی مالکن کی شفقت بھری دیکھ بھال سے اُسے بہت تسکین ہوتی تھی۔ وہ اس کے سرھانے بیٹھ کر اس کا سر دبایا کرتی، بخار سے تپتا اور اکڑتا ہوا بدن دباتی، اور جب اس کے جسم کی تھکن پسینہ بن کر دھیرے دھیرے نکلتی تو ان طویل لمحوں میں وہ اس کی ماں کی سی باتیں کر کر کے اس کو تسکین دیا کرتی تھی۔ "میں تجھ پر سے صدقے جاؤں، تجھ پر قربان ہو جاؤں، تیری آئی مجھے آئے، تیرا دکھ مجھے لگ جائے"، وغیرہ وغیرہ۔

ان الفاظ کی نرمی اور گرمی منو کی روح کی گہرائیوں میں پہنچ کر اُسے ایسی ہی تسکین دیتی جیسے خوشگوار غیر مرئی طور پر جسم میں داخل ہو کر فرحت بخشتی ہے۔ ان الفاظ کی حرارت ایسی تھی جیسے فضا میں نرم موسیقی کی سُر تیں تیر رہی ہیں، جنھیں ایک مست گویئے نے سننے والوں تک پہونچایا ہو۔ ان الفاظ کا جادو اس عورت کو سینکڑوں سال پرانی ماتا سے ورثے میں ملا تھا۔

منو ان الفاظ کو کبھی نہیں بھلا سکا، زندگی بھر وہ ان کی یاد کو اپنے سینے سے لگائے رہا، بچپن کی اُن حسین اور خوشگوار یادوں کے ساتھ جنھیں اس نے کبھی فراموش نہ کیا تھا، یہ یادیں اس کی حسین ترین، سب سے زیادہ خوشگوار اور ساتھ ہی سب سے زیادہ دکھ بھری یادیں تھیں۔

مالکن کبھی کبھی اس کے پاس لیٹ کر اُسے کلیجے سے لگا لیا کرتی، وہ بخار میں تڑپا کرتا، اُسے بے چینی اور کمزوری محسوس ہوتی اور پھر وہ سو جاتا

اپنے مالکن کے نرم گرم جسم سے اُسے بڑی ہی تسکین ملتی اور اس کے جسم کی خوشبو سے جو شفقت بھری لپٹیں نکلتیں وہ اسے بے ہوش سا کر دیتیں اور یہ بھی ایک ایسی یاد تھی جو ہمیشہ اس کے ذہن میں تازہ ہی رہی۔ یہ ہم آغوشی شفقت اور نرمی میں بہت کچھ اس کی اپنی ماں کی یاد کی طرح تھی لیکن پھر بھی اس سے مختلف ضرور تھی۔ ان دو یادوں میں ایک عجیب نامعلوم سا اختلاف تھا۔ ایک ایسی یاد جو بچے کی معصوم محبت سے شروع ہوتی ہے۔ جو ایک عورت کی محبت سے دوسری عورت سے محبت کرنا سیکھتا ہے، ایک ایسی محبت کی یاد جس کی بنیاد بھروسہ اور پرورش پر رکھی جاتی ہے۔ اور پھر وہ محبت خواہشات کی پگڈنڈیوں پر سے گذرتی، آرزوؤں کے چکر کاٹتی ایک ایسی محبت میں جا کر مل جاتی ہے جو قدرتی ہے، جو دل کی تمام تمناؤں کی مدگاہ ہے۔ جو اپنی خواہشات کی تکمیل میں حیوانیت تک پہنچ جاتی ہے۔ جو اخلاق کی دیواروں اور مذہب کی پابندیوں کا مذاق اڑاتی ہے۔

جب وہ پربھا کے ایک ڈاکٹر دوست کے ایوریدک اور کیمیا کے نسخوں اور شربتوں کو پی چکا، اور مالکن کے ٹھنڈے شفیق ہاتھ اس کی دکھتی آنکھوں کو اچھا کر چکے تو وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر فیکٹری کے جہنم میں کود پڑا، یہاں ہر شخص نے اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا۔ اور اس سے کم سے کم کام لیا گیا۔ منو بہت کمزور ہو گیا تھا اور ہمیشہ خاموش سوچ میں ڈوبا بیٹھا رہتا۔

گنپت کو اس دورہ میں اسکے خلاف بہت زیادہ وقت لگا۔ اگرچہ یہ بھی سب کے لئے ایک خوش قسمتی ہی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ پربھا کو روپیہ کی سخت ضرورت تھی اور گنپت وہی روپیہ اگاہنے گیا ہوا تھا۔ آخر کار

اس نے سر ٹوڈرمل سے کچھ روپیہ قرض لے لیا اور اس کے عوض میں اُن کو ایک ہنڈی لکھ دی کہ ایک ماہ بعد پانچ سو روپیہ ادا کر دیا جائے گا، اور اس درمیان میں پینتالیس فی صدی کے حساب سے سود ادا کیا جائے گا۔ اس روپے کے علاوہ اس نے بازار سے بھی تین بنیوں سے الگ الگ سو سو روپیہ قرض لیا۔ کیوں کہ خرچ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن اُسے یہ اطمینان تھا کہ کارخانے کے تقریباً دو ہزار روپے باہر مختلف اڑھتیوں پر آتے تھے۔ اور جب گنپت روپے لے کر واپس آ جائے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

اس درمیان کم از کم اتنا اس نے ضرور کر لیا تھا کہ اور کچھ نہیں تو ہمسایوں سے صلح تو ہو گئی تھی۔ یہ تو اسے معلوم تھا کہ ان کی دوستی اس بنا پر ہے کہ وہ انھیں سود دے رہا ہے۔ مگر پھر بھی اُسے یہ خیال ضرور تھا کہ اس دوستی میں مہربانی کا عنصر بھی شامل ہے۔ اور اسی مہربانی کو اور بھی دیرپا بنانے کے لئے وہ چاہتا تھا کہ ان کے کوارٹروں میں سے ایک اور کوٹھری اُسے کرایہ سے مل جائے، تاکہ چند اور مزدور عورتوں کو بٹھایا جا سکے جو گلقند بنانے کے لئے گلاب کی پنکھڑیاں ملنے پر رکھی گئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اگر سر ٹوڈرمل کے جیب میں مزید پیسے جاتے تو وہ اس پیش پر مزید مہربانی کا اظہار فرماتے یہاں تک کہ لیڈی ٹوڈرمل بھی ازراہ مہربانی پوچھ لیا کرتیں۔

"پربھاتم آج کل بڑے دُبلے ہو گئے ہو، ایسے پیلے کیوں پڑ گئے" وغیرہ ...

وہ ہاتھ جوڑ لیتا۔ اور یوں ہی بلاوجہ معافی مانگنے لگتا۔ کیونکہ چاہے وہ دل سے پربھاپر دہربان نہ بھی رہے ہوں۔ پھر بھی پربھا ان کے بڑھاپے اور ان کی امیری کی وجہ سے ان کی عزت تو کرتا ہی تھا۔ ہاں اس کا دل یہ درچاہتا

تھا کہ کاش اُسے اُن سے کام نہ پڑتا۔ اور یہ گنپت جلد لوٹ آئے تو ان کا قرض بے باق کر دیا جائے۔ لیکن گنپت کو واپس آنے میں غیر معمولی دیر ہوئی۔

آخر وہ واپس آیا ــــ لیکن آتے کے ساتھ ہی اس کی بے لگام زبان نے سب کا ناک میں دم کر دیا۔ وہ قلیوں کو پیٹتا اور دھمکاتا، مزدور عورتوں کو گالیاں دیتا، پربھا کے سامنے منہ پھلائے رہتا اور اس سے بات تک نہ کرتا۔

منو ویسے بھی بڑا قیافہ شناس واقع ہوا تھا اور بیماری کے بعد سے تو اس کی یہ خاصیت اور بھی تیز ہو گئی تھی۔ جس انداز سے گنپت پربھا کے ساتھ پیش آتا تھا، لچھی اور دوسرے مزدوروں کو دیکھا کرتا تھا اور روپیہ کی تجوری اور حساب کے بہی کھاتے کو تاکتا تھا وہ منو سے چھپے نہ تھے۔ اس مرتبہ بھی اس کے باہر سے واپس آتے ہی گنپت سمجھ گیا کہ ضرور اس کی نیت کچھ خراب ہے اور اسے کسی بات کی فکر ضرور ہے۔ وہ فکر کیا تھی یہ تو منو کو معلوم نہیں تھا لیکن اس نے اپنے دل میں سوچا کہ شاید یہ اپنی حرکتوں پر پچھتا رہا ہو۔ اُس دن گنپت نے منو کو تین چار مرتبہ اپنی طرف گھورتے دیکھا۔ پہلے تو اس نے صرف ایک قہر کی نگاہ ڈالی دوسری مرتبہ تیوری چڑھالی، تیسری مرتبہ منہ پھیر لیا اور چوتھی مرتبہ اس پر جھپٹا۔

"ابے کیا دیکھ رہا ہے حرامی، اپنا کام کر"

اس کے بعد منو نے گنپت کو نہیں گھورا لیکن دل ہی دل میں یہ سوچتا ضرور رہا کہ اس کا چہرہ اور لمبا اور مکروہ ہو گیا ہے۔ کہیں یہ باہر کی آب و ہوا کا اثر تو نہیں ہے۔ پھر وہ گنپت کے متعلق سب کچھ بھول کر اندر کوٹھری میں چلا گیا۔ اور گلاب کی پنکھڑیاں دیگچیوں میں بھرنے میں پربھا کو مدد دینے لگا۔ لیکن گنپت ایسا نہ تھا کہ منو کو اس طرح گھورنے کے بعد یونہی چھوڑ دیتا۔ وہ موقعے

کی تاک میں رہا کہ کب منو کو پیٹ کر اپنا دل ٹھنڈا کرلے۔ اور یہ موقع اُسے جلد ہی ہاتھ آگیا۔ پربھا نے منو کو گلقند سے بھری ہوئی ایک اچاری دی کہ مزید رشوت کے طور پر لیڈی ٹوڈرمل کے یہاں پہنچا دے۔ کیونکہ قرض کی ادائیگی میں سات دن اور چڑھ چکے تھے۔ منو کو سر ٹوڈرمل کے یہاں جانے کا بڑا شوق تھا کیونکہ ان کا گھر تمام انگریزی فرنیچر سے سجا ہوا تھا اور چاروں طرف انگریزی تصویریں لگی تھیں۔ چنانچہ اس اشتیاق میں منو ہاتھ میں گلقند کی اچاری لئے تیزی سے گلی کی طرف دوڑا۔

گنپت تخت پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا، اس نے منو کو دیکھا۔ اور اُٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے گیا کہ اس تیزی سے یہ کہاں چلا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے دیکھا کہ منو نے وہ اچاری لے جا کر لیڈی ٹوڈرمل کے حوالے کر دی جو سامنے ہی کے بڑے کمرے میں بیٹھی ایک عورت سے کچھ گپ شپ کر رہی تھیں، منو پر تو اس کو ویسے ہی غصہ آرہا تھا، اور لیڈی ٹوڈرمل سے پہلے ہی خار کھائے بیٹھا تھا۔ کریلا اور نیم چڑھا۔ اس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا۔ مگر تیوری چڑھائے دروازے سے واپس ہوا۔ وہ غصہ کے مارے کھولا جا رہا تھا کہ جن لوگوں کے لڑکے نے اُسے پیٹا اور پھر ہسپتال آفیسر کو بلا کر لائے۔ ان کو پربھا تحفے تحائف بھیج کر تعلقات قائم کر

منو کی آہٹ پاکر وہ مڑا اور اس کی گردن میں ہاتھ دے کر گلا چنگھاڑنے لگا "کس کے حکم سے تو اس عورت کے یہاں گلقند لے گیا، بول کس کے حکم سے لے گیا"

منو ڈر کے مارے گھگھیا گیا "مجھ سے تو بڑے سیٹھ جی نے کہا تھا۔ انھوں نے حکم دیا کہ جو چیز بھی مانگیں انھیں پہنچا دیا کرو"

"اچھا تو یہ بات ہے"، گنپت نے دانت پیس کر کہا۔ "اور تو یہاں بھی مزے کرنا چاہتا ہے اور وہاں بھی! کیا جلدی جلدی دوڑ دوڑ کر ہمارے دشمنوں کے یہاں مربے اور عرق پہنچائے جاتے ہیں"، اور اس نے منو کو ایک زناٹے کا چانٹا رسید کیا۔

منو نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر روکا۔

گنپت کا دوسرا چانٹا منو کی اٹھی ہوئی کہنی کی ہڈی پر جا کر پڑا، اس کا ہاتھ رکھ گیا۔ اب تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اور اس نے منو کی پسلیوں میں مکے مارنے شروع کئے۔ ایک، دو، تین یہاں تک کہ منو ڈھڑام کر گلیارے کے کیچڑ میں جا پڑا، اور لگا گلا پھاڑ پھاڑ کر اور پھوٹ پھوٹ کر رونے۔

گنپت کو غصہ تو دراصل تحفے بھیجنے اور تحفے لینے والے پر تھا۔ مگر اس نے اس غصہ کو منو پر اتار دیا۔ گلی میں جا جا کر وقت خراب کرتا ہے۔ ادھر ادھر بھاگتا پھرتا ہے۔ سؤر کا بچہ، کتے کی اولاد۔ اب کبھی جا کے دیکھنا، ہڈیاں نہ توڑ دی ہوں تو کہنا"۔

پر بیچارا بھاگتا ہوا کوٹھری سے نکلا۔ اور کیا دیکھتا ہے کہ منو اوندھے منہ کیچڑ میں پڑا ہوا ڈھاڑیں مار مار کر رو رہا ہے۔ اس کی نگاہیں گنپت کی خونی آنکھوں سے گذرتی ہوئی دروازے کے بھی اس پار پہنچیں۔ سامنے لیڈی ٹوڈرمل حیران کھڑی تھیں۔ انھوں نے گنپت کی نفرت بھری نگاہوں کو اچھی طرح پہچان لیا تھا کہ یہ غصہ دراصل ان ہی کے اوپر ہے۔ منو غریب کو تو محض بہانہ بنایا جا رہا

"کم بخت، نمک حرام، کمینے ہمیں گنگنہ کی ایک بوٹی دیتے

تیرا دم نکلتا ہے۔ تمہارے دھوئیں سے ہمیں اتنی تکلیف ہے
پھر بھی ہم نے تم پر مہربانی کی۔ ہمیں تو چاہئے تھا تمہیں کان
پکڑ کر نکلوا دیتے مگر ہم نے ضرورت کے وقت تمہیں روپے دیئے
ان گندی عورتوں کے بیٹھنے کے لئے ایک کوٹھری بھی دی ۔
نگھرے کہیں کے ۔۔۔ وہ کیسے کہتے ہیں نا کہ: پہاڑی دوست
کس کا۔ کھایا پیا کھسکا "

"جائیے جائیے" گنپت اپنے لائے ہوئے اس طوفان سے
بوکھلا گیا "آپ سے کیا مطلب! ہمیں اپنے نوکروں کو تنبیہ کرنے کا حق ہے،
ہمارا جی چاہے گا تو اپنے نوکروں کو ضرور سزا دیں گے "

"ارے بے حیا نمک حرام نگھرے!" اب تو لیڈی ٹوڈرسل دراصل
لڑنے کے موڈ میں آگئیں "اپنی بکرے ایسی صورت تو دیکھ! تو ہی ہم میں اور پرجا
میں لڑائی کرواتا ہے، عداوت ڈلواتا ہے، بے چارہ بڑا شریف
ہے، اور تو کمین ہے، پنچ، وہ دلال تیرا باپ بھی کمین ہے۔ میں
کیا تجھے اور تیری سات پشتوں کو نہیں جانتی۔ تیرے باپ
نے اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیا اور ایک مسلمان رنڈی کے ساتھ
رہتا تھا۔ تو بھی ویسا ہی ہے شرابی اور رنڈی باز۔ تیرا باپ بھی
اپنے ہاتھوں کا روپیہ لے لے کر کھا گیا اور تو بھی اپنے ساتھی
کا مال ہضم کر رہا ہے۔ تیری صورت سے بے ایمانی ٹپکتی
ہے کمبخت کہیں کا! ۔۔۔ تو تو اس قابل نہیں کہ ہم بیٹیوں
کے پاس بیٹھ رہے "

جب لیڈی ٹوڈرمل گنپت کی خبر لے رہی تھیں تو منو نے اپنی ہچکیاں روک لیں اور رونے کی آواز دھیمی کر کے ان کی باتیں سننے لگا۔ اُسے کچھ خوشی ہو رہی تھی کہ گنپت کو خوب صلواتیں سنائی جا رہی ہیں اور وہ کوشش کر رہا تھا کہ ہچکی نکلنے نہ آئے تاکہ ایک ایک لفظ بخوبی سنا جا سکے۔

لیکن اب پربھا بات کر رہا تھا: "ماتا جی! ماتا جی! ہمیں معاف کر دو میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آپ کے پاؤں پڑتا ہوں۔ آپ کے پاؤں کی دھول میں ناک رگڑتا ہوں۔ آپ جو کہیں میں کرنے کو تیار ہوں۔ آپ اسے معاف کیجئے۔ بھگوان کے لئے آپ اسے معاف کر دیجئے۔ اس نے بڑی غلطی کی۔ وہ بے وقوف ہے، اُسے سمجھ نہیں ہے۔ ہم تو آپ کے بچے ہیں، آپ ہمارے مائی باپ ہیں۔ اب غصہ تھوک دیجئے۔ معاف کر دیجئے"

لیکن لیڈی صاحبہ بھلا رکنے والی تھیں۔ انھوں نے آگے کو جھک کر زیادہ دھیمے لہجے میں مگر بڑی شان سے کہا۔

"دیکھو اب ہم بار بار تمھیں نہیں معاف کر سکتے۔ اس دن اس نے ہمارے بیٹے سے جھگڑا کیا تو خیر ہم نے اُسے معاف کر دیا، ہمیں اپنے کوارٹر کی کنجی چاہیئے۔ تم لوگوں کی اصلیت معلوم ہو گئی، ہمارے گھر سے نکل جاؤ اور لاؤ ہمارا روپیہ بھی واپس کر دو"

اب پربھا کو احساس ہوا کہ معاملہ دراصل دگرگوں ہے۔ اب اسے دباؤ کے ساتھ ساتھ اپنے خانماں برباد ہونے کا بھی ڈر پیدا ہوا، ایک منٹ کے لئے اس نے اپنی ساری طاقت اکٹھی کر کے اس کے مقابلے میں رکھ دی۔

"ماتا جی معاف کرو۔ اس آدمی کو کچھ پاس پڑوس کا قاعدہ نہیں آتا۔ پر آپ کو تو ورا بھنا چاہئے۔ آپ ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کیسے کر سکتی ہیں" لیکن پربھا کی تمام طاقت بھی لیڈی صاحبہ کا مقابلہ نہ کر سکی۔

"بس بس۔ اپنی معافی رہنے دو۔ تم اسے بچانا چاہتے ہو۔ نکل جاؤ ہمارے گھر سے اور ہمارا روپیہ بھی واپس کرو۔ ابھی تمتیں یہاں سے نکال باہر کئے دیتی ہوں"۔

"معاف کرو ماتا جی، معاف کرو" پربھا رونے لگا۔ اس کی آواز انتہائی عاجزی سے کانپنے لگی تھی۔

منو کا رونا اور ہچکیاں ایک دم تھم گیا۔ اس کے دل میں خوف پیدا ہونے لگا۔ اب اس کے مالک کا کیا حشر ہوگا؟ فیکٹری کے دوسرے مزدوروں نے بھی اپنا اپنا کام چھوڑ دیا اور آس پاس کی عورتیں گلی میں جمع ہو کر تماشہ دیکھنے لگیں۔ چند منٹ تک یہ تناتنی کی فضا قائم رہی۔ لیڈی ٹوڈرمل نے اور لوگوں کو جمع ہوتے دیکھ کر اور بھی ڈینگنا شروع کیا۔ زور زور سے فرش پر پیر پٹکتیں اور چیختیں۔

"چلو نکلو باہر! اب تم سے باہر نکلنے کو کہا گیا۔ تو عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ گئے"

"کیا بات ہے، کیا ہوا۔ اونہہ۔ ہوں۔ کھوں۔ کھوں" سر ٹوڈرمل کھانستے ہوئے سیڑھیوں پر سے اترے۔ وہ کپڑے وغیرہ پہن کر باغوں کا معائنہ کرنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔

"ارے یہ نمک حرام ہیں اور کیا ہوتا" لیڈی ٹوڈرمل اپنے میاں

کو آتے دیکھ کر اور بھی شیر ہو گئیں ۔ ایک تو ہمارا سارا احاطہ دھوئیں سے برباد کیا، ہم نے ان پر مہربانی کی، انھیں ایک کوٹھری اور دی اور اوپر سے روپیہ دیا اور یہ ہیں کہ ہمیں گلقند کی ایک اچاری دیتے ان کی نانی مرتی ہے "

" ہمارے پاس بازار سے گلقند خریدنے کو کافی روپیہ ہے " سر ٹوڈرمل بولے " یہ بدمعاش۔ ہو ہو، کھوں کھوں "۔ اور انھیں دمہ کی کھانسی کے دھچکے آنے لگے۔

" رائے بہادر صاف ہمیں معاف کر دیجئے "۔ گپتا ہاتھ جوڑے ہوئے آگے بڑھا۔ اور جھک جھک کر دوہرا ہونے لگا۔ رائے بہادر صاحب کھانستے جا رہے تھے " گپتا کو بالکل سمجھ نہیں ہے۔ اصل میں میں نے آپ کے یہاں ایک اچاری بھر کے گلقند تحفتہً بھیجا تھا، اسے معلوم نہ تھا کہ یہ رڈکاکس کے یہاں لے جا رہا ہے۔ ہمارے یہاں اتنے بہت سے لوگ تحفے مانگنے آتے ہیں۔ اسے بالکل معلوم نہ تھا، اور ویسے بھی وہ چڑچڑا ہے، اسے غصہ بہت جلد آجاتا ہے "۔

" جھوٹا کہیں کا! اب اس کی بچت کرانا چاہتا ہے " لیڈی ٹوڈرمل چیخیں۔

" بھئی ٹھہرو تو سہی۔ ذرا اسے بات تو ختم کر لینے دو " سر ٹوڈرمل نے اپنی بیوی کو ذرا پیچھے ہٹایا۔

" پر یہ مرا جھوٹ جو بول رہا ہے، اس بدمعاش شرابی، رنڈی باز کی بچت کرانے کے لئے "

" بھئی یہ تو بہت ہی بری بات ہے کہ تم ہمیں گلقند کی ایک اچاری

تک دینے سے کتراتے ہو جب کہ ہم نے تمہیں کوٹھری دی، روپیہ دیا، اور تمہارے خلاف صاحب کے یہاں سے شکایت بھی واپس لے لی۔"

صاحب کے یہاں کی شکایت کا ذکر انھوں نے آخر میں کیا کیونکہ وہ تھی ہی بے کار بات۔ ڈاکٹر ہارجو رینیک نے اس شکایت کے متعلق کچھ کہا ہی نہیں۔ ایک دن کمیٹی میٹنگ کے بعد انھوں نے سر ٹوڈرمل سے صرف اتنا کہا تھا کہ دھوئیں نکلنے کے لئے چھت پر چمنی ہونی چاہئے۔ اور وہ پولو کھیلنے کے لئے جم کھانے چل دیئے تھے۔

"معاف کیجئے رائے صاحب۔ اب کی دفعہ معاف کر دیجئے۔"

پربھا رائے صاحب کے قدموں میں گر پڑا۔ "اب ایسا کبھی نہ ہوگا۔ آپ ہمارے مائی باپ ہیں۔"

"اچھا پربھا، اچھا" ٹوڈرمل تیوری چڑھائے بولے، تاکہ ان کا وہ احساس برتری ظاہر نہ ہو سکے جو ایک انسان کو اپنے قدموں میں پڑا دیکھ کر انہیں محسوس ہو رہا تھا۔ "یاد رکھو آئندہ یہ سور کبھی ایسی کمینی حرکت نہ کرے۔"

اور وہ چل دیئے۔

لیڈی ٹوڈرمل نے اندر جاتے جاتے، باہر گلی میں جمع عورتوں اور بچوں کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہا۔

"دیکھو ان لوگوں کو کتنا کچھ کہا سنا پھر بھی اتنی شرم نہ آئی کہ ہماری کنجیاں دے دیتے۔"

پربھا اندر واپس ہوا اور کیچڑ بھرے گلیارے سے منو کو سہارا دے کر اٹھایا۔

"ارے مہاراج تھوڑا سا پانی لاکر اسے نہلا دے" اس نے اس احمق سے کہا جو برابر بالٹی پر بالٹی پانی کنوئیں سے کھینچے جا رہا تھا۔

منو کو بہت خوشی اور فخر محسوس ہو رہا تھا کہ گنپت کی ذلت ہوئی۔ اس نے دل میں سوچا کہ تقدیر نے میرا بدلہ دوسروں کے ہاتھ سے لوایا۔ رونے سے وہ اتنا شرمندہ ہو گیا تھا کہ گنپت تو کیا کسی سے بھی آنکھ نہ ملا سکا۔ لیکن نہلانے کے بعد وہ پہلے سے بہت زیادہ جوش کے ساتھ کام میں لگ گیا۔

جب معاملہ ذرا ٹھنڈا ہو گیا، تو پربھا نے گنپت کو الگ لے جا کر نرمی سے سمجھانا شروع کیا۔

"دیکھو بھئی، اپنے پڑوسیوں کو خواہ مخواہ ناراض کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اور پھر جب تم باہر گئے ہوئے تھے تو انھوں نے ہم لوگوں کو روپیہ بھی دیا تھا۔ یہ ان کی مہربانی تھی۔"

"اچھا بس بس میری جان نہ کھاؤ" گنپت چنگھاڑا "تم اس طرح لوگوں کو تحفے دے دے کر سارے کاروبار کا ستیاناس کئے دے رہے ہو۔ آخر انھوں نے روپیہ یوں ہی تو نہیں دے دیا۔ کرا سود لگایا ہوگا۔"

"لیکن گنپت! سود بغیر ہمیں روپیہ دیتا ہی کون" پربھا نے سمجھاتے ہوئے کہا "تم نے جو کچھ روپیہ اگاہا اس میں سے مجھے کچھ بھیجا نہیں۔ مجبوراً مجھے لینا ہی پڑا۔ بلکہ دستاویز کی مدت سے اوپر سات دن ہو گئے ہیں۔ اچھا اب مجھے یہ بتاؤ کہ تم کتنا روپیہ لائے ہو۔ تاکہ ان لوگوں کا قرضہ اور دیوی دیال گھنشام داس سے میں نے

جو کچھ لیا ہے وہ ادا کر دیا جائے میں تو تم سے پوچھنا ہی بھول گیا کہ کتنا روپیہ لائے ہو؟"

"کوئی پچاس" گنپت نے سر جھکا کر چڑے چڑے پن سے کہا۔

"پچاس!" پربھا نے گھبرا کر کہا۔ "لیکن ہمارے تو سات سو سے لے کر دو ہزار تک آتے تھے"؟

"تو میں کیا کروں" گنپت بگڑ گیا تھا۔ "دراصل تو میں نے تین سو روپے اگاہے تھے مگر پچھلے سال مجھے اپنا حصہ نہیں ملا تھا اس لئے میں نے ڈھائی سو اپنے پاس رکھ لئے ہیں"

"یہ دوسری بات ہے۔ تم نے تو پچاس کہہ کر میرے حواس کھو دیئے" کچھ دیر دونوں کے درمیان ایک خاموش تناتنی سی رہی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم مجھے ایسا ذلیل کرو گے" گنپت نے کوشش کی کہ پربھا کو دبائے۔ لیکن اس کے دل کا چور اس کی صورت پر صاف جھلک رہا تھا۔

پربھا نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ گنپت جان بوجھ کر اپنی معصومیت ثابت کرنے کے لئے گفتگو کا رخ بدل رہا تھا۔ اور ایک دم سے پربھا کو گنپت سے ایک نفرت سی محسوس ہوئی۔ جیسے بعض وقت کسی ایک حرفِ غلط سے لوگوں کے گہرے سے گہرے اور مضبوط سے مضبوط ایمان کی بنیاد متزلزل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس وقت گنپت کی صورت دیکھ کر اسے یک لخت اپنے ساتھی کی خود غرضی اور بے ایمانی کا احساس ہوا۔ اور اسے صاف دکھائی دینے لگا، جو غالباً اب تک اس پر واضح نہ ہوا تھا۔ کہ گنپت میں کمینے پن کا عنصر شامل ہے۔ پربھا اس سے عاجز ہو گیا لیکن پھر بھی

اُسے دوستی کا خیال آگیا اور اس کے دل میں گنپت کے لئے بھلائی بھی پیدا ہوئی۔ اس نے سوچا کہ چاہے کچھ بھی ہو ہم دونوں الگ نہ ہوں گے۔

"اچھا سنو" اس نے مَری ہوئی آواز میں کہا "تم ایسا کرو۔ وہ ڈھائی سو روپے جو تم نے رکھے ہیں ان میں سے دو سو روپیہ کاشی رام کو بطور قرض کے دے دو۔ تاکہ ہم ان ہمسایوں اور دیوی دیال دونوں کا حساب بیباق کر دیں۔ یہ دونوں ناک میں دم کئے ہیں میں اگلے ہفتے لاہور چلا جاؤں گا۔ اور ہمارے پانچ سو روپے جو وہاں آتے ہیں۔ اور تم نہیں لائے وہ لے آؤں گا، پھر تمہیں اپنا روپیہ واپس مل جائے گا"

"میرے پاس روپیہ ہے کہاں؟" گنپت کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھی سے صریحاً جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے دراصل آٹھ سو روپیہ وصول کیا تھا اور اس کا بیشتر حصہ لاہور ہی میں، اپنی ایک واقف کار رنڈی پر خرچ کر چکا تھا۔

"میں نے اپنے حصے کا روپیہ خرچ کر دیا ہے" اس نے گھبراہٹ کے عالم میں جواب دیا "اور تم بھی لاہور میں کچھ وصول نہ کر سکو گے۔ میں نے تمام آڑھتیوں سے بہت کوشش کی لیکن کچھ زیادہ نہ مل سکا"

اب تو پربھا کو بے حد شک و شبہ پیدا ہوا۔ لیکن اس نے بڑے بھائی کا سا وقار قائم رکھ کر کہا۔

"اچھا تو آؤ مجھے سب باتیں تفصیل سے بتاؤ۔ سب حساب کتاب دیکھ لیں اور یہ سوچیں کہ اب روپیہ کہاں سے ملے"۔ اور پھر اس نے منو کو آواز دی۔

"اے منو! ادھر آ۔ ماسٹر گنپت جو جو لکھائیں لکھتا جا اور پھر حساب جوڑ۔"

منو چٹنی کی دیگچی چلاتے ہوئے چپکے سے کان لگائے یہ تمام ماجرا سن رہا تھا۔ پربھا کی آواز سن کر اس نے ہاتھ دھونے شروع کئے گویا یہ بھی کھاتہ سنبھالنے کی تیاری تھی۔

"میں ان قلیوں کے آگے حساب کتاب نہیں کروں گا" گنپت غصے سے بپھر گیا۔ "اور نہ ہی میں اس حرامی کو بہی کھاتہ چھونے دوں گا۔ تم نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے"

"وہ تو یتیم بچہ ہے" پربھا نے کہا۔ "کم از کم دھرم کی خاطر ہی ہمیں اس سے اچھا سلوک کرنا چاہئے۔ اور پھر وہ کافی ذہین بھی ہے، قلی کا کام اس کے لئے مناسب نہیں۔ اگر ہم اسے سکھائیں گے تو بہت جلد حساب کتاب کرنے لگے گا۔ اور ہم ہی کو آرام ملے گا۔ ہم سب ایک خاندان کی طرح ہیں۔ منو کے سامنے حساب کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ اور قلی تو کچھ سمجھیں گے نہیں"

"اور یہ بدمعاش کون سا بہت سمجھتا ہے"۔ گنپت نے دانت پیسے "ان اسکول کے چھوکروں کو تو صرف جمع تفریق آتی ہے۔ بہی کھاتہ یہ کیا جانیں۔ اس کو میرے قریب بھی نہ آنے دینا۔ نہیں جان سے مار ڈالوں گا"

پربھا خاموش رہا اور بہی کھاتہ اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ منو پاس ہی منتظر کھڑا رہا کہ تخت کے پاس جائے یا نہیں۔ گنپت کی گھبراہٹ کی انتہا نہ تھی، اس کو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی بے ایمانی اور

جھوٹ کا بھانڈا اب پھوٹا ہی چاہتا ہے۔

"اس حرامی کے ساتھ دوسروں سے بہتر برتاؤ کیوں کیا جاتا ہے"

"لیکن اس کے ساتھ دوسروں سے بہتر برتاؤ کیا ہی کب جاتا ہے" پربھانے دھیرے سے کہا اور ہی کھولنے لگا۔

اب گنپت کے لئے فرار کا کوئی راستہ باقی نہ تھا۔ لیکن پھر بھی وہ بات ٹالنا چاہتا تھا۔

"اسی کی وجہ سے آج دن کو یہ سب قصہ ہوا۔ آخر یہ اس کتیا کے واسطے گلقند لے ہی کیوں گیا؟"

"خواہ مخواہ لوگوں کو گالی نہ دو" پربھانے ذرا سختی سے کہا۔

"تمہاری بدزبانی کی وجہ سے مجھے اُن لوگوں سے معافی مانگنی پڑی۔ میں نے منو کے ہاتھ انھیں گلقند بھیجا تھا، اس میں نہ منو کا قصور ہے نہ ان کا۔ اور میں نے اس لئے بھیجا کہ ان لوگوں سے اچھے تعلقات قائم رہیں کیونکہ ہم نے ابھی تک ہنڈی اُن نہیں کی ہے"

"کاروبار میں اس ہنڈی وُنڈی کے قصہ کو میں نہیں مانتا" گنپت اب نت نئے بہانے ڈھونڈ رہا تھا "بغیر ہنڈی کے روپیہ لینا اس سے کہیں اچھا کہ اگر دے نہ سکے تو گلا نہ پھنسے!"

"لیکن کاروبار میں بددیانتی کرنا تو اچھا نہیں ہے" پربھانے کہا

"میں اچھا برا نہیں جانتا۔ اگر رسید نہ دی ہو تو کوئی مقدمہ نہیں چلا سکتا۔ اور مجھے بے ایمان نہ کہنا اور نہ یاد رکھنا نہیں تمہاری ہڈیاں چور کردوں گا"

"لیکن گنپت میں نے کب کہا کہ تم بے ایمان ہو" پربھانے

اطمینان دلانے کے لہجے میں کہا "اس میں اتنا بگڑنے کی کون بات ہے؟ اب غصہ تھوک دو، ہم اس معاملہ کے متعلق کل بات چیت کریں گے، لیکن گنپت کو تو معلوم تھا کہ آج نہیں تو کل کبھی نہ کبھی تو قلعی کھل ہی جائے گی۔ اب پربھا نے جو اس سے اتنی ملائمت سے باتیں کیں تو اسے اور بھی کھسیاہٹ ہوئی اور غصہ آیا۔

"تم مجھ پر بے ایمانی کا الزام لگا رہے ہو" وہ چیخا "اس عورت نے جو آج مجھے کہا ہے تم بھی مجھے ویسا ہی سمجھتے ہو گے۔ اچھا تو سنو، میں نے آٹھ سو روپیہ وصولا تھا اور پچاس کے علاوہ باقی سب خرچ کر دیا۔ میں دولت پور والی امیر جان سے ملا تھا، پر تم یہ نہ سمجھنا کہ مجھے اس روپے کے خرچ کرنے کا حق نہ تھا۔ میں تمہارا وکیل نہیں ہوں، اور نہ تمہارا غلام ہوں کہ مجھے ٹوراد حمکا کر وصول کر لو گے"

"مگر میں تمہیں کہاں دھمکا رہا ہوں" پربھا غصے کے مارے پیلا پڑ گیا تھا۔ "مگر مشکل تمام اپنے کو روکے ہوئے تھا" کوئی بات نہیں۔ تم جوان آدمی ہو۔ غیر شادی شدہ ہو۔ اگر تم نے کبھی کوئی رنگینی کر لی تو اس میں کیا ہو گیا؟ روپیہ کے خرچ ہونے میں کیا حرج ہے۔ اچھا ہوا جو تم نے مجھ سے کہہ دیا۔ ہم لوگ کہیں اور سے قرض لے کر سب معاملہ ٹھیک کر لیں گے"

"تم سمجھتے ہو، تم مجھے خوشامد کر کے بیوقوف بنا لو گے" گنپت دھاڑا "مگر تم ایسا نہیں کر سکو گے۔ میں تمہاری اس چاپلوسی کو اور ان چکنی چپڑی باتوں کو خوب جانتا ہوں۔ آخر تم اپنے کو سمجھتے کیا ہو؟"

"بھائی گنپت ایسی باتیں نہ کرو"۔ پربھا کو آخر غصہ آ ہی گیا۔
"یہ بھی کوئی انصاف ہے۔ میں نے تمھارے پرائیوٹ معاملات میں آج تک کبھی دخل نہیں دیا کیونکہ ممکن ہے تمھاری حالت میں ہوتا تو شاید یہی کرتا۔ تمھارا جو جی چاہے مجھے کہہ لو، مگر ایمان سے کہو میں نے تمھیں کبھی کچھ کہا۔ تم نے جو موگا کے روپے کے متعلق مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ تب میں البتہ تم پر خفا ہوا تھا لیکن اب تو ویسی کوئی بات نہیں ہے"

"تم بڑے چالاک بدمعاش ہو! مکار کہیں کے"۔ گنپت چیخ چیخ کر کہنے لگا۔

"مہربانی کر کے میرے ساتھ زیادتی نہ کرو"۔ پربھا بولا "میں چالاک اور مکار نہیں ہوں۔ میں تو ایک سیدھا سادا پہاڑی ہوں۔ ساری عمر میں نے محنت کر کے کھایا ہے۔ مجھے شہر والوں کی طرح تین پانچ کرنا نہیں آتا۔ کاش میں ابھی تک قلی گیری ہی کرتا ہوتا اور اس کاروبار میں نہ پھنسا ہوتا"۔

"ہاں ہاں بڑے بھولے ہو نا"۔ گنپت نے دانت پیس کر کہا۔
"تمھارا بھولا پن اس کاروبار کے ساتھ خوب کھپتا ہے۔ تم بڑے چالاک اور بدمعاش ہو۔ پہاڑیوں میں بھی ایسا مکار کوئی کم ہوگا چلتا ہوا پہاڑی کتا!"

پربھا کو یقین ہو گیا کہ آپس کی دوستی اور بھروسہ سب ٹوٹ چکا، اور اب پھر سے قائم نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر بھی اس نے اپنے وقار اور اپنی خودداری کو بالائے طاق رکھ کر ایک آخری کوشش کی کہ کسی طرح اپنے ساجھی

سے کم از کم ساجھے کے تعلقات اور دوستی تو قائم رہ جائیں۔" تمھارا جو دل چاہے وہ کہو۔ میں تو جیسا ہوں ویسا ہوں، بے شک اپنی کوششوں کے باوجود بھی میں پاپی تو ضرور ہوں۔"

"بس بس ہو چکا! میں نے تمھیں دیکھ لیا۔" گلپت ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "بے ایمان! تم سمجھتے ہو تم بڑے نیک ہو اور یوں دکھاوے کے لئے بڑے بنو گے تو لوگ تمھیں اور بھی اچھا سمجھیں گے۔ کیوں!"

"چہ - ارے ذرا تو سمجھو!" - پربھا نے گلپت کو پکڑ کر بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اتنا تو سمجھو کہ ہم دونوں ساجھی ہیں۔ کاروبار کا تمام کام ہم دونوں کے نام پر ہے۔"

"میں ساجھا وا جھا سب توڑ دونگا، اور دیکھنا کہ تم نے جو اس وقت میری ذلت کی ہے اس کے بدلے میں تمھیں کیسے کنوئیں جھنکاتا ہوں۔ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ تم ایک نیچ قلی ہو اور عمر بھر قلی ہی رہو گے۔"

اس نے تمام کھاتے اٹھا لئے، اور انھیں بغل میں دبا کر جوتے پہننے چلا۔

"اچھا تمھاری جوتی اور میرا سر۔" پربھا نے اس کی ایک جوتی اٹھا کر انتہائے انکسار سے اسے پکڑائی۔ "مارو میرے سر میں، گنجا کر دو مجھے مگر میرا ساتھ نہ چھوڑو۔ ہم نے برسوں ساتھ رہ کر اس کاروبار کو بنایا ہے۔ اب اس بڑھاپے میں میری پیٹھ پر جھاڑو ہونے کے قابل نہیں ہے۔"

"مجھ سے کچھ مطلب نہیں۔ جہنم میں جاؤ۔ چالاک، مکار جرامی" گلپت نے کہا۔ "ادھر دو میرا جوتا، اور جاؤ گوکھاؤ، پیشاب پیو۔ تمھارا باپ بھی

قلی تھا اور تم بھی قلی ہی نکلے۔ جاؤ ان پڈوسیوں کی چاپلوسی کرو، بزدل، کمینہ، سؤر۔ میں اپنی عزت گنوا کر کسی کی خوشامد نہ کروں گا! اور خوشامد بھی تمہارے ایسے پنچ قلی کی۔"

"اچھا اچھا۔ جتنا چاہو گالی دے لو مگر جاؤ تو مت۔ غصہ تھوک دو۔ سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارا غصہ اتر جائے گا۔"

"ہٹ سامنے سے کتا!" گنپت تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ منو اس لڑائی کو دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کانپ رہا تھا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا اور گنپت کے کوٹ کا دامن پکڑ کر گڑگڑانے لگا۔

"ایسا نہ کرو مالک۔ جاؤ نہیں۔ جاؤ مت، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے مالک۔"

قلی اور بونگا۔ یہاں تک کہ مہاراج بھی ہاتھ جوڑے ہوئے دوڑے۔

"ہٹ میرے رستہ سے سؤر کہیں کا" گنپت چیخا۔ اور دیوانوں کی طرح اس نے سب کو کے مارنے شروع کئے۔ جیسے کوئی ہتھوڑے برسا رہا ہو یہاں تک کہ کچھ تو ڈر کے مارے بھاگے اور کچھ روتے ہوئے تخت پر جا گرے "ہائے بدنصیبی" پربھا اپنا سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا۔ پھر ایک دم سے وہ اٹھ کر گنپت کو واپس لانے دوڑا۔ "آجاؤ! آجاؤ!"

"چل بے پہاڑی کتا!"۔ گنپت نے اس کے منہ پر مکے مارے اور اپنے کو اس کی گرفت سے چھڑانے لگا۔ "نیچ گندہ قلی! جا اپنے انھیں قلیوں کے پاس"

"ہائے ہائے" پربھا پیچھے کو گر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"چپ رہ سور! نکھٹو اور معاش"، گنپت کا ایک پاؤں اندر اور ایک باہر تھا "بس کر اپنے ٹسوے۔ اور خبردار جو میرے پیچھے آیا ہوگا بس میں نے تجھ جیسے کمینوں کو دیکھ لیا۔ تو میرے برابر کا ہے ہی نہیں۔ تو نکمی ہے قلی۔ گلیوں کا پھرنے والا۔ دربدر کی خاک چاٹنے والا۔ دیکھنا میں نے کیا ٹھانی ہے۔ تھڑی ہے تجھ پر" یہ کہہ کر اس نے تھوکا اور چل دیا۔

گنپت نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ اس نے یہاں سے جا کر اپنا ایک اچار اور عرق کا ایک کارخانہ کھول لیا۔ پرانے کارخانے کے لئے جو روپیہ اس نے جمع کیا تھا۔ اس میں سے پچاس ابھی باقی تھے۔ اس نے ایک جگہ کرائے پر لے لی اور ضروری برتن وغیرہ خرید لئے۔ باقی چیزیں اس نے قرض لے کر اکٹھی کر لیں۔ پھر وہ پربھا کے تمام گاہکوں کے پاس گیا۔ اور ان سے خوب رو دھو کر ساجھے میں اس کے ساتھ برابر تاؤ کیا گیا۔ اور یہ بھی کہا کہ پہلا کارخانہ تو اب ختم ہی ہوا چاہتا ہے کیونکہ اس کے مالک نے اتنا قرض لے لیا ہے جو کبھی بھی ادا نہ ہو سکے گا۔

جب واقعات اور حالات کا اس کمینے پن کے ساتھ اعلان کیا گیا تو چاروں طرف پربھا کے دیوالیہ ہونے کی خبر گرم ہونے لگی۔ یہ بات تو سچ ہے کہ پربھا مقروض ضرور تھا لیکن جب حصہ داروں کو بھروسہ نہیں رہتا تو بڑے سے بڑا کارخانہ بھی دیوالیہ ہو جاتا ہے۔ پربھا بچارے کی تو کیا حقیقت تھی۔ قرضخواہ چاروں طرف سے گھبرا گھبرا کر امنڈے آئے۔ اور زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا کر پربھا کو آوازیں دینے لگے کہ باہر نکل کر حساب بے باق کرو۔

"چلو پربھا باہر نکلو"، وہ ایک کے بعد ایک چلانے لگے "سامنے

کیوں نہیں آتا۔ اپنی اماں کے پیٹ میں کیوں گھس گیا۔ مردبن کر باہر نکل" بدقسمتی سے پربھا کو گنپت کے جانے کا دلی صدمہ ہوا تھا۔ اور پھر قرض نہ دے سکنے کے خیال سے وہ یک لخت ایسا پریشان ہوا کہ اسے بخار چڑھ آیا۔ کارخانے کے نوکروں چاکروں نے ڈر کے مارے دروازہ نہیں کھولا۔ قرض خواہ اور بھی زور زور سے چیخنے اور دروازہ پیٹنے لگے۔

"باہر نکل۔ ہمارا سامنا کر! نیچ پہاڑی۔ باہر نکل مادر ... "

پربھا مکان کے بالکل دوسرے سرے پر لیٹا تھا اس لئے اس نے کچھ سنا نہیں لیکن اس کی بیوی نے جو اس کے پاس بیٹھی تھی سنا۔ وہ اٹھی لیکن روایتی شرم اور حجاب کے مارے سب کے سامنے جانے کی ہمت نہ کر سکی۔ اس نے فیکٹری میں جھانک کر تلسی سے کہا۔

"تلسی! جاکر لالہ لوگوں سے کہدو کہ مالک بیمار ہیں اور کل اُن سے مل سکیں گے"

"ارے منو" تلسی نے عادت کے مطابق منو کو حکم دیا "جاکر کہہ دے کہ مالک بیمار ہیں"

منو مہاراج کے پاس سے ہوتا ہوا جواب تک پانی بھرے جا رہا تھا۔ دیوار پر چڑھا اور گلی میں جو کھڑکی کھلتی تھی اس میں سے جھانک کر کہنے لگا۔

"لالہ جی، مالک کو بخار چڑھ آیا ہے۔ آپ کل آسکیں گے"

"بیمار! کیا کہا بیمار ہے" ایک لمبوترے سے منھ والا ململ کی دھوتی کرتا پہنے ہوئے قرض خواہ بولا "ہاں ہاں ہمیں معلوم ہے اس کی بیماری دوسروں کا اتنا بہت سارو پیہ ہضم کر جائے گا تو بیمار نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا! چل جاکر اسے بھیج، نہیں ہم اس حرامی کو گھسیٹ کر

باہر نے آئیں گے"

"لالہ جی وہ سچ مچ بیمار ہیں"۔ منو نے ہاتھ جوڑ کر نہایت دھیرانہ انداز میں کہا۔ "مہربانی کر کے اس وقت چلے جائیے۔ کل وہ خود آپ کے پاس آ کر آپ سے مل لیں گے"

"چل بے بیٹی ... ... جا کے بھیج اُسے۔ ایک بنئے نے کہا جو بھاری سی توند پر ململ کا کرتا، پاؤں میں زری کی چوٹی اور سر پر بڑا سا صافہ باندھے تھا۔

منو واپس ہوا

لیڈی ٹوڈرمل سب سے اوپر والی منزل میں اپنا باورچی خانہ دھلوا رہی تھیں۔ وہ تو کہو انھوں نے اُسی وقت یہ شور و غل نہیں سنا۔ ورنہ دندناتی ہوئی فوراً نیچے آتیں۔ لیکن جب پانی گلی میں پھینکا گیا تو انھوں نے نیچے سے غل کی آوازیں سنیں۔

"ارے کچھ شرم بھی ہے، کچھ خیال بھی ہے کسی کا، اوپر سے گندہ پانی پھینکا رہے ہو"

بہت سے لوگ چلانے لگے "دیکھو تو ہاں تم نے ہمارے سارے کپڑے گندے کر دیئے"

"پر تم لوگ ہو کون"، لیڈی ٹوڈرمل نے معافی مانگتے ہوئے کہا۔

"اب ہمیں کیا معلوم کہ تم لوگ یہاں کھڑے ہو۔ کیوں بات کیا ہے کیا ہوا"

"ہونا کیا! یہ پرہلاد ہے۔ دیوالیہ۔ اسی کو پکڑنے ہم آئے ہیں"

"ہائے ہائے، ارے بدنصیبی، مصیبت! اس کا کالا منہ" وہ چیخی

موٹی سیڑھیوں پر سے دھماد ھم اُتریں "اچھا تو یہ دیوالیہ ہوگیا ہے"
انھوں نے قرض خواہوں کے جمگھٹ کو دیکھکر کہا۔
"ہاں اور اندر بیٹھ گیا ہے۔ باہر نکل کر ہمیں منہ تک نہیں دکھاتا"
ایک قرضخواہ بولا۔
"کیوں رے نمک حرام" وہ چنگھاڑیں "تو مرے، تجھے سانپ
ڈسے۔ باہر نکل کر ہمیں منہ کیوں نہیں دکھاتا کہاں چھپا بیٹھا ہے
چل پہلے میرے پتی کے پانچ سو روپے ہیں" ایک قرضخواہ بولا
"ہاں اس مُرے پر ہمارے روپے بھی ہیں۔ بڑا بولا بن کے آیا
اور میرے پتی کو پھسلا لیا۔ اور ہم نے اسے روپئے دئے۔ حالانکہ
اس کے کارخانے کا دھواں رات دن ہمارے یہاں بھرتا تھا"
اور پھر انھوں نے اپنی بلی کا رخ پربھا کے مکان کی طرف کر دیا"
"چل! دروازہ کھول۔ اب کہاں غائب ہوگیا۔ کہاں ہے تو،
نیرا ٹیرا غرق ہو"
کچھ جواب نہ ملا۔ البتہ کسی کے آہستہ آہستہ رونے کی آواز آرہی
تھی۔ یہ پربھا کی بیوی اور منو تھے جو سوتے ہوئے پربھا کے پلنگ کے پاس
ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو رہے تھے۔
"چل چل کر پولیس کو لائیں" لمبوترے منہ والا بنیا بولا۔
"ٹھہرو" لیڈی ٹوڈرمل بولیں "میرا لڑکا یوں ہی تھانے دار
نہیں ہوگیا ہے۔ میں اُسے بلاتی ہوں" اور وہ زینے پر بھاگیں
پربھا اپنی بیوی کی چیخیں سن کر جاگ پڑا تھا۔
"کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"قرض خواہ باہر کھڑے چلا رہے ہیں۔ اور آپ کو بلا رہے ہیں"
منو نے مشکل کہا۔

پربھا فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور گلی والی کھڑکی میں آکر کھڑا ہوا، اس کا چہرہ پیلا ہلدی پڑ گیا تھا اور ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ اس نے قرضخواہوں کے آگے ہاتھ جوڑے اور کچھ بولنے ہی والا تھا کہ وہ سب کے سب ایک دم چیخ اٹھے۔

"وہ رہا۔ ارے وہ ہے حرامی، وہ ہے بدمعاش بے ایمان نیچے اتر سور کے بچے اور ہمارا روپیہ ادا کر"

"لالہ جی مجھے معاف کرو۔ میں آپ سب کا روپیہ ادا کر دوں گا۔ مر کر بھی آپ کی ایک ایک پائی چکا دوں گا۔ مگر مجھے گالی تو مت دو"

"نیچے اتر سور کے بچے! ہم سے بات تو کر یہاں آکر۔ ہم یہاں کھڑے کھڑے چلا رہے ہیں اور تو اندر چھپا بیٹھا ہے" سب کے سب ایک ساتھ چیخے۔

"میں بیمار تھا لالہ جی" پربھا اب تک ہاتھ جوڑے تھا۔ "بستر پر پڑا تھا۔ میں نے آپ کی آواز نہیں سنی"

"ہاں ہاں تو ہماری آواز کیوں سنتا حرامزادے۔ یہاں ہمارے حلق پھٹ گئے چیختے چیختے"

"کہاں ہے یہ۔ ارے کہاں ہے۔ آیا کیا؟"۔ لیڈی ٹوڈرمل دندناتی ہوئی زینے سے اتریں"

"کہاں ہے بے کنیا کے بچے! نیچے اتر" ان کا بیٹا رام ناتھ

باپ کے اثر سے حاصل کی ہوئی شان میں اکڑتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے اترا۔ وہ خاکی کپڑے پہنے، ہنٹر، پستول اور سیٹی وغیرہ سے باقاعدہ لیس تھا۔

"تھانے دار صاحب مجھے معاف کیجئے"، پربھا خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگا۔

"ابے اترتا ہے نیچے کہ نہیں حرامی۔ یاد رکھ کھال کھنچوالوں گا"، تھانیدار صاحب زور سے چیخ کار ے۔

"اچھا تھانیدار جی بہت اچھا"، پربھا نے کہا۔ لیکن وہ ابھی تک ہچکچا رہا تھا کہ لوگوں سے اپنے سامجھی کی دھوکہ بازی کا حال کہے۔ یا نہ کہے۔

"اچھا تو نہیں اترے گا۔ اچھی بات ہے۔ بلاتا ہوں سپاہیوں کو"

"معاف کرو۔ ارے مجھے معاف کرد"، پربھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "میں تو ایک غریب قلی ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ گنپت مجھے اس طرح دھوکا دے جائے گا"

"اچھا تو اب تجھے اپنی اوقات معلوم ہوئی"۔ توند والے سیٹھ جی بولے۔ "بڑا سیٹھ بنا پھرتا تھا"،

"چلو اس کو نکال باہر کریں اور فیکٹری میں تالا ڈال دیں"۔ لمبوترے منہ والا بولا۔ "شاید سامان ہی بک کر ہمارا کچھ روپیہ مل جائے"،

"پہلا حق میرا ہے"۔ لیڈی ٹوڈرمل بولیں۔ "اتنے برسوں سے میں دھوئیں کی مصیبت بھگت رہی ہوں۔ یہ پہلے میرے پتی کا روپیہ ادا کردے"

"چلو پربھ دیال فیکٹری اور کمرے کا کرایہ رکھ دو"، ایک سیاہ رنگت۔ بندر ایسی شکل کا آدمی، کھلے کالر کی قمیص، سفید پتلون، سیاہ کوٹ، پاؤں

میں سیاہ جوتے اور سر پر انگریزی ہیٹ پہنے بھیڑ میں داخل ہوا۔

"بابو دیودت کو جگہ دو" ایک عورت بھیڑ میں سے بولی۔ چاروں طرف بچوں، عورتوں اور مردوں کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا تھا۔

"بابو جی میں ادا کر دوں گا" پربھا نے مالک مکان کے آگے ہاتھ جوڑے "اپنی ہڈیاں گھس گھس کر آپ کا کرایہ چکا دوں گا"

"تمھاری بات کا کیا بھروسہ۔ تم دیوالیہ ٹھہرے"

"اچھا ٹھہرو بابو جی تمھارا روپیہ ابھی دیا" پربھا اندر بھاگا کہ اپنی بیوی کا زیور لا کر ضمانت کے طور پر دے دے۔

اسی دم دو پولیس کے سپاہی، ایک سکھ اور دوسرا مسلمان، خاکی وردی پہنے، لال نیلے صافے باندھے، بھیڑ میں گھس آئے۔ اور لوگوں کو چھڑیاں مار مار کر انگریز انسپکٹر پولیس اور ٹوڈرمل کے لڑکے کے لئے رستہ صاف کرنے لگے۔ وہ دونوں ہی اس وقت بڑی شان سے چل رہے تھے۔

"پربھا کہاں ہے؟" تھانیدار صاحب نے پکارا

"غائب ہو گیا نمک حرام" لیڈی ٹوڈرمل نے اپنے سینہ پر ساری کا پلو کھینچتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ نہایت لجاجت کے ساتھ اندر کمرے میں چلی گئیں تاکہ انگریز انسپکٹر پولیس کو معلوم ہو کہ تھانے دار کی ماں اور سر ٹوڈرمل کی بیوی کی حیثیت سے وہ نہایت ہی مہذب ہیں۔

"نتجا سنگھ، یار محمد! جاؤ اسے گھسیٹ کر لاؤ" تھانے دار صاحب نے حکم دیا۔

پربھا مع اپنے نوکروں کے ادھر ہی آ رہا تھا، اور فیکٹری کا دروازہ کھلنے ہی والا تھا کہ پولیس کا سٹبل اندر در آئے۔

"نکل بے سؤر، نکل بے کتے"۔ اور انھوں نے اندھا دھند اپنا ہنٹر چلا کر پربھا کی گردن میں ہاتھ دیا۔

جب وہ پربھا کو منوا اور تلسی کی گرفت سے چھڑا کر پیچھے سے لاتیں اور ٹھوکریں مارتے، گھسیٹتے ہوئے باہر لائے تو قرض خواہوں میں غل مچ گیا۔

"نکالو باہر اسے۔ لیچھ پہاڑی۔ باہر دھکیلو اسے، گندہ کہیں کا"

"اسے فوراً پولیس اسٹیشن لے جاؤ" انگریز انسپکٹر پولیس پربھا کو مشکوک نگاہوں سے دیکھ کر جلدی سے بولا "بدمعاش معلوم ہوتا ہے"

"ہوں صاحب دس نمبری ہے" تھانیدار صاحب بولے، اور پھر انھوں نے مڑ کر اپنی ماں سے ہندستانی میں کہا "میرے آنے تک فیکٹری میں تالا ڈال کے رکھنا"۔ پھر وہ تمام قرض خواہوں سے مخاطب ہوئے۔

"کل تم سب کو توالی آنا۔ تمھاری گواہی لی جائے گی۔ اب اپنی اپنی دوکانوں کو جاؤ۔ ہم اس سے سمجھ لیں گے"

"جی جناب! بہت اچھا تھانیدار صاحب" بنیوں نے انگریزی سرکار کے اس شاندار نمونے کے سامنے جھکتے ہوئے کہا۔ تھانیدار سے زیادہ وہ دنیا میں کسی سے نہ ڈرتے تھے۔

رنجیت سنگھ اور یار محمد پتلی گلی میں سے پربھا کو گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ چاروں طرف لوگ کھڑے آپس میں گھسر پھسر کر رہے تھے۔ اور جبر اور تشدد کے اس شاندار مظاہرے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

پربھا کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ڈھلک ڈھلک کر گالوں پر بہہ رہے تھے اور وہ مڑ مڑ کر اپنی بیوی کو دیکھتا جا رہا تھا، جو کھڑکی میں کھڑی رو رہی تھی۔

"سیدھا کیوں نہیں چلتا سور، سامنے دیکھ۔ کوتوالی کی طرف منھ کر۔"

تھانے دار صاحب اپنے سپاہیوں اور انسپکٹر سمیت ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ منو، تلسی، بونگا مہاراج پیچھے پیچھے تھے۔ منو رو رہا تھا، تلسی زرد پڑ گیا تھا مگر بالکل خاموش تھا، بونگا آنکھیں پھاڑے آگے کو تکے جا رہا تھا۔ اور مہاراج بس چلا جا رہا تھا، جیسے کوئی مشین چل رہی ہو۔

جب یہ قافلہ محلہ بلی ماروں سے گذر کر گھنٹہ گھر کے پاس سے ہوتا ہوا کتاب بازار کے راستے کوتوالی کی طرف چلا تو راہگیر اور دکان دار سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگے، بعض تو حیران تھے اور بعض دھیرے دھیرے آپس میں کانا پھوسی کر رہے تھے، کچھ بڑبڑا رہے تھے، تو کچھ اس شخص کو گالیاں دے رہے تھے جسے کبھی سیٹھ جی سیٹھ جی کہہ کہہ کر ان کا منھ سوکھتا تھا۔

کوتوالی میں، ایک گورا سا مسلمان سرجنٹ، طوطے کی ایسی ناک چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

"ہنسے خاں"۔ تھانیدار صاحب نے حکم دیا "اس شخص سے اقبالِ جرم کرواؤ۔ عدم ادائیگی قرض میں گرفتاری ہوئی ہے"

سرجنٹ ایک دم سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے افسروں کو سلام کیا اور دوسری طرف برآمدہ والے کمرے میں جا کر ایک بید لایا۔

"چل بدمعاش"۔ اب وہ پربھا کے قریب آیا۔ یدھمد اور

یتجا سنگھ اب تک اُسے پکڑے کھڑے تھے۔

"قبول! تو نے روپیہ کہاں گاڑ کر رکھا ہے۔ چل قبول"

"حضور"۔ پربھا نے ہاتھ جوڑے "میرے پاس کہیں روپیہ نہیں گڑا ہے۔ لیکن میرے پاس سامان ضرور ہے۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ اپنے قرضخواہوں کو ایک ایک پائی چکا دوں گا"

"کیوں جھوٹ بھونکتا ہے، جھوٹا، مادر ... ..." بندے خان پھنکارا "سچ سچ قبول دے" اور اس نے ایک دو تین بیدیں پربھا کو لگائیں۔

"میں نے سچ کہا ہے حضور" پربھا دھاڑیں مار رہا تھا "میں جھوٹ نہیں بولتا"

"ہاں ہاں تو تو بڑا فرشتہ ہے نا۔ شیطان کا بچہ" سرجنٹ نے پربھا کے منہ پر ایک مکا مارا

"سچ ہے سرکار۔ میں سچ کہتا ہوں سرکار" پربھا نے اپنے ہتھکڑی لگے ہاتھ اپنے کو بچانے کے لئے بلند کئے۔

"تو پھر تھانیدار صاحب جھوٹ بول رہے ہیں" سرجنٹ غرایا۔ "سؤر کہیں کا۔ اور انسپکٹر صاحب بھی جھوٹے ہیں۔ کتا! چل قبول"

اور اس نے اپنے ہونٹ بھینچ کر، چہرہ سکوڑ کر، ہنٹر پر ہنٹر لگانے شروع کئے۔ اس کا بھاری بھرکم جسم، پربھا کے کمزور وجود پر بالکل چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

"ارے مت مارو۔ ارے اسے کیوں مار رہے ہو۔ قصور تو سارا
گنپت کا ہے" منو اور تلسی ... ...
سرجنٹ سانس لینے کے لئے رکا
"مارو۔ ایسے مارو" انگریز افسر پکڑنے پیچھے سے سرجنٹ
کو ایک بید لگا کر بتایا۔ اور پھر وہ ان لڑکوں کی طرف مڑا جو پاس ہی کھڑے تھے
اور اپنے مالک کو پٹتا دیکھنے کے ساتھ صاحب کے سفید چمڑے کو بھی گھور
گھور کر دیکھ رہے تھے۔
"جاؤ" وہ زور سے گرجا
"بھاگو یہاں سے، بھاگو یہاں سے سور" تھانے دار حلق پھاڑنے
لگا۔ "بھاگو یہاں سے، یہ کیا کوئی میلہ ہے" اور اس نے ان کی ننگی پیٹھوں
پر تڑا تڑ اکر دو چار بیدیں رسید کر دیں۔
"ارے حضور مارنا ہو تو مجھے مارو" پربھا چیخا "جتنا دل چاہے
مجھے مار لو، پر ان لڑکوں کو چھوڑ دو"
"چپ رہ سور" سرجنٹ نے چھڑی گھما کر کہا "تو اپنی خیر منا
ان کی فکر نہ کر، تیری وجہ سے مجھ پر بھی بید پڑی۔ اب لے یہ لے" اور پھر
اس نے پربھا پر تڑا تڑ بیدیں برسانی شروع کر دیں۔ اب فضا میں صرف
بید کی شوں شوں سنائی دے رہی تھی۔
پربھا کے دھاڑنے کی آواز میں کھنچاؤ پیدا ہو گیا "ارے بھگوان
اے میرے بھگوان! اے بھگوان تو کہاں ہے؟"
منو، تلسی، بونگا اور مہاراج کبھی اپنے مالک کی طرف دیکھتے
اور کبھی کھلے صاف ستھرے آسمان کو تکنے لگتے۔ ان کے دل رنج سے بھر گئے تھے۔

لیکن آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔ نہ دل کے درد کو دبا سکتے تھے نہ دکھا سکتے تھے۔

جب وہ گھر واپس آئے تو ایسا لگتا تھا کسی کی میت سے ہو کر آئے ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا پربھا کو دفنا کر لوٹے ہیں۔ جب وہ صحن سے ہو کر اس لمبے تاریک کمرے میں داخل ہوئے تو ان کے ایک ایک قدم کی چاپ گونجنے لگی۔ خاص کر احمق مہاراج اور بونگا کے سپاٹ تلوے دھم دھم کر رہے تھے۔ تمام فضا پر مالکن کے آنسوؤں کا غم واندوہ چھایا ہوا تھا۔

"مہاراج اور بونگا تم لوگ بیٹھ جاؤ"، تلسی نے کسی قدر ضبط سے کام لے کر کہا

منو دبے دبے اس کھڑکی کی طرف گیا جو گلی میں کھلتی تھی اور جہاں پربھا کی بیوی پڑی تھی۔ لیکن ابھی وہ آدھی ہی دور گیا تھا کہ تھم گیا۔ اس عورت پر جو غم واندوہ چھایا ہوا تھا اس نے جیسے منو کے پیر پکڑ لئے۔

بچپن میں منو اکثر باہر سے کھیل کر آتا اور اپنی ماں کو روتا دیکھتا تو فوراً ڈر کر اس سے لپٹ جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسی طرح کے جذبہ کے تحت چلا تھا، لیکن کسی چیز نے اُسے روک دیا۔ اس میں کچھ تبدیلی ہو گئی تھی اب اس میں وہ بچپن کی معصومیت اور بے پروائی نہ رہی تھی۔ اب وہ اپنے احساسات اور جذبات کو سمجھنے لگا تھا۔ اور اس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ مالکن کے پاس جائے۔

"میں استاد گنپت کے پاس جاتا ہوں۔ دیکھوں شاید وہ آکر استاد پربھا کو ضمانت دے کر چھڑا لیں"۔ تلسی نے منو کے پاس آکر کہا۔

منو نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور چہرہ سکوڑ لیا۔

"چلو اے مہاراج اور بونگا"، تلسی نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "تمھیں تھوڑی تازی ہوا کھلا لاؤں"، اس کے لہجے سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ ننھے بچے ہیں اور کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ ہارے جی سے وہ دونوں اٹھے اور اس کے ساتھ ہو لئے۔

اب منو کمرے میں اکیلا رہ گیا تھا۔ مالکن کی سسکیاں اور ہچکیاں فضا پر چھا گئی تھیں اور منو کو چاروں طرف کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایک لحظہ کے لئے مکمل خاموشی چھا جاتی تھی، ایک عجیب سا کھنچاؤ اور بے چینی فضا میں پھیل جاتی تھی۔ پھر دبی ہوئی سسکیوں کی آواز آنے لگتی تھی، جس میں درد بھری لہریں پنہاں ہوتی تھیں۔ منو کو ایسا لگا کہ ایک ذرا سی بے موقع آواز یا بات یا اشارہ ہوا کہ طوفان پھٹ پڑے گا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑا کر کمرے کی چیزوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ایک کونے میں پیتل کے صاف مانجھے ہوئے برتن رکھے چمک رہے تھے، دو مٹی کے گھڑے تھے جن پر کچھ ایسے پیچیدہ بیل بوٹے بنے ہوئے تھے کہ منو کی سمجھ ہی میں نہیں آئے۔ الگنی پر دریاں، چادریں وغیرہ ٹنگی تھیں۔ ایک آم کے نونے کی چھینٹ کا لحاف بھی تھا۔ منو کو اس وقت وہ آم بہت ہی برے لگے، پھر یکایک ایک سسکی پھوٹ پڑی اور منو کو چونکا دیا۔

وہ بمشکل تمام اپنی مالکن کے پاس گیا اور اس کے بالکل پاس پہنچ کر سر جھکا کر کہنے لگا۔ "اٹھو بس اب اٹھ جاؤ"۔

اب تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہمدردی کے اس اظہار سے غم کا رکا ہوا دھارا پھوٹ پڑا۔

منو اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اور اس کے بازوؤں کو پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"اٹھو اب، اٹھو تو سہی"

وہ اور بھی زیادہ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ارے بیٹا میں کہاں جاؤں"۔ وہ کہتی جا رہی تھی "ہائے میں کیا کروں" آہستہ آہستہ اس نے اپنا سر منو کے کندھے پر ڈھلکا دیا۔ منو کو اپنی گردن پر اس کی سانس کی گرمی محسوس ہوئی اور اس کے نرم گالوں کا لمس منو کے جسم سے ہوتا ہوا دماغ میں پہنچ کر طوفان بپا کرنے لگا۔ اس کا جسم تن گیا اور بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ اس کے بدبداتے ہوئے ہونٹوں نے کسی بھلائی ہوئی یاد کو منو کے دل میں پھر تازہ کر دیا، وہ یاد جس کے وہ کبھی کبھی خواب بھی دیکھا کرتا تھا۔ اس نے اپنی مالکن کے آبنوسی چہرہ کو دیکھا سیاہ بال جو اس کے ماتھے اور سیاہ ابروؤں کے خطوط پر بکھرے ہوئے تھے۔ آج ان میں روزانہ کی طرح زرد پھول نہیں سجے تھے۔ گالوں کی ابھری ہوئی ہڈیوں پر رونے سے سرخی آ گئی تھی۔ اور اس سرخی کی وجہ اس کی سیاہ آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو روشنی کے دو عمیق گڑھے معلوم ہو رہے تھے اس کے لب ذرا سے کھلے تھے۔ جبڑوں سے کسی قدر ہمت ٹپکتی تھی۔

منو کے دل میں یکایک ان دنوں کی یاد تازہ ہو گئی جب وہ بیمار تھا اور مالکن نے اس کی تیمارداری کی تھی گلے لگایا تھا، اس کی پیشانی چومی تھی اور پہاڑی گیت گا گا کر اس کا دل بہلایا کرتی تھی، منو نے اُسے بھینچ کر گلے لگا لیا اور محسوس کیا کہ وہ کانپ رہی تھی اب منو کی خاموش گھبراہٹ کسی قدر کم ہو گئی اور اُسے ذرا اطمینان ہوا، کچھ عرصے

کے لئے وہ اس کی نرمی اور گرمی میں ایسا کھو گیا کہ چاروں طرف صرف تاریکی سی نظر آتی تھی۔ اس کے دل میں محبت کا جوش ایسا امنڈا ایسا امنڈا کہ اس کا دم بند ہونے لگا اور اس آگ سے اس کے آنکھوں سے گرم گرم آنسو اُبل پڑے ایسا رنج ایسا صدمہ ایسا غم اس نے اپنی عمر میں کبھی نہ اٹھایا تھا۔

"روؤ نہیں۔ بس بس روؤ نہیں" وہ اپنی مالکن سے کہہ رہا تھا

"تو نہ رو میرے بچے! تو نہ رو میرے لال۔ تو کیوں روئے" مالکن اس سے کہہ رہی تھی۔

پھر قدموں کی دھم دھم سنائی دی اور دور اندھیرے میں سے قدموں کی مسلسل دھم دھم کے ساتھ آوازیں بھی آنے لگیں۔

لیکن منو اور اس کی مالکن برابر روتے جا رہے تھے۔

"اے منو! دیکھ تو سہی استاد پربھا لوٹ آئے" تلسی کی آواز آئی۔

"تم دونوں کیوں روتے تھے! تم کیا سمجھے کہ میں مر گیا" اور وہ دروازے کے پاس چارپائی پر دھم سے بیٹھ گیا۔ اس کی آواز میں بڑی تھکن تھی اور اس کا چہرہ پیلا ہلدی ہو رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔

"تو ان لوگوں نے آپ کو رہا کر دیا" منو پربھا کے پاس آ کھڑا ہوا

"ہاں ہاں ان لوگوں کے پاس تھا ہی کیا۔ کچھ میری گرفتاری کا وارنٹ تو تھا نہیں" وہ منو کے بجائے اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا ——— میں دیوالیہ تو ہو چکا، اور اب مجھے ہر ایک کا کم از کم آدھا روپیہ ضرور چکانا ہوگا۔ لیکن پولیس نے مجھے ناحق ہی مارا ——— ہائے میری ہڈیاں کیسی دکھ رہی ہیں۔ کوئی لحاف یا کمبل ہو تو مجھے اڑھا دو،

اور پھر وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔

جب وہ اس حالت میں پڑا تھا تو چوٹ کے نیل اور بدھیاں اس کے کرتے اور دھوتی سے، جو تار تار ہو گئے تھے، صاف نظر آ رہی تھیں اور زخموں میں سے ایک سڑاندسی پھوٹتی ہوئی لگتی تھی۔

پربھا کی بیوی دوڑ کر سرھانے پہنچ گئی تھی۔ اس کا بدن دباتی جاتی تھی اور منھ پھیر پھیر کر پلو سے آنسوؤں کو روکتی جاتی تھی۔

منو نے کمبل اور لحاف لا کر اڑھائے اور تلسی ڈاکٹر کو بلانے گیا جو کوچہ بلی ماروں کے نکڑ ہی پر رہتا تھا۔ جب ڈاکٹر آ کے چلا گیا تو منو اور تلسی مرہم اور دوائیں لینے صدر بازار کے دواخانے کو چلے۔

وہ دونوں کے دونوں خاموشی کے ساتھ بزازے کی اونچی نیچی تاریک سڑک سے ہوتے ہوئے ایک پتلی سی گلی میں مڑے یہاں سے دو پتلی سی گلیاں اور نکلتی تھیں، اور ایک سنت داس کے مندر اور دوسری گرجا گھر کو جاتی تھی۔ وہاں سے وہ دونوں ٹاؤن ہال والی سڑک پر ہوتے ہوئے اورنگ زیب کی مسجد کے پاس سے گزر کر صدر بازار میں نکل آئے۔ یہ بازار خوب لمبا چوڑا تھا اور یہاں کی ہندستانی دکانیں انگریزی مکانات کی وضع پر بنائی گئی تھیں۔ دونوں کے دل میں یہ خیال موجزن تھا کہ جانے مالک بچیں گے یا مر جائیں گے اور دونوں سر جھکائے جلدی جلدی چلے جا رہے تھے۔

لیکن واپسی کے وقت ان کے دل امید سے بھرے تھے، کیونکہ پاری دوا فروش سہراب جی نے جو دوائیں انھیں دی تھیں وہ بہت اچھے طریقے سے لپٹی ہوئی بڑی بھاری بھرکم لگ رہی تھیں۔ اور دونوں کی پریشانی کسی قدر کم ہو گئی۔

"بونگا اور مہاراج کہاں ہیں"۔ منو نے پوچھا "وہ لوگ تمہارے ساتھ تو واپس نہیں آئے؟"

"ماسٹر گنپت نے انھیں اپنی فیکٹری میں رکھ لیا" تلسی نے جواب دیا "پہلے تو ان کو خوب گالیاں دیں اور پھر ڈرایا دھمکایا کہ یہاں رہو۔ تو وہ لوگ ایسا ڈرے کہ وہیں رہ گئے"

منو چپ رہا، اُسے گنپت سے نفرت تھی۔ لیکن تمام دن کے واقعات سے وہ ایسا چور ہو گیا تھا کہ گنپت کے متعلق نفرت کے اظہار کی بھی اب سکت باقی نہ تھی۔ وہ اندھیرے میں چلتا رہا جیسے کہیں خلا میں تیر رہا ہو۔ لیکن کبھی کبھی [illegible] کے حقے سے ایک آدھ چنگاری نکلتی دکھائی دیتی اور چنگاری کی روشنی میں کوئی مزدور اپنے ہاتھ کا یا دکان کے تختے کا تکیہ لگائے کنڈلی مارے سویا ہوا نظر آتا تو منو چونک پڑتا اور غور کرنے لگتا کہ یہ کون ہوگا۔

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ اسے [illegible] کو چھڑا لیں تو ہم کو بھی دھان منڈی میں جا کر اسی طرح سونا ہوگا کہ صبح ہی صبح بوجھا ڈھونے کی مزدوری مل سکے" تلسی اپنے ساتھی کے دل کی حالت کو پہچان کر کہنے لگا۔

پھر دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا۔

دوا پینے کے بعد مالک کو اچھی طرح نیند آ گئی، پسینہ بھی آیا اور سانس کی آمد و رفت بھی بخوبی ہونے لگی۔ اس کی بیوی ابھی تک سرہانے بیٹھی تھی۔ منو اور تلسی کو اطمینان تھا کہ وہ رات بھر اسی طرح بیٹھی رہے گی لہٰذا وہ دونوں دھان منڈی میں سونے کا ارادہ کر کے رات کی تاریکی

میں باہر نکل آئے۔ دھان منڈی میں بوجھا ڈھونے کا کام نسبتاً آسانی سے مل جایا کرتا تھا۔

کوچہ بلی ماروں سے نکل کر وہ پادھم بازار پہنچے جہاں رات دن والوں، مصالحوں اور سڑے ہوئے پنیر کی بو پھیلی رہتی ہے۔ پھر وہ بانس بازار میں داخل ہوئے جو خوب پھیلا ہوا تھا، اور سنتوک سنگھ کے دھرم شالے کے پاس سے گذر کر نمک بازار میں آ گئے۔ یہاں پر دین دار ہندو اپنی دوکانوں کے آگے نمک کے بڑے بڑے ٹکڑے رکھ دیا کرتے تھے۔ اور شہر کے بیل ادھر ادھر سے آکر ان ٹکڑوں کو چاٹا کرتے تھے۔ اب دھان منڈی کوئی سوگز پر رہ گئی تھی۔ بیچ میں ہنومان اسٹریٹ پڑتی تھی۔

گلیوں اور سڑکوں پر گرمی کی گھٹن تھی، چاند اندھیرے راستوں پر اپنی مدھم روشنی پھیلا رہا تھا اور وہ دونوں اندھوں کی طرح چلے جا رہے تھے۔ نیند آنکھوں میں بھری تھی۔ بدن تکان سے چور چور تھا اور انھیں صرف ایک ہی خیال تھا کہ کہیں پڑ رہیں، لیکن رات کا سناٹا کبھی کبھی ٹوٹ بھی جاتا تھا، کہیں سے کسی دمے کے مریض کے کھانسنے کی آواز آتی تھی، وہ اپنے چوباروں یا چھتوں پر سے جھکتے اور بلغم کے پٹاخے چھوڑتے جاتے۔ کسی مندر کے احاطے سے جھینگروں اور تیل چٹوں کی آواز ایک دم آتی، جیسے بجلی کڑک جائے۔ کہیں کوئی بھوکا کتا [illegible] بادل کی طرح گرجنے والی ڈکار سے نیند سے چونک کر بھونکنے [illegible] کم بخت بلی کتے کے ڈر کے مارے چیخنے لگتی۔ اس کے علاوہ بھوت [illegible] خوف تھا کہتے ہیں وہ بھی رات کے وقت اپنے گھروں کو دیکھنے آیا کرتے ہیں۔ دونوں لڑکوں کا دم گھٹنے لگا۔

کیچڑ بھری ہوئی سڑک کا آخری گڑھا پار کرنے کے بعد وہ دھان منڈی کے پتلے پیچیدہ نکڑ پر پہنچ گئے۔ لیکن یہاں تو اور بھی گھٹن اور بھیڑ بھڑکا تھا۔ بیچ میں ایک بڑا سا چوکور صحن تھا اور آس پاس کچی مٹی کی دکانیں تھیں، پھوس کے جھونپڑے تھے۔ پانچ منزلہ حویلیاں بھی تھیں جن کا کچھ حصہ سیمنٹ کا بھی تھا، کچھ ستون، محرابیں اور در بھی تھے۔ صحن میں چاروں طرف لکڑی کی گاڑیاں ایسے کھڑی تھیں کہ ان کے اوپر اُٹھے ہوئے جوئے بالکل صلیب کی مانند نظر آرہے تھے۔ بہت سے موٹے موٹے بیل اور بھینسے جن کے سینگ سانپ کی طرح بل کھائے ہوئے تھے اور بہت سے دبلے سوکھے مریل بچھڑے اپنے ہی گوبر میں پڑے تھے یا کھڑے ہوئے گھاس کھا رہے تھے یا یوں ہی اپنی تھوتھنیاں ہلا رہے تھے یا جگالی کر رہے تھے۔ ان ہی سب کے درمیان بہت سے قلی بھی تھے۔ اسی مٹی کی سی رنگتیں جس پر وہ پڑے ہوئے خراٹے لے رہے تھے یا دو چار مل کر کسی طرف حقہ پی رہے تھے۔ یا کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں گندگی نہ ہو کہ سو سکیں نالیوں کی سڑی ہوئی بو، سڑے اناج کی بو، تازہ گوبر اور پیشاب کی بو، انسانوں اور جانوروں کے سانس کی بو، اُپلے جلنے کی بو، ان سب نے مل کر احاطے میں ایک ایسی پریشان کن فضا پیدا کر دی تھی کہ یا تو انسان اسے سونگھتے سونگھتے اس کا عادی ہو جائے یا پھر اس کا دھیان ان ننگے جسموں سے بچنے میں بٹ جائے جو یا تو پسینہ سے چمکتے ہوتے تھے یا کفن پوش مردوں کی طرح مچھروں سے بچنے کے لئے سر سے پاؤں تک چادریں اوڑھے پڑے رہتے تھے۔ رات کے اندھیرے میں مکھیاں اور مچھر بھوت بلاؤں کی طرح چاروں طرف چھائے رہتے تھے۔

ابھی تلسی اور منو چوک میں داخل ہی ہوئے تھے کہ مچھروں نے ان پر حملہ کیا، اور وہ اپنے ننگے بازوؤں اور ٹانگوں پر تھپڑ مارنے لگے

"ارے یہ مچھر بٹی ... "

"یہ کون گالی بک رہا ہے" قلیوں کے ایک گروہ سے ایک تیز آواز آئی۔ منو اور تلسی کچھ گھبرا گئے۔ کیونکہ انھوں نے بالکل لاشعوری طور پر گالی بکی تھی۔

"ہم کسی کو گالی نہیں دے رہے ہیں۔ ان مچھروں کو کہہ رہے ہیں" تلسی بولا۔

"تم ہو کون؟" آواز نے پوچھا

"قلی ہیں" منو نے جواب دیا۔ اس نے اپنی آواز میں ذرا بے تکلفی پیدا کر لی تھی، کیونکہ اسے خیال تھا کہ تلسی کے ململ کے کپڑوں سے کہیں یہ لوگ بھڑک جائیں، تو اس کا اتنا ننگا بدن اس کی تلافی کر دے۔

"یہاں اب کسی کے لئے جگہ نہیں" اس کا سیاہ جسم آبنوس کی طرح چمک رہا تھا اور وہ مچھروں سے بچنے کے لئے میٹھا تیل مل رہا تھا۔

اور یہ واقعہ بھی تھا کہ وہاں قطعی جگہ نہ تھی۔ پہلے ہی قطار در قطار قلی، چادریں تانے دوکان کی سیڑھیوں اور تختوں پر سر رکھے، لاشوں کی طرح یہاں سے وہاں تک سو رہے تھے۔ ایک بیل گاڑی کے آس پاس گھیرا باندھے کوئی پندرہ لاشیں سو رہی تھیں۔ منو اور تلسی اس گورکھ دھندے میں سے پھسلتے نکلتے ہوئے احتیاط کے ساتھ دوسری طرف نکل آئے جہاں اناج کی بہت سی بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہاں کسی قدر امن معلوم ہوتا تھا۔

"کون ہے۔ چور ہو تو ہوشیار ہو جاؤ"، ایک چوکیدار نے آواز دی، وہ تھوڑی ہی دور پر اپنی بانس کی چارپائی پر لاٹھی لئے لیٹا تھا۔

"ہم قلی ہیں"، منو نے جواب دیا

"چلو چلو۔ اس دکان کے پاس سے کھسکو۔ لالہ ٹوٹا رام کا حکم ہے کہ یہاں کسی قلی کو نہ پھٹکنے دیا جائے۔ اس دکان کے اندر تجوری ہے۔"

"اچھا مہاراج"، تلسی نے جواب دیا۔ اور آگے آگے چلنے لگا اسے امید تھی کہ کہیں نہ کہیں پڑ رہنے کی جگہ تو مل ہی جائے گی۔ چاروں طرف آدمی ہی آدمی پڑے تھے، سینکڑوں آدمی ——— کبھی کروٹ بدلتے تھے۔ کبھی چپکے چپکے باتیں کرتے تھے۔ کبھی کھانستے تھے، کبھی آہیں بھرتے تھے۔ گرمی تھی کہ کسی چڑچڑے اور ضدی دیوتا کی طرح فضا پر چھائی تھی۔ قلیوں کے اس عجیب طرح پر سونے اور بار بار کراہ کر "رام رام، سری کرشنا اور ہری ہر" کہنے پر منو کو بڑا غصہ آیا۔ ویسے تو وہ سب عمر میں منو سے بڑے تھے ادھیڑ اور بوڑھے، ایسے ہی لوگ تو خدا کو یاد کرتے ہیں لیکن جب سے منو نے ایمان اور خدا ترس پربھا کی وہ گت دیکھی تھی تب سے خدائے عزوجل کے متعلق اس کی نیک رائے قطعی بدل گئی تھی۔

منو، تلسی کو گھسیٹ کر بیچوں بیچ بازار میں لے گیا جہاں اناج کی بہت سی بوریاں ایک جگہ گنجی تھیں۔ اور ان پر ایک بڑا سا کینوس ڈھکا ہوا تھا۔

پہلے تو اس نے چپکے سے چاروں طرف نظر دوڑا کر اطمینان کر لیا کہ کوئی چوکیدار تو نہیں ہے۔ پھر اس نے بوریوں کے آس پاس پاؤں ٹکانے کی جگہ ڈھونڈنی شروع کی۔ جب جگہ نہ ملی تو اسے کسی ایسی چیز کی تلاش ہوئی جس کے سہارے چڑھا جائے۔ کچھ گز کے فاصلے پر ایک لمبا سا بانس رکھا تھا مگر مشکل

یہ تھی کہ اس بانس کے سرے پر کسی بنئے کے کبوتر کی چھتری تھی۔ منو بانس کی طرف چلا ہی تھا کہ تلسی نے اُسے روک لیا۔

"میں نیچے گھوڑا بنتا ہوں، تو میری پیٹھ پر کھڑا ہو کر اوپر چڑھ جا اور پھر مجھے کھینچ لینا" یہ کہہ کر تلسی جھک گیا۔ منو پھرتی سے تلسی کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی پر اپنا توازن قائم کر کے ڈھیر پر چڑھ گیا۔ پھر اس نے بوریوں میں اپنے پیر گاڑے اور ماتھے سے پسینہ پونچھا اور ہاتھ نیچے ٹکا کر تلسی کو اوپر کھینچا۔ اس کے جسم کا ایک ایک عضلہ تن گیا، لیکن ڈھیر کے اوپر ہوا کے گرم گرم جھونکے برابر آ رہے تھے اور اس کے جسم کو آسودگی سی محسوس ہوئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا کہ شاید کسی چوکیدار نے اُسے اور تلسی کو دیکھ لیا ہو اور نیچے اترنے کا حکم دے دے لیکن وہاں تو چاروں طرف صرف لاشیں ہی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ کچھ چت پڑی تھیں، کچھ کروٹ کے بل، کچھ پیٹ کے بل کم از کم جگہ چھینکنے کے خیال سے سکڑی ہوئی جیسے دکھ کی گٹھریاں بندھی رکھی ہوں اور قدرت سے ایک جھپکی کی بھیک مانگ رہی ہوں۔

"تمھیں نیند نہیں آ رہی؟ سوتے کیوں نہیں" تلسی نے منو سے پوچھا۔ وہ خود دن بھر کی تکان کے بعد نیند سے باؤلا ہو رہا تھا۔

"ہاں سوتا ہوں، لیکن وہ آنکھیں پھاڑے دیر تک خلا کی تاریکی میں دیکھتا رہا، اور غیر شعوری طور پر چاروں طرف کی آوازیں سنتا رہا ——— نیم بے ہوش لوگوں کی آہیں، کہیں سے کسی حقہ کی گڑگڑاہٹ، کسی مینڈک کا ٹرانا، کسی مکھی کی بھن بھن!

اس نے اپنے دل سے بھی پوچھا کہ کیا دیکھ رہے ہو منو؟ جواب ملا کچھ نہیں۔ وہ چت لیٹ گیا۔ اناج کی بوری کی سطح گول مٹول مگر آرام دہ تھی،

آسمان بھورا مائل نیلا ہو رہا تھا، اور چاند اس کا کلیجہ پھاڑ کر نور کی چند کرنیں نیچے پھینک رہا تھا۔ منو نے اپنی آنکھیں [illegible] اور اس کو اپنے مالک کے گھر کی چھت دکھائی دینے لگی، کئی پلنگوں کی قطار میں اپنا پلنگ بھی بچھا ہوا نظر آنے لگا۔ اور وہ سوچنے لگا کہ آج میں یہاں ہوں۔ پربھا وہاں بیمار پڑا ہے۔ گنپت شہر کے کسی اور حصے میں ہے۔ مہاراج اور بونگا بھی نئے کارخانے میں سوتے ہونگے مالکن ہمیں یاد کرتی ہوگی، شاید روتی بھی ہو، ہم وہاں سے کیوں آ گئے۔ ہمیں مالک اور مالکن کے پاس ہی رہنا چاہیئے تھا۔ اگر کہیں مالک مر جائیں تو۔ لیکن مالک کی موت کا تو وہ تصور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں اور میچتے ہی سو گیا۔

وہ بڑی بے چین سی نیند سویا۔ کبھی اپنی مٹھیاں بھینچتا جیسے ڈوبتا ہوا کسی تنکے کا سہارا لے رہا ہو۔ اِدھر اُدھر کروٹ لینے میں بدن دکھ رہا تھا۔ لمبی لمبی شاخوں سے ننھے پھول جھول جاتے تھے، دو ایک بار نیند ہی میں کراہا بھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس کی روح کا سیدھا خط متواتر پریشانیوں میں پھنس کر ایک الجھا ہوا گچھا بن گیا تھا اور اب سیدھا ہو رہا ہے۔ جب رات کی گرمی اور گھٹن صبح کی خنکی میں تبدیل ہوئی تو منو کے جسم کو آسودگی ہوئی اور وہ ایک بوری کو ایسا لپٹ گیا۔ جیسے وہ کسی جوان عورت کا نرم گرم جسم ہو۔

صبح کو جلاہوں کی گلی کے مرغوں کی بانگ، چڑیوں کے غول کی چہچہاہٹ اور کوؤں کی مسلسل کائیں کائیں بھی منو اور تلسی کو بیدار نہ کر سکی۔ ہاں دوسرے قلی، بیل، لنگڑے اپاہج کتے اور دیندار ہندو ضرور جاگ اٹھے، آخر سورج نے اپنی کانپتی ہوئی گرم آہنی سلاخیں منو کے ننگے جسم میں پیوست کرنی شروع کیں اور وہ اٹھ بیٹھا، اس کا منہ خشک ہو گیا تھا، آنکھیں چپک گئی

تھیں اور ہاتھ پاؤں میں کسک تھی۔ اس نے آہستہ سے تلی کو ٹھیلا۔ صبح کے زرد اور سرخ آسمان کی روشنی میں جو سارے بازار میں پھیل گئی تھی، منو کو اپنا جسم بہت ہی گندہ اور سیاہ دکھائی دیا۔

"اٹھ رے۔ اٹھ تو" اس نے چڑچڑا کر کہا اور اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ تلی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

منو نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں سے اور کس بات سے شروعات کرے۔

کچھ تلی، اناج کے بورے دو بھری ہوئی بیل گاڑیوں سے اٹھا کر ایک گودام کی طرف لے جا رہے تھے، کچھ بیٹھے حقہ یا بیڑی پی رہے تھے بعض پپ پر منھ دھو رہے تھے، اور بعض تو اطراف کے اس شور و غل سے بالکل بے نیاز اب تک ایسے پڑے سو رہے تھے جیسے مر گئے ہوں۔ لالہ لوگ کلف دئیے ہوئے ململ اور قیمتی ٹسر کے کپڑے پہنے دوکان سے مندر اور مندر سے دوکان آجا رہے تھے۔

"رام رام رام۔ ہری ہری ہری۔ سری سری سری" اور اس ہی قسم کی اور آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کون جانے یہ دعائیں خدا کے لئے تھیں یا اہرمن کے لئے۔ چاروں طرف ناچنے کے ایسے رنگ کے لوگ برائے نام کپڑے پہنے چیتھڑے لگائے پھر رہے تھے، چیخ رہے تھے، ہانپ رہے تھے، آہیں بھر رہے تھے یا مُردوں کی طرح خاموش پڑے تھے، منو تو اس فضا میں ایسا کھپ گیا گویا ساری عمر سے اسی کا عادی تھا، البتہ طرح طرح کے لوگوں کو دیکھ کر اُسے بڑا عجیب سا اشتیاق پیدا ہوتا تھا۔ ویسے تو اس نے بہت سے پہاڑی قلیوں کو بھی ایک جا دیکھا تھا، لیکن اتنے بہت

سے کشمیری۔ پہاڑی، سکھ، مسلمان قلی ایک جگہ خلط ملط کبھی نہ دیکھے تھے۔ اُسے خیال ہوا کہ کہیں ان میں بھی تو ہندو لوگ مسلمانوں سے مل کر اپنے دھرم کے بھرشٹ ہونے کا خیال نہیں کرتے اور وہ امید کرنے لگا کہ شاید یہاں ایسا نہ ہو۔ کارخانے کی نوکری کے دوران میں ایک دن جب وہ کسی کام سے جا رہا تھا تو اس نے ایک مسلمان نانبائی کی دکان سے ایک رکابی گوشت اور آبی روٹی لے کر کھائی تھی۔ کرتا بھی کیا۔ مصالحے دار گوشت کے دیگچے میں سے خوشبو ہی ایسی اڑ رہی تھی کہ اس کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ ویسے تو اس نے دوکان کے اندر بیٹھ کر نان گوشت کھایا تھا تاکہ کوئی آتا جاتا ہندو اُسے پہچان نہ لے لیکن اسے اس بات پر کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوا تھا۔ اس نے تو صرف ایک ایسا کھانا کھا لیا تھا جو مسلمان ہندوؤں سے اچھا پکاتے ہیں اسے ایسا محسوس ہوا کہ مذہب کوئی چیز نہیں کیونکہ وہیں، اس کی آنکھ کے سامنے ایک راجپوت قلی ایک مسلمان قلی کا حقہ پینے لگا تھا اور مذہب کا مدار اگر حقہ پانی ہی پر ہے تو پھر قلی تو لامذہب ٹھہرے۔ کیا معلوم شاید ایک دوسرے کا کھانا وہ نہ کھاتے ہوں، لیکن جہاں تک اس کا اپنا تعلق تھا اُسے اس کی پرواہ نہ تھی۔ اُسے تو اس وقت صرف یہ پرواہ تھی کہ کام مل جائے۔ دن کافی چڑھ آیا تھا، سورج کی تمازت آنکھوں کو چندھیا رہی تھی اور وہ دونوں ابھی اپنی جگہ سے کھسکے بھی نہ تھے۔

"تلسی! تلسی!! اس نے گھبرا کر کہا "چل جلدی چلیں۔ وہ دکان کھل رہی ہے۔ دیکھ تو سہی وہاں کتنی بھیڑ جمع ہو گئی ہے"

اور وہ کود کر جلدی سے اس بھیڑ کی طرف بڑھا جو ایک رنگین چار منزلہ مکان کے نچلے حصے والے چوڑے چکلے گودام کے چاروں طرف جمع تھی تلسی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے آیا۔

لیکن منو کو آگے دھنسنے کا راستہ نہ ملا۔ اس کے سامنے لمبے لمبے چوڑے چوڑے قلی ایک دوسرے پر پلے پڑتے تھے۔ اس نے کوشش کی کہ آس پاس سے کہیں سے سٹک جائے یا ٹانگوں کے نیچے سے نکل جائے۔ اس کوشش میں وہ پسینے پسینے ہو گیا لیکن منزل تک نہ پہنچ سکا۔ اور پیچھے ہی کھڑا ہوا صرف چیخنے چلانے، گالیوں اور قسموں اور منت سماجت کا غل سنتا رہا۔

"چلو پیچھے ہٹو۔ سور کہیں کے، پیچھے ہٹو" لالہ جی ایک بانس لئے اپنے لوہے کی بجوری پر کھڑے چیخے جا رہے تھے۔ "پیچھے ہٹو بدمعاشو۔ ورنہ کسی کو کام نہیں ملے گا"

"لالہ جی، لالہ جی، میں محمد بٹ ہوں۔ آپ نے کل بھی مجھے لگایا تھا" ایک قلی بولا۔

"چل ہٹ پرے حرامی، پیچھے ہٹ"

"لالہ جی، لالہ جی۔ مجھے لگا لو۔ میں دو من کی بوری اٹھا سکتا ہوں" ایک اور قلی بولا۔

"چل رے بدمعاش، پیچھے ہٹ ایسے تم کو کسی کو کام نہیں ملیگا"

"لالہ جی، لالہ جی۔ ایک بوری کا بس ایک آنہ دے دینا یہاں سے جہاں چاہے بھیج دینا۔ ایک ہی آنہ لوں گا"

"پیچھے ہٹ بدمعاش، نہیں تیری ہڈیاں توڑ دوں گا"

"لالہ جی، لالہ جی، لالہ جی" کچھ دیر تک بس صرف یہی سنائی دیتا رہا اور پھر بانس کی تڑاتڑ سخت چوٹیں پڑنے لگیں، دوکان کے سامنے سے غصے میں بھری آوازیں آنے لگیں، پیچھے ہٹتے ہوئے قدموں کی دھما دھم ہونے لگی

اور انسانوں کی لہر پر لہر ڈنڈے کی چوٹ سے بچنے کے لئے ہانپتی کانپتی کھسکنے لگی۔

"لالہ ٹھاکر داس کی دکان کھل رہی ہے" کسی نے چلا کر کہا

اور پھر وہ ریلا بڑے زوروں میں ایک بڑی سی دوکان پر ٹوٹا جس کے دروازے میں حفاظت کے لئے لوہے کی سیخیں لگا لی گئی تھیں، منو نے یہ ترکیب سوچی کہ اسی جگہ کھڑا رہے تاکہ جب سب لوگ ادھر بھاگ جائیں تو اسے ادھر کام مل جائے۔

اتنے میں تلسی آگیا اور منو سے آگے چلنے کو کہنے لگا لیکن منو نے اسے اپنی ترکیب بتائی اور کہا کہ "یہیں ٹھہرو۔ جب یہ سب بھیڑیں بھاگ جائیں گی تو ہمیں کام مل جائے گا" اور یہی ہوا۔ منو کا خیال ٹھیک نکلا جب سب لالہ ٹھاکر داس کی دکان کی طرف بھاگ گئے تو یہاں صرف منو، تلسی اور پانچ اور قلی رہ گئے۔

لالہ جی نے لکڑی رکھ دی اور بولے

"چلو بے کتو! تم لوگوں نے مجھے پسینے پسینے کر دیا۔ چلو گودام کی بوریاں اٹھا کر اسٹیشن لے جانے کے لئے رحمت کی بیل گاڑی میں رکھو"

منو نے اناج کی بوریوں پر نیلے رنگ سے ہندستانی میں لکھا ہوا تو پڑھ لیا۔

"از طرف گوکل چند موہن لال"

برائے رلی برادرز، ایکسپورٹ ایجنٹ۔ کراچی

لیکن اس کی عمر اتنی چھوٹی تھی کہ وہ اقتصادیات کے معاملات کو بھلا کیا سمجھتا، اور اقتصادیات بھی کیسی کہ جس کے تحت ہندستان سے گیہوں

ولایت بھیجا جاتا تھا۔ وہ تو صرف "رلی" کو بار بار اپنے منہ میں پھیرتا۔ یہ لفظ اسے بڑا عجیب اور غنائی قسم کا معلوم ہوا۔ گاؤں میں جب وہ سائنس کی کتابیں پڑھتا تھا تو اکثر الفاظ کو بار بار خود ہی دوہراتا رہتا تھا۔

تمام قلی منّ تلسی کے اپنے کندھوں کو بوریوں کے نیچے فٹ کر رہے تھے۔ جو ایک تخت پر گنجی تھیں۔ باری باری سے وہ بوریاں لے کر اٹھ کھڑے ہوتے، کانپتے، ہانپتے زور لگاتے اور چل دیتے، بوجھ کے نیچے ان کی کمریں دوہری ہوئی جاتیں۔

منو بھی دیکھ رہا تھا کہ کس طرح بوجھ اٹھانا چاہئے۔ دوسروں کی نقل میں اس نے اپنے ہاتھوں پر تھوکا کہ نمی سے بوروں کے کونے بآسانی پکڑے جا سکیں اور لگ گیا۔ لیکن بدقسمتی سے بوری اس سے اٹھ ہی نہ سکی اسے ایسا لگا جیسے دوسرے قلیوں کو کوئی جادو آتا ہے جو اسے نہیں آتا۔ وہ ہانپ ہانپ کر، زور لگا کر بوجھا اٹھانے کا راز معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بے سود، دوسرے قلی ایک بوجھ رکھ کر دوسری مرتبہ لینے بھی آ گئے اور منو ابھی تک زور لگا لگا کر پہلی ہی بوری اٹھانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔

"چھوڑ بے بہن ..." ایک ادھیڑ عمر کے قلی نے شفقت سے کہا۔ "کیا مرنا چاہتا ہے۔ جا کے سبزی منڈی میں چھوٹے بوجھ کیوں نہیں اٹھاتا۔" لیکن منو تو اپنے لئے اور اپنے مالک مالکن کے لئے روزی کمانے پر تلا تھا۔

"ذرا مجھے سہارا دے تو اس بوری کو اٹھاؤں" اس نے تلسی سے کہا۔ تلسی نے آگے بوری اٹھوا کر اس کی پیٹھ پر لاد دی۔

منو اٹھا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ سارا جسم اکڑ کر پیٹھ پر رکھی ہوئی بھاری بوری کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا، پھر دوسرا، پھر تیسرا۔ اب وہ چل نکلا۔ پیٹھ پر رکھی ہوئی بوری کا بوجھ جیسے اسے دھکیلے لئے جاتا تھا۔ صحن کے آخری سرے پر ایک گڑھے کے پاس اس کی ٹانگیں آپس میں ٹکرا گئیں۔ لیکن وہ اپنی قوت ارادی کی بدولت سنبھل گیا۔ اس کا ننگا، لچکدار جسم مشقت سے پسینے پسینے ہو رہا تھا اور اس کے تمام جسم سے آگ سی نکل کر اس کے زرد جسم کو دہکا رہی تھی۔

کچھ دیر کے لئے تو وہ ایک حسین شے نظر آنے لگا، عضلات کھنچے ہوئے، توازن نہایت دیدہ زیب، لیکن ابھی تو دہلیز پر سے گذرنا باقی تھا۔ اس نے اپنا بایاں پاؤں اٹھایا اور بغیر یہ سوچے کہ لمبا قدم اٹھانا چاہیے یا جست کرنی چاہیے۔ اس نے اپنا داہنا پاؤں بھی اٹھا دیا۔ دونوں ٹانگیں آپس میں ٹکرائیں اور وہ دھڑام سے زمین پر آرہا، بوری تو الگ جا پڑی اور سر مٹی کے ایک ڈھیر سے زور سے ٹکرایا۔

"اے مادر ... ... " لالہ جی اچھل پڑے۔ ابھی ابھی وہ اپنے سرخ رنگ کے بہی کھاتے سنبھال کر تخت پر حساب کرنے بیٹھے ہی تھے۔ "ابے حرامی تجھ سے کس نے کہا تھا کہ وہ بوری اٹھا۔ ابھی پیدا ہوئے دیر نہیں ہوئی، بھاگ یہاں سے بدمعاش، ہیں نے تجھے بوری اٹھاتے دیکھا ہی نہیں ورنہ وہیں ٹوک دیتا سور کہیں کا۔ ہم کو خون کے الزام میں جیل بھجوائے گا؟ سور کا بچہ چل یہاں سے"

منو ایک جھٹکا لے کر اٹھ کھڑا ہوا، اور اپنی چوٹ کا خیال کئے بغیر بوروں کے اس ڈھیر کے پیچھے چھپ گیا۔ جہاں وہ استاد کو سویا تھا تاکہ موقعہ

ملنے پر پھر آنکھ بچا کر قلیوں میں شامل ہو جائے۔

لالہ جی اب تک اس پر پلے جا رہے تھے، اور انھوں نے اور بنیوں کو اپنے ساتھ شریک کر لیا تھا جو دکان کھول رہے تھے۔ اور اپنی اپنی تجوریوں پر گنگا جل چھڑک کر انھیں پوتر کر رہے تھے۔

"بھاگ ماد ... بھاگ یہاں سے" وہ یوں ہی بغیر جذبے کے مشین کی طرح چیخے جا رہے تھے۔ اور انھوں نے سارے بازار میں دہ کوا گھما دیا کہ جیسے منو نلی نہ تھا کوئی چور یا اچکا تھا کہ فوراً بھگا دیا جاتا۔

کوئی سو گز تیز دوڑنے کے بعد منو کی رفتار دھیمی ہوئی اس کے سر میں دھمک تھی اور منو پر پسینے کے دھارے چھوٹ رہے تھے۔ دونوں بازاروں کے نکڑ والی گلی میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے برابر آ رہے تھے ایک بڑے سے مکان کی دیوار تلے وہ اپنے حواس درست کرنے اور ہوا کھانے کھڑا ہو گیا۔

اس نے سوچا تلسی اب بھی اناج کی بوریاں اٹھا رہا ہو گا۔ خوش نصیب تلسی! وہ آج دن بھر میں چار آنے تو ضرور ہی کما لے گا۔ اور میرے پاس کچھ نہیں جو پر بھا کے واسطے لے جاؤں۔ اور سوچا سب میں نے ہی۔ اگر میں تلسی سے نہ کہتا کہ ٹھہرو، اور قلیوں کو دوسری دکان میں جانے دو۔ تو تلسی کو مزدوری کہاں سے ملتی۔ کاش مجھ میں اتنی طاقت ہوتی کہ اناج کی بوری اٹھا لیتا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ نہ جانے کب بڑا ہوں گا میں، پھر اُسے آتے جاتے لوگوں کے گھورنے کا احساس ہوا ایک آدمی بازار کی طرف سے نکل کر آیا، اور سڑک پر پیشاب کرنے بیٹھا۔ اس نے منو کو بڑے غور سے دیکھا، منو نے سوچا کہ گھر چلنا چاہیے۔ لیکن پھر ایک جگہ دوز

خیال آیا کہ بغیر کچھ کمائے گھر کیسے جاؤں اور اسی کشمکش و پنج میں کچھ دیر کھڑا رہا
اس کا دل پاش پاش ہوا جا رہا تھا، سر میں ابھی تک ہلکی سی دھمک تھی، اور
سارے جسم کی گرمی سمٹ کر ٹانگوں کی نسوں میں بھر گئی تھی۔ اتنے میں ایک
بیل گاڑی آ گئی، بوروں سے لدی ہوئی، ایک چندھا سا بھینسا جتا ہوا، اور
دو آدمی جو اسے مار مار کر گاڑی کے پہیوں کی رفتار کو تیز کرنے کی کوشش
کر رہے تھے۔ اب تو منو کو کھسکنا ہی پڑا۔ کیونکہ پتلی سی گلی تھی اور اتنی بڑی بھدی
سی گاڑی کا گذرنا مشکل تھا۔ کچھ دیر تو وہ یوں ہی چلتا رہا اور پھر ایک دم رک کر
سوچنے لگا کہ آخر جا کہاں رہا ہے۔ اس کے دل نے جواب دیا کہ "اس بڈھے
قلی نے کہا تھا کہ جا کر سبزی منڈی میں چھوٹے بوجھے اٹھاؤ، تو پھر سبزی منڈی
ہی کیوں نہیں چلتے" اور وہ چلنے لگا۔ راستے بھر وہ سوچ میں غرق رہا۔ بعض
وقت یہ مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ جیسے مر سا جاتا ہوں۔ چلتا رہتا ہوں مگر نہ کچھ دیکھتا
ہوں نہ محسوس کرتا ہوں نہ سوچ سکتا ہوں۔ اور پھر یک لخت سب کچھ پہچان
سکتا ہوں، سب کچھ دیکھ سکتا ہوں۔ میں مر تو نہیں جایا کرتا؟ مٹھی بھر راکھ بن کر
ہوا میں تو نہیں غائب ہو جاتا؟ پھر سانس کیسے لینے لگتا ہوں۔ میرے جسم اور
میرے دماغ میں کیا فرق ہے؟ اور روشنی کی یہ رنگین چنگاریاں کہاں سے
آتی ہیں۔ جو پربھا کے کارخانے کی آہنی چھتوں کے روزن سے آتی ہوئی دھوپ
کی طرح میری آنکھوں کے آگے لہراتی اور ناچتی رہتی ہیں۔

لیکن یہ سوالات بڑے دشوار تھے اور ان کا حل ناممکن! البتہ اس
کا دماغ برابر کھٹا کھٹ چل رہا تھا، جسم کی حدت بڑھ رہی تھی، اور اس کی
روح پر جو چھوٹے چھوٹے ہیولے منقش تھے وہ اور چھوٹے ہوتے گئے
ایسے کہ بغیر خوردبین کے دکھائی نہ دے سکیں۔ یہاں تک کہ وہ اسی

خلا میں گم ہو گئے جس سے پیدا ہوئے تھے۔ پھر اسے لوگوں کی شکلیں دکھائی دینے لگیں جو گلیوں میں دھکا پیل کر رہے تھے، دوکانوں کے سامان بڑے بڑے اونچے اونچے مکانات، چھوٹے چھوٹے گھر اور پتلی پتلی گلیاں!

"سبزی منڈی کدھر ہے بھائی"، اس نے ایک قلی کو روک کر پوچھا تو قلی حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا اور پھر بولا "چوک کی طرف سے جانا دوسرے موڑ پر ہے"

منو نے نہ تو پھر قلی کی صورت دیکھی اور نہ ہی اس کا شکریہ ادا کیا۔ بس بھاگا ایک دم۔ پیسے کمانے کی خواہش اس پر بھوت کی طرح سوار تھی۔

سبزی منڈی چوک کی طرح نہیں تھی بلکہ ایک کھلا ہوا بازار تھی اور ویسے بھی خوبصورتی اور گھما گھمی میں اور بازاروں سے بڑھی ہوئی تھی اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں علی الصباح ہی خرید و فروخت شروع ہو جاتی تھی تاکہ دھوپ نکلنے سے پھل اور پھول مرجھا نہ جائیں اور ان کی تازگی میں فرق نہ آجائے۔ بازار کیا تھا، طرح طرح کے رنگوں اور گوناگوں قسموں کا ایک مجموعہ، ہری ہری مرچیں۔ کھیرے اور ساگ پات، انگوری رنگ کی بھنڈیاں، اودے اودے بینگن، سرخ ٹماٹر، سفید شلجم، پیلی گاجریں زرد خربوزے، سرخ گلاب ایسے آم۔ لال کیلے، چھوٹی چھوٹی ٹوکریوں میں لگے، دوکانوں میں قرینے سے اوپر سے نیچے سجے ہوئے تھے گلی میں پھٹے پرانے کپڑے پہنے نوکر لونڈے پھٹیچر لوگ۔ بڈھی کھوسٹ سیاہ بھٹ بھوائیں، ایک ایک پیسے پر جھگڑتی ہوئی۔ امیر گھرانوں کی عورتیں ریشمی لباس پہنے ہوئے اپنی اپنی زیور سے لدی بیٹیوں یا بہوؤں

کوئے آلوؤں کے بھاؤ پر جھک جھک کر رہی تھیں۔ اور دوکان دار انھیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکے جا رہے تھے۔

مختلف زبانوں، دعوت دیتے ہوئے نظاروں اور اٹھتی ہوئی خوشبوؤں کی اس دنیا میں منو بوکھلا سا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کدھر جائے۔ کبھی سرسبز پتوں کے بیچ میں سجے ہوئے پھلوں کے ڈھیروں کو غور سے تکنے لگتا، اور کبھی ان ٹوکریوں کو دیکھتا جن میں زیادہ نازک پھل انگور وغیرہ رکھے تھے۔ چھوٹے چھوٹے پکے لذیذ آموں کا ایک ڈھیر دیکھ کر تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔

"ابے او بیٹی ... ..." کسی دوکان دار نے ایک طرف سے آواز دی "دو پیسے میں یہ بوجھ اٹھائے گا؟"

"ہاں لالہ جی" پانچ آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔

مگر منو نے جلدی سے لپک کر لالہ جی کے ہاتھ سے ٹوکری لے لی یہ معاملہ تو آسان تھا۔ مگر مزدوری تو صرف دو ہی پیسے تھی۔

"ہے بھگوان روٹی اتنی مہنگی اور خون اتنا سستا" منو نے ضرب المثل دوہراتے ہوئے دوسرے مونڈوں کو دھکیلا۔

اب منو روز علی الصباح سبزی منڈی آجایا کرتا تھا۔ اور تلسی دھان منڈی چلا جاتا تھا۔ دونوں کی روزانہ کمائی آٹھ آنے سے زیادہ کبھی نہ ہوتی تھی تلسی عموماً چھ آنے لے آتا تھا اور منو دو آنے، لیکن اتنی حقیر رقم کے لئے بھی ان کو اپنی تمام محنت صرف کرنی پڑتی تھی۔ اور تقدیر بھی آزمائی ہوتی تھی، کیونکہ چاروں طرف قلیوں کا ایک ہجوم ہمیشہ بھرا رہتا تھا۔ دن بھر بھوکے رہ کر پیٹ

کاٹنے کے ڈر کے مارے، وہ دوڑ دوڑ کر دکانوں پر حملہ کرتے، کھینچتے، دھکیلتے ایک دوسرے کو ہٹاتے یہاں تک کہ بنیوں میں سے کسی کی لاٹھی کسی بہاری قلی کے دانت توڑ دیتی، یا کسی کشمیری قلی کے سر کے زخموں کو پھر سے تازہ کر دیتی تب کہیں جا کر وہ مات کھا کر پیچھے ہٹتے، اپنی جانوں کی خیر مناتے اور تقدیر کا سہارا ڈھونڈتے کہ شاید وہ ایک آنہ فی بوجھ کی مزدوری کے لئے انتخاب کر لئے جائیں۔ ایسا نہیں تھا کہ سب سے طاقت ور ہی کو مزدوری مل جائے اور کمزور پیچھے رہ جائے۔ اکثر کسی بنئے کے لڑکے کی چالاکی سے انھیں مزدوری ملتی یا پھر کوئی لالہ نہایت عیاری سے یہ کوشش کرتا کہ جو کام زیادہ کرے اور دام کم لے وہ لگا لیا جائے اور اس طرح کچھ مل ہی رہتا۔ بعض وقت قلی اپنی چالاکی سے کام بنا لیتے تھے۔ منو کو تو زیادہ تر مزدوری اپنی چالوں سے ہی ملتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ سبزی منڈی میں بڑا سخت مقابلہ ہے۔ لہٰذا وہ معصوم سی صورت بنائے آس پاس کی گلیوں میں ٹہلتا رہتا، اور جہاں کسی عورت کے متعلق اُسے یہ اندازہ ہوتا کہ یہ سبزی منڈی جا رہی ہے، بس اس کے پیچھے لگ لیتا۔ "ماں میں تمہارا سامان اٹھا دوں"

"اچھا اچھا اٹھا لینا۔ ایک پیسہ ملے گا" عورت کہتی

"ارے نہیں ماں دو پیسے تو دینا، ایسا بھی کیا۔ اچھا دو پیسے دینا" وہ کہتے وقت "ماں" کے لفظ پر خاص زور دیتا تاکہ عورت کا دل پگھل جائے۔

"اچھا ——— اچھا" عورت کہتی

پھر وہ اس کے ہاتھ سے ٹوکری یا تھیلا چھین لیتا، اور اسے نہایت شان سے دکھاتا ہوا چلتا، تاکہ اور قلیوں کو معلوم ہو جائے کہ یہاں اس کا

قبضہ ہے اور کسی کو اس عورت کے پاس بھی پھٹکنے کی مجال نہ ہو۔ جب اور قلیوں نے بھی یہی ترکیب کرنی شروع کر دی تو پھر منو کو کوئی دوسری ترکیب سوچنے کی ضرورت ہوئی۔

پہلے تو اس نے لالہ لوگوں کی خوشامد شروع کی لیکن وہ لوگ اپنے کاروبار میں مصروف اور پھر خود غرض، ان کو اتنی فرصت کہاں کہ منو کی خوشامد کا نوٹس بھی لیں۔ ان کے لئے تو سب قلی ایک ہی سے تھے۔ بدتمیز، گنوار، گندے لوگ جن سے صرف گالی سے بات کی جا سکتی تھی یا سبزی لاد کر لانے والے خچروں کی طرح پیٹا جا سکتا تھا۔

پھر منو نے ایک اور ترکیب کی۔ اس نے قلیوں میں یہ افواہ پھیلانی شروع کی کہ کل بازار بند ہے۔ یہ ترکیب دو تین بار تو کام دے گئی، لیکن زیادہ تر قلی رات دن بازار ہی میں پڑے رہتے تھے۔ ان کا کھانا پینا سونا، کام کاج سب وہیں ہوتا تھا اور انھیں جلد ہی پتہ چل گیا کہ منو بڑا شریر اور چالاک لونڈا ہے، اور اس کی بات کا بھروسہ کبھی نہیں کیا جا سکتا۔

آخر کار منو کو اپنی اسی پہلی ترکیب پر پھر کاربند ہونا پڑا کہ عورتوں کا سامان اٹھایا کرے، لیکن اس ترکیب میں بھی منو نے قدرے ترمیم کر دی اب وہ بازار کے باہر تو نہ جاتا تھا لیکن یہ کرتا کہ جب دوسرے قلی بیٹھے جوان اور خوبصورت عورتوں کو تاکا کرتے وہ لپک کر سب سے بڈھی، سب سے بدصورت اور چڑچڑی سی عورت پر چھا جاتا۔ اگرچہ اس ترمیم میں ایک نقص یہ ضرور تھا کہ بوڑھی عورتیں ایک ایک پیسہ کے لئے گھنٹوں جھگڑتیں، ایک ایک پائی گنتیں، اور عام طور پر منو کو آدھا آدھا دن بھری ہوئی ٹوکریاں ڈھونے کے بعد ایک باسی روٹی اور ایک چمچہ دال دے کر ٹالنا چاہتیں۔ یا پھر

روپیے جو مقرر ہوتے اس پر بحث ہونے لگتی۔

اس طرح منو اور تلسی کی تمام کوشش کے باوجود بھی آٹھ آنے روز سے زیادہ نہ مل سکتے اور اتنے داموں میں پورے خاندان کو بمشکل دو وقت دال چاول نصیب ہو سکتے تھے۔

اس درمیان میں اگرچہ پربھا کا بخار اتر گیا تھا۔ اور زخم بھی اچھے ہو گئے تھے۔ لیکن اپنی فیکٹری کو سامنے بکتے دیکھ کر مارے رنج کے اس کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ پھر پڑ گیا۔ اس کے علاوہ اُسے یہ فکر بھی کھائے جاتی تھی کہ اپنے قرض خواہوں کی ایک ایک پائی چکا دے۔ انھیں ان لڑکوں کا غم بھی تھا کیونکہ اپنے گذشتہ تجربہ سے اُسے معلوم تھا کہ قلی کا کام کر کے دن بھر میں ایک پیسہ بھی کمانا کتنا مشکل ہے۔

ان تمام رنجوں کی وجہ سے اس کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی اور آخر کار ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ اگر جان بچانا چاہتا ہے تو پہاڑ چلا جائے۔ بہت کچھ کہنے سننے کے بعد وہ اپنی بیوی سمیت پہاڑ جانے کو راضی ہوا۔ اور یہ طے ہوا کہ تلسی ان کے ساتھ پٹھان کوٹ تک جائے اور وہاں سے کوئی بیل گاڑی وغیرہ طے کر کے ان کو روانہ کر دے۔ منو کو دولت پور ہی میں ٹھہرنا پڑا کیونکہ اتنے پیسے نہ تھے کہ سب کے ٹکٹ خریدے جا سکتے۔ اور یہ قرار پایا کہ وہ کچھ عرصہ بعد مالک اور مالکن کے پاس پہاڑ چلا آئے گا۔

وہ جدائی بھی کیا غضب کی جدائی تھی

پربھا اور اس کی بیوی دونوں پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

منو نے پربھا کی عمر اور جثے کے آدمی کو روتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ بے نصیب صورت پر منو کو دیکھ کر ایک شفیق اور محبت بھری مسکراہٹ

کھل اٹھتی تھی، بیماری اور مصیبت سہہ سہہ کر ہڈی چمڑا اور خاک سیاہ ہو کر رہ گیا تھا اور رونے وقت ایک عجیب اندوہ گیں طور پر مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ منو کو اس وقت مالک کے پاس جاتے ہوئے بھی پس و پیش ہو رہا تھا، جیسے اس میں ہمدردی کرنے کی اہلیت ہی باقی نہ رہ گئی ہو۔ وہ چپ چاپ ایک طرف کھڑا تکے جا رہا تھا، اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ "یہ مجھے ہو کیا گیا ہے۔ اس شخص نے مجھ پر اتنی مہربانی کی اور میں اس کے پاس بھی نہیں جا سکتا"

مالکن کے ساتھ اس نے زیادہ محبت کا برتاؤ کیا۔ جب سامان باندھا بوندھا جا چکا تو وہ کھڑکی کے پاس جا کر مالکن کی گود میں گر پڑا۔ وہ وہیں بیٹھی رو رہی تھی۔ اور منو کا دل ایک تاریک گہرائی میں ڈوب کر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُسے اس دن کی یاد آئی جب وہ پہلے پہل یہاں آیا تھا۔ بجلی کی سرعت کی طرح مالکن کا وہ چہرہ اس کی آنکھوں میں پھرنے لگا، اس کی وہ محبت بھری مسکراہٹ جسے دیکھتے ہی منو کے دل کو اطمینان ہو گیا تھا پھر اُسے اپنی بیماری یاد آئی اور مالکن نے کس طرح اس کے ہاتھ پاؤں دبائے تھے۔ اس کی یاد میں ابھی تک وہ گرمی باقی تھی، وہ گرمی جو اب بھی، اس وقت بھی اُسے محسوس ہو رہی تھی، لیکن اس وقت وہ اپنے آپ کو بالکل اس کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا جیسا کہ اس نے بیماری اور معذوری کی حالت میں کیا تھا۔

وہ ایک دم اس کی آغوش سے الگ ہو گیا اور رنج و غم سے چور چور الگ جا کر کھڑا ہو گیا۔ مالکن روتی رہی۔

اتنے میں تلسی نے آ کر کہا کہ "تانگہ آ گیا ہے۔ اور گلی کے نکڑ پر منتظر کھڑا ہے۔ تلسی کے ساتھ دو قلی اور بھی آئے۔ یہ تلسی کے دوست تھے، اس کے ساتھ دھان منڈی میں کام کرتے تھے اور بھائی چارے میں سامان اٹھانے

میں مدد دینے آ گئے تھے۔

لیکن وہاں ایسا کون بہت سامان ہی تھا کہ اٹھوایا جاتا۔ ایک ٹرنک ایک بستر اور بس!

جب پربھا تلسی اور منو کے کندھوں کا سہارا لے کر اٹھا تو اس نے ایک آخری حسرت کی نظر کمرے کے در و دیوار پر ڈالی۔ یہاں اس نے اپنی زندگی کے سب سے امیرانہ ایام گذارے تھے۔ پھر اس نے ایک بستر اور ٹرنک کو دیکھا جو قلی اٹھا رہے تھے۔ اور اُسے یاد آیا کہ جب وہ پہلے پہل یہاں آیا تھا تو صرف یہی سامان ساتھ تھا۔ اور اب جب کہ وہ دولت پور سے رخصت ہو رہا تھا۔ تب بھی وہی دو چیزیں اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ اس درمیان اور جتنی چیزیں، جتنا سامان اُسے حاصل ہوا تھا وہ سب یوں ہی تھا۔

اس نے اپنا زرد کمزور چہرہ جھکا لیا اور کلیسیوں کی طرح دل کو تسلی دینے لگا کہ "ایسا ہی ہونا بھی چاہئے۔ انسان دنیا میں خالی ہاتھ آتا ہے، اور خالی ہاتھ ہی واپس چلا جاتا ہے، اپنے سامان کو چھاتی پر رکھ کر کوئی نہیں لے جاتا"

شام کی زرد دھوپ کھڑکیوں کی سلاخوں سے اندر آ رہی تھی۔ اور اس پورے کمرے کو سونے کی کان کی طرح روشن کر کے اس میں پرستان کا سا حسن اور کشش پیدا کر دی تھی۔ لیکن پربھا نے سنیاسیوں کی طرح اُدھر سے پیٹھ موڑ لی اور جھکا ہوا، کراہتا، کچلا ہوا اور کمزور، اپنی دونوں سہیلیوں کا کندھوں پر سہارا لئے باہر نکل آیا۔ اس کی بیوی دوپٹہ کا گھونگھٹ نکالے اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ گھونگھٹ سے اس کا حسن اور اس کا غم واندوہ دونوں چھپ گئے تھے۔ پاس پڑوس کے لوگ اس شخص کو الوداع کہنے کے لئے جمع ہو

گئے تھے جو کسی زمانے میں پہاڑی قلیوں میں سب سے زیادہ کامیاب تھا، اور اب سب سے زیادہ شکستہ اور ناکامیاب!

"رام، رام، بھائی پربھ دیال! رام، رام۔ تم پھر واپس آجاؤ گے دل نہ کڑھاؤ۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ جی جان سے اچھے ہو جاؤ گے تو یہاں پھر چلے آنا"

"جی جان سے اچھا ہو جاؤں اور دیوالئے کی بے عزتی برداشت کر جاؤں تب نہ"۔ پربھا نے تمسخر آمیز غم آگیں لہجہ میں کہا اُسے کتنا زیادہ یقین تھا کہ اس نے سماج کے قانونوں کو توڑا ہے۔ اور سخت ٹھوکریں کھانے کے بعد اب بھی وہ کس قدر تنکسر المزاج لگ رہا تھا۔ پھر اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"عقلمند کتا چوکھٹ ہی پہچان کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے"

اب یہ قافلہ کوچہ بلی ماروں سے گذرنے لگا۔ چاروں طرف مرد عورتیں جمع تھے اور یہ نظارہ دیکھ رہے تھے، گپ کرنے کے لئے ایک نیا موضوع ان کے ہاتھ آگیا تھا۔

تانگے والے نے جو دیکھا کہ اس کی سواری میں امیر لالاؤں کے بجائے قلی بیٹھنے والے ہیں وہ لگا گالی گلوچ سنا دینے۔ اس نے بہانہ تو یہ بنایا کہ گاڑی کے ٹھیک وقت پر پہونچنے کے لئے جلدی کر رہا ہے لیکن دراصل اُسے اور سواریاں حاصل کرنے کی جلدی تھی، لہذا اس نے گھوڑے کو جو چابکیں ماری ہیں تو تانگہ ایسا ہلنے لگا جیسے ہنڈولا۔ پربھا خاموش رہا حالانکہ زبردست ہچکولوں سے اس کا کلیجہ اچھل رہا تھا۔ اور سخت سخت سیٹ الگ چبھ رہی تھی۔

"شیخ صاحب، ذرا آہستہ ہانکئے"، منو نے خوشامدانہ لہجے میں کہا "ہمارے مالک بیمار ہیں"

"میں کچھ تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہوں" تانگے والا بولا "کہ تمہارے لئے بمبئی میل کے مسافر چھوڑ دوں"

منو کو اس بات پر غصہ آگیا۔ پر بھا ایسے انسان کے ساتھ کوئی ایسا سلوک کیسے کر سکتا تھا۔ جیسے جیسے اسٹیشن نزدیک آتا گیا۔ منو کا رنج بڑھتا ہی گیا۔ ٹرین دولت پور ہی سے روانہ ہوتی تھی۔ لہذا پلیٹ فارم پر ہی کھڑی تھی۔ لیکن تیسرے درجہ کے مسافر، ایک لوہے کے جنگلے سے گھرے ہوئے مسافر خانے میں بند تھے اور یہ مسافر خانہ ریل روانہ ہونے سے پانچ منٹ قبل کھلتا تھا۔

وہ سب کے سب اور سینکڑوں مسافروں کے ساتھ سیمنٹ کے فرش پر بیٹھ گئے۔ سینکڑوں اٹیلیاں ٹٹلیاں ادھر ادھر رکھی تھیں، مکھیوں کے غول اور مچھروں کے دل کے دل اڑتے پھرتے تھے اور یہ سب لوگ دعا مانگ رہے تھے کہ خدا کرے ریل میں کوئی محفوظ جگہ مل جائے۔

ایک ٹکٹ کلکٹر سفید کپڑے پہنے، پیتل کے بٹن لگائے پلیٹ فارم پر ادھر ادھر رشوت کی فکر میں، اینڈتا پھر رہا تھا۔ اس نے منو کو دیکھا اور اس کے فکرمند چہرے سے اس کا حال بھی پہچان لیا۔

"دو آنے دو" اس نے آہستہ سے کہا "تو تمہیں ایک چور دروازہ سے اندر گھسا دوں گا"

منو نے کئی دن میں جوڑ جاڑ کر چار آنے جمع کئے تھے، دو آنے کے معنی اس کی آدھی دولت تھی مگر اس نے چپکے سے دو نی پاپ کے ہاتھ پر رکھ دی

اگرچہ اس کے بعد بھی اُسے ڈر ہی لگتا رہا کہ رشوت لینے کے بعد بابو کہیں اپنے وعدے سے نہ پھر جائے۔ لیکن خیر غریبی کی وجہ سے رشوت لینے کے باوجود، وہ آدمی کافی ایمان دار نکلا۔ اُس نے نہ صرف انھیں دروازے سے نکال ہی دیا، بلکہ ایک تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بٹھا بھی دیا۔ منو کھڑا ہوا حسرت سے اپنے مالک، مالکن اور تلسی کو دیکھ رہا تھا جو اب گاڑی میں بیٹھ چکے تھے، اُسے غضب کی تنہائی اور رنج محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ان سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ رہا ہو۔

"منو بیٹا! اب تم جاؤ"، پربھا نے بمشکل اپنا سوکھا جسم کھڑکی کے باہر نکالا اور ایک چاندی کا روپیہ منو کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ "کچھ کھانا خرید کر کھا لینا اور گھر ہی جا کر سو رہنا گھر کا کرایہ مہینے کے آخر تک کا دے دیا گیا ہے"

"جے دیوا"، منو نے ہاتھ جوڑے۔ اس کا دل اِس شخص کی محبت اور ممنونیت سے پھٹا پڑتا تھا۔

"جیو بیٹا"، پربھا نے ٹھنڈی سانس بھر کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا

"پالاگوں"، منو ہاتھ جوڑے ہوئے مالکن کی طرف مڑا۔

"جیو بیٹا"، مالکن نے پیار سے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"منو بھیا! میں دو دن بعد واپس آجاؤں گا"، تلسی بولا

"اچھا"، منو نے جواب دیا، اور گھبرا کے چل دیا۔

اس نے چاندی کے روپیہ کا لمس محسوس کیا، اور اُسے خوشی سی ہوئی۔ لیکن فوراً ہی اُسے خیال آیا کہ پربھا نے اِس مصیبت کے عالم میں بھی اس کا کس قدر خیال رکھا۔ اور وہ رنجیدہ ہو گیا۔ اپنے دل ہی دل میں وہ سوچنے

لگا کہ یہ بھاندہی آدمی ہے اور کون جانے اس نے یہ خدا ترسی بھی مندر ہی جا جا کر سیکھی ہو۔ میں بھی آج شام کو مندر جاؤں گا۔ بھگت ہر بلاس کے مندر میں لنگر بٹتا ہے وہیں چلا جاؤں۔ کھانے کے پیسے بھی بچیں گے اور مذہبی باتیں بھی سیکھوں گا"۔

لیکن وہ شور و غل سے چونک سا پڑا۔ تھرڈ کلاس کے مسافروں کا جنگلہ کھول دیا گیا تھا۔ اور وہ سب ریل پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ کیونکہ ان سب کا خیال تھا کہ ریل چلتی ہوئی چیز ہے، اور ذرا بھی تساہلی ہوئی کہ وہ سب کو چھوڑ کر چل دے گی۔

منوا اپنے لچک دار جسم کو موڑ توڑ کر تار کے جنگلے سے باہر نکال کر اسٹیشن کے احاطے میں آگیا جہاں تانگے والے کھڑے آوازیں لگا رہے تھے "گھنٹہ گھر، وشنو مندر، لوہاری گیٹ، دہلی بازار، ہیرا منڈی، گرودھرم شالہ"

"اے لڑکے، اے لڑکے، ذرا یہ بوجھا اٹھا کر ہسپتال تک لے چلے گا۔ ڈاکٹر صاحب سنگھ کے بنگلے پر جانا ہے۔ اس میں ریشم ہے۔ پیدل چلیں گے تو چپکے سے چنگی کے پاس سے نکل جائیں، اور تانگہ ہوگا تو وہ لوگ روک لیں گے۔ زیادہ دور نہیں، کوئی دو سو گز ہے"

"ہاں ہاں" منو بڑے اشتیاق سے بڑھا اور سوچنے لگا کہ یہ کام تو بڑا آسان ہے۔ سبزی منڈی میں دو دو پیسے کے لئے بوجھ اٹھانے سے تو اچھا ہے کہ یہیں آکر لوگوں کا سامان اٹھا دیا کروں"

اسٹیشن سے بوجھا اٹھا کر اس نے سول لائن کے ہسپتال پہنچا دیا۔

اب اسے کھانا کھانے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا اور کھانا بھگت ہری داس کے مندر میں مفت ملتا ہی تھا۔ چنانچہ وہ مندر پہنچا جہاں پربھا کے ساتھ پہلے دن گیا تھا۔

اس مرتبہ وہ اُس دروازہ سے داخل ہوا جو پرانے بازار کے امیر سوداگروں کی اونچی اونچی حویلیوں کے پاس تھا۔ چاند کی دودھیا روشنی میں مندر کی بلند گنبد نما چھت پورے کھلے ہوئے کنول کی طرح لگ رہی تھی اور اس کے کلس کا عکس تالاب میں پڑ رہا تھا۔ بہت سے لوگ رنگ برنگے قیمتی کپڑے پہنے تالاب کا طواف کر رہے تھے۔ منو بھی اسی ہجوم میں شامل ہو گیا اور بھگت ہری داس کے استھان کی طرف بڑھنے لگا۔

منو کو اس وقت مذہبی برکتوں سے زیادہ کھانے کی ضرورت تھی اور یہ وقت بھی کھانے کا ہی تھا۔ مندر کی رسوئی سے دال اور روٹی، غریبوں اور سادھوؤں کو تقسیم کی جاتی تھی۔ منو کو اتنی بھوک لگی تھی کہ اس نے مندر میں چڑھانے کے لئے پھول تک نہ خریدے۔ اور جب وہ تالاب کے بیچوں بیچ گنبد کے عکس کو چاندنی سے کھلتے ہوئے دیکھتا چلا جا رہا تھا تو پارسائی اور مذہب کا جو کچھ خیال تھا بھی وہ بھی اس کے ذہن سے ہوا ہو گیا۔ اس زبردست اور شاندار عمارت کو دیکھ کر اس پر بڑا رعب طاری ہوا۔ جیسے خود پروردگار عالم اپنے شاندار غیر مرئی وجود سے اُسے پھاڑے ڈال رہا ہے۔ وہ جلدی جلدی چلنے لگا۔ اس کی اب ایک ہی خواہش تھی کہ مندر پر چھائی ہوئی اس گھٹی ہوئی فضا سے کسی طرح نکل بھاگے۔ ہجوم بہت دھیرے دھیرے کھسک رہا تھا، بالکل کچھوے کی سی چال۔ منو اس میں پھنس گیا تھا۔ اب وہ ایک بوگدہ میں داخل ہوا جس میں سے ہو کر ہری داس کے استھان تک پہنچتے تھے۔ وہاں ایک پیاؤ لگا ہوا

تھا اور ایک برہمن سادھو ایک چھلے سے پیتل کے کٹورے میں لوگوں کو پانی پلا رہا تھا۔ بظاہر تو یہ خدمت مفت تھی لیکن دراصل اس کے دام دینے ہوتے تھے کیونکہ منو نے دیکھا کہ جس کسی نے بھی پانی پیا اس نے ایک پیسہ برہمن کے کٹورے میں ڈال دیا۔ آخر کو تو وہ برہمن تھا۔ خدمت گار ہو گیا تھا تو کیا ہوا۔ کچھ آبائی شرافت اور عزت تھوڑا ہی چلی گئی تھی۔ منو کا حلق سوکھ رہا تھا۔ اس نے بھی ایک کٹورا لیا۔ لیکن جب اس گندے کٹورے کو منہ سے الگ کیا تو اس میں پیسہ نہیں ڈالا۔ برہمن نے منو کی طرف دیکھ کر اپنا منہ سکوڑ لیا، اور بڑبڑا کر کہا۔

"کنجوس کو موت آئے"

منو پر کوسنے کا بھلا کیا اثر ہوتا تھا۔ اب تو وہ گالی کوسنے کا خوب عادی ہو گیا تھا اور اس کے اثر کا قطعی معتقد نہ تھا۔ اندھیرے میں تیزی سے چلتا ہوا وہ رسوئی کی طرف بڑھا کہ مفت کھانا ملنے کے امکانات کو بھی ذرا دیکھ لے۔

"بھگوان کی رسوئی کا بھوجن"۔ ایک آدمی ادھر سے اُدھر آواز دیتا پھر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ رسی میں بندھی ہوئی دیگچی تھی۔ ایک اور مددگار ایک بڑی سی ٹوکری اٹھائے اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ منو نے دیکھا کہ جوان جوان سادھو اور فقیر اس کی طرف دوڑنے لگے۔ اس دھکا پیل میں معذور اور بڈھے لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے ہی رہ گئے۔ ضرور یہی لنگر تقسیم کرنے والا ہوگا۔ ایک منٹ میں سب فقیر اس آدمی پر چھا جائیں گے۔

منو دوڑا اور کھانا بانٹنے والے کے آگے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔

"تیری رکابی کہاں ہے"

"میرے پاس ہے ہی نہیں مہاراج" منو نے جواب دیا اور

رونی صورت بنا کر ہونٹ کپکپائے کہ اُسے ترس آجائے۔

اتنے میں اس دوسرے آدمی نے اس کی طرف دو روٹیاں پھینک دیں اور پہلے شخص نے ایک بڑا سا چمچہ بھر کر دال ان روٹیوں ہی پر رکھ دی وہ دونوں شخص چاروں طرف سے اُن بھوکے کتوں سے گھر گئے تھے اور کھانا مانگنے کی بھنبھناہٹ ہر طرف پھیل گئی تھی۔ اس ہجوم سے نکلنے کی کوشش میں منو کا کھانا گرتے گرتے بچا۔ لیکن کھانے کو دیکھ کر ہی اس میں کچھ ایسی طاقت آگئی تھی کہ وہ کہنیاں مارتا بھیڑ میں سے نکل آیا۔ صحن سے نکل کر وہ پائین باغ میں آگیا۔ جو چمیلی، چمپا اور مولسری کی خوشبو سے پٹا مہک رہا تھا۔ یہاں ایک کنج بنا ہوا تھا جس کے پاس ہی فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ منو فوارے کے پاس ہی بیٹھ گیا، اور کھانے لگا۔

کچھ دیر تک وہ صرف کھانے ہی کی طرف متوجہ رہا۔ دال معمولی طرح سے پکی تھی لیکن پھر بھی اُسے مزے دار معلوم ہو رہی تھی۔ جب پیٹ کی آگ کسی قدر کم ہوئی تو منو نے چاروں طرف دیکھا۔ چاند آدھا چھپ گیا تھا اور آدھے چاند کی روشنی میں کنج کی خوبصورتی بے نقاب ہو رہی تھی۔ ایک موٹا سا سادھو، منڈا ہوا سر، گیروے کپڑے پہنے، فوارے کی طرف منہ کئے یک لخت تکے جا رہا تھا، جیسے دھیان میں بیٹھا ہو۔ یوگی اس وقت کنول بیٹھک کئے تھا، آلتی پالتی مارے، اور اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے پھولوں کی طرح گھٹنوں پہ ٹکے تھے۔ اس کے سامنے ایک بڑھیا دیکی بیٹھی تھی، کالا لہنگا پہنے اور فاطمئی دوپٹہ اوڑھے، اور ایک جوان عورت بھی دلہنوں کا لباس پہنے پاس ہی بیٹھی تھی۔ ایسا لگتا تھا، دونوں یوگی کا دھیان ختم ہونے کی منتظر بیٹھی ہیں۔

منو اٹھا اور پنجوں کے بل چلتا ہوا یوگی کی طرف بڑھا۔
"اے بزرگ پجاری تیرا یہاں جوگی کے استھان میں کیا کام ہے۔ تو اپنے برابر کے بچوں کی سنگھت میں جا کر کھیل"
"یوگی جی" منو نے جواب دیا "مجھے یہ بتائیے کہ آپ یہاں اتنے چپ چاپ کیوں بیٹھے ہیں کہ آپ کی پلک بھی نہیں ہلتی"
"جا جا بے وقوف بھاگ یہاں سے" بڑھیا نے آہستے سے کہا۔
"شانتی! شانتی" جوگی نے اپنا سر اٹھایا۔ اس کے چہرے کی پاکیزگی اس کی مسکراہٹ کے بالکل متضاد تھی "یہ لڑکا تو بڑا اچھا شگون ہے۔ تمہاری بہو کے جو بچہ پیدا ہوگا وہ اسی لڑکے کی صورت ہوگا۔ بھگوان نے میری اور تمہاری پرارتھنا سن لی۔ بھگوان کے بھیجے ہوئے اتھی کو کبھی نہ دھتکارو"
"یوگی جی" منو جوش کے ساتھ بولا "میں بھی بھگوان کی تلاش میں ہوں۔ مجھے بھی بھگوان کی تلاش کرنا سکھائیے۔ میں بھی اسی رستے پر چلنا چاہتا ہوں"
"تو ابھی بچہ ہے۔ لیکن ہم تجھے چیلا بنا لیں گے۔ اور گرو کی خدمت کرے گا تو بڑائی پائے گا"
"مجھے گرو ہی کی تلاش ہے" منو نے کہا۔ اس کی نگاہیں ان پھلوں پر جمی ہوئی تھیں جو مہاتما جی کے سامنے نذرانے میں پیش کئے گئے تھے۔
"اچھا تو آ۔ یہ چیزیں جو بکھری پڑی ہیں ان سب کو سمیٹ لے اور میرے پیچھے پیچھے چلا آ" یوگی بولا۔ پھر وہ بڑھیا کی طرف جھکا اور آہستے سے بولا۔

"پورنماشی کی رات بیج بونے کے لئے بڑی شبھ ہے۔ اپنی بہو کو لے کر اس لڑکے کے پیچھے پیچھے چلی آؤ۔ مجھ سے ذرا الگ الگ ہی رہنا۔ ہردوار کے مندر کے پیچھے میرا جو چوبارہ ہے وہاں پہنچ جانا۔ اور راستہ میں مجھ سے زیادہ قریب نہ ہونا۔ دنیا بڑی شنکی ہے۔ یاد رہے مجھ سے کافی دور چلنا سمجھیں ماں"

پھر وہ منو سے مخاطب ہوا اور بولا۔

"مجھ سے کوئی سوگز پیچھے رہنا اور ان عورتوں کو میرے کمرے کی پچھلی سیڑھیوں سے اوپر لے آنا۔ مجھ پر برابر نظر رکھنا۔ راستہ نہ بھولنا چیلے"

منو کو کچھ علم نہ تھا کہ یوگی کا ارادہ کیا ہے۔ لیکن وہ خود معرکہ آرائی کے لئے تیار تھا۔ پھل جو اس کے ہاتھ میں تھے، پکی ہوئی خوشبو سے مہک رہے تھے۔ اور تازے لذیذ آموں، اناروں، کیلوں اور انگوروں کو دیکھ دیکھ کر منو کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ وہ یوگی کا حکم لفظ بلفظ بجا لایا۔

اب یہ قافلہ باغ میں سے گذر گیا۔ باغ کے سنگ مرمر کے دروازوں کے آس پاس جو جھاڑیاں لگی تھیں ان کا پتہ تک نہ ہلتا تھا۔ چاروں طرف ایسا ہی سناٹا چھایا ہوا تھا۔

منو کو ایسا محسوس ہوا کہ یوگی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ کیونکہ وہ دروازے کے پاس، پھولوں والوں کی دکان کے سامنے ہو کر ایک تاریک گلی میں مڑ گیا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ چورا ہے پر بنے ہوئے ایک مکان کی اوپری منزل کی کھڑکی سے اشارہ کر رہا ہے۔ منو عورتوں کے انتظار میں ذرا ٹھہر گیا۔ کیونکہ وہ پیچھے رہ گئی تھیں، اور ایک پان والے کی دکان کو غور سے تکنے لگا۔

دکان میں لگے ہوئے بڑے سے آئینے میں چوراہے پر آتے جاتے لوگوں کا میلہ دکھائی دے رہا تھا۔ منو کا دل چاہا کہ ایک پان خرید کر چبائے، اسے یہ عیش کبھی کبھی کو نصیب ہوا تھا، اور ایک سگریٹ پیئے اور تھوڑی سی نسوار بھی مول لے لے۔ لیکن اتنے میں وہ دونوں عورتیں آ پہونچیں۔ اور منو انھیں لے کر گلی میں داخل ہوگیا۔ یوگی ہاتھ میں لالٹین لئے، انھیں لینے کے لئے سیڑھیوں سے اتر کر آیا اور تاریک زینے سے انھیں اپنے ساتھ اوپر لے آیا۔ اوپر آکر تو منو کو ایسا لگا کہ کسی محل میں آگیا ہے، چاروں طرف سفید چاندنیاں کسی تھیں، سفید دودھ ایسے گاؤ تکیے اور لمبی لمبی مسک والے پیچوان لگے تھے۔

"تو اب میں جاتی ہوں مہنت جی! صبح تڑکے پھر آؤں گی" بڑھیا بولی۔

"اچھا" جوگی بڑے اشتیاق سے بولا۔

بڑھیا چلی گئی۔

منو کھڑا ہوا گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

"میری جان! کم از کم گھونگھٹ تو اٹھاؤ اور مجھ سے کچھ بات تو کرو" یوگی نے جوان عورت کے پاس آکر کہا۔ اور اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

منو حیرت سے یوگی کا منہ تکنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے پردے اٹھ چکے تھے اور مہنت جی کی شہوت پرستی کا راز فاش ہو چکا تھا۔ شرم کے مارے منو کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ خود اس ارادے سے باہر نکلا کہ جو کچھ دیکھا تھا وہ بڑھیا کو کہہ سنائے۔ اسے اپنی معصومیت کے لحاظ سے یہ خیال تھا کہ وہ بھی یہ اجراس کر حیران رہ جائے گی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ لالہ متی جوگنیوں کی

بیویوں کے لئے " بھگوان کے بچے " پیدا کرنے کا انتظام کرتی ہے۔

کوچہ بلی ماروں میں ایک بند دوکان کے تختوں پر سو کر منو نے رات گذاری۔ گھر وہ اس لئے نہیں گیا کہ کہیں کوئی بھوت پریت نہ لپٹ جائے۔ یا کوئی یہ نہ سمجھے کہ چوری کرنے آیا ہے۔ صبح اُٹھ کر وہ اس خیال سے اسٹیشن گیا کہ کل کی طرح آج بھی اسٹیشن سے سول لائن کوئی بوجھا اٹھا کرے جائے گا اور دن بھر کے پیسے کما لے گا۔ جب وہ اسٹیشن پہنچا تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ اور لاہور سے ایک پسنجر گاڑی ابھی آئی ہی تھی۔ اور سینکڑوں مسافر اتر رہے تھے۔ امیر لوگوں نے تو ٹمٹمیں اور تانگے کرائے پر لے لئے۔ متوسط الحال لوگ گاڑیوں میں بیٹھے، گاڑی والے خوب گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے۔ رہے کسان تو انھوں نے اپنا اپنا سامان اپنے کندھوں پر رکھا۔ اور پیر گھسیٹتے اپنے گاؤں کی طرف چل دیئے۔

منو اس ہجوم میں شامل ہو گیا اور ادھر اُدھر دوڑنے، بھاگنے، گھبرائے ہوئے لوگوں میں گھس گیا " لالہ جی آپ کا سامان اٹھا لاؤں، رے مائی جی آپ کا سامان اٹھاؤں "۔ اس نے اپنے دل میں یہ سوچا تھا کہ صرف ایسا ہی کوئی کنجوس سامان اٹھوائے گا جو تانگے میں بیٹھنے کا کرایہ نہ دینا چاہے یا پھر سول لائن کا کوئی مسافر ہوگا۔ لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ تانگے میں بیٹھنے کا کرایہ صرف ایک آنہ ہے اور اگر کوئی اتنا کنجوس ہو کہ ایک آنہ بھی نہ خرچ کرے پھر وہ سامان بھی خود ہی ڈھوئے گا، مزدور یا قلی سے کیوں اٹھوانے لگا۔

کچھ لوگ نیلی وردیاں پہنے اسٹیشن کے ہال میں کھڑے کھڑے چلا رہے تھے " قلی، قلی "۔ منو نے دیکھا کہ ان میں سے دو نے اپنے سروں پر ٹرنک اور بستر رکھے اور باہر چلے گئے۔ انھیں مزدوری مل گئی تھی۔

منو بھی چلانے لگا "قلی۔ قلی"

"یہاں آ" اندر کے کمرے سے ایک آواز آئی۔

منو اُدھر دوڑا۔ اس کے پاؤں اسٹیشن کی ریت کی گرمی سے جھلس رہے تھے اور منہ پسینہ سے تربتر تھا۔ اس کے سامنے ایک پولیس کانسٹبل کھڑا تھا۔

"کیوں بے حرامزادے، لائسنس ہے؟" پولس کے سپاہی نے منو کی قمیص گلے پر سے پکڑ لی۔

منو کو تو جیسے سکتہ ہو گیا، دل تھا کہ زور زور سے دھڑکے جا رہا تھا اور منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔

"جواب دے۔ سور۔ لائسنس کہاں ہے تیرے پاس" کانسٹبل نے ڈنڈا تانا اور اور بھی زوروں میں چیخنے لگا۔

"سرکار" منو نے زبان کھولنے کی کوشش کی "میں ..."

"ابے میں کے بچے! لائسنس نہیں ہے نا۔ سور کا بچہ! دھوکا دیتا ہے ہمیں" پولیس والا چلائے جا رہا تھا "میں تجھے ایک مہینے سے یہاں دیکھ رہا ہوں۔ بیچ۔ کمین"

"نہیں حضور، میں تو صرف ایک ہی دفعہ اور آیا تھا"

منو نے رونا منہ بنایا۔ ڈر کے مارے اس طرح حواس باختہ تھے کہ اب مار پڑی کیونکہ کانسٹبل بڑی زور سے اس کی کلائی پکڑے تھا۔

"اچھا تو میں جھوٹ بول رہا ہوں کہ میں ایک مہینے سے دیکھ رہا ہوں کہ تو یہاں سونگھتا پھرتا ہے"

"وہ کوئی اور ہوگا حضور! میری ہی صورت کا ہوگا۔ ہم قلی تو سب

ایک ہی جیسے لگتے ہیں،،

"ابے ملیچھ، پنچ! سور کہیں کا، ہم سے چال چلتا ہے۔ ٹھہر تجھے حوالات میں بند کرتا ہوں،، اور اس نے منو کا ہاتھ زور سے مروڑا

"ارے نہیں حضور، نہیں حضور،، منو گڑگڑانے لگا۔ اُسے وہ حوالات یاد آ گئی جہاں پر بھاگو پیٹا گیا تھا۔

"نکل یہاں سے،، کانسٹیبل نے منو کے چوتڑ پر ایک ڈنڈا رسید کیا "نکل یہاں سے بہن ... یہ سرکاری حکم ہے۔ یہاں کوئی قلی لائسنس بنا کام نہیں کر سکتا،،

منو سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اس نے صرف ایک مرتبہ مڑ کر پولس والے کو دیکھا، وہ اپنی وردی کو جھاڑ جھوڑ کر تن کے کھڑا ہوا اور پھر لٹو کبوتر کی طرح ادھر ادھر اینڈتا پھرنے لگا۔

جب پولیس والے کا غصہ ذرا کم ہوا تو منو کے دل میں پھر اس جبر اور حکومت کے خلاف غصے کا سیلاب اٹھنے لگا "وہ کون ہوتا ہے مجھے اسٹیشن سے نکالنے والا، سور کہیں کا، پولیس کی وردی کیا پہن لی کہ اپنے کو بھگوان ہی سمجھنے لگا۔ کوئی یہی اکیلا انگریزی سرکار کا نوکر نہیں ہے میرا چچا بھی سرکاری نوکر ہے۔ میں کچھ پرجا نہیں ہوں کہ پٹ لوں گا۔ مرجاؤں تب بھی اس سے باز نہ آؤں۔ آخر پہاڑی ہوں،،

اسے ایسا لگا کہ اس کے غصے کے اس طوفان میں پولیس والے کی ہستی بالکل دب کر رہ گئی ہے۔ لیکن مڑ کر دیکھا تو کانسٹیبل ٹہلتا ہوا اسٹیشن سے باہر نکل رہا تھا۔ اور منو دوڑنے لگا، یہاں تک وہ سول لائن کی مال روڈ پر پہنچ گیا۔ جہاں چاروں طرف انگریزی دوکانیں تھیں۔

یہ جدید دنیا بھی کس قدر ڈراؤنی تھی، ہر طرف انگریزوں کے بڑے بڑے کمپاؤنڈ والے بنگلے تھے، منو کی عادت تو ہمیشہ گنجے تنگ محلوں میں رہنے کی تھی۔ یہاں وہ اپنے کو بالکل غیر اور اجنبی محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اُسے یہاں کی صفائی اور ستھرائی بڑی پسند آئی۔ بڑے بڑے کھلے برآمدے جن میں ہوا آسکتی تھی، مگر گرمی کا دخل نہ تھا، پتھر، کنکریٹ اور سیمنٹ کی خوبصورت سجل عمارتیں اور ان کی لمبی لمبی شیشے جڑی ہوئی کھڑکیاں۔

ایک دوکان کی کھڑکیاں اُسے خاص طور پر بہت اچھی لگیں، اندر طرح طرح کی شیشیوں، بوتلوں اور شیشے کے پیالوں میں قسم قسم کے رنگ کا پانی بھرا رکھا تھا۔ طرح طرح کے صابن، عطر، تیل وغیرہ سجے تھے لیکن تجسس میں اس نے اپنا ہاتھ جو بڑھایا تو معلوم ہوا کہ شیشے کی چمکتی ہوئی دیوار درمیان میں بُری طرح حائل ہے۔

ایک دروازے پر بہت سے انگریز مردوں عورتوں اور بچوں کی تصویریں لٹک رہی تھیں۔ منو کے دل میں یکایک خواہش پیدا ہوئی کہ کاش اس کی تصویر بھی اس صاحب کی طرح کھنچ سکتی جو سوٹ پہنے، سفید کار لگائے، تنکوں کی ہیٹ اوڑھے بڑی شان سے ایک تصویر کے بادامی چوکھٹے میں سے جھانک رہا تھا۔ لیکن بھلا وہ صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے صاحب کہاں اور اس کے اپنے چیتھڑے اور گندہ جسم کہاں۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ پاس ہی سے دو ہندستانی انگریزی لباس پہنے گذر گئے۔ منو سوچنے لگا کہ شاید انگریزی لباس پہننے کے لئے پڑھا لکھا ہونا یا امیر ہونا ضروری ہوگا۔ اس کی نگاہ ایک موٹے سے لالہ جی پر پڑی جن کی لمبی سی چٹیا ان کے سفید بستر کے انگریزی لباس کو جھٹلا رہی تھی۔ وہ گاہکوں کے انتظار میں اپنی دکان کی شیشہ

لگی کھڑکیوں کے پیچھے بیٹھے تھے۔ خوبصورت عمارتیں چاروں طرف کھڑی تھیں، سیاہ نیلی اور فاختئی موٹر کاریں دوڑ رہی تھیں، فٹنیں اور بگھیاں ڈامر کی سڑک پر ایسی پھسلتی جا رہی تھیں کہ قطعی آواز تک نہ ہوتی تھی۔ حسن اور رفتار کی اس دنیا میں منو کے بھی سارے جسم میں انبساط کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ وہ جلدی جلدی چلنے لگا۔

"کدھر جاتا؟ کالا آدمی"۔ ایک دم سے ایک چیں چیں سی باریک آواز اس کے کانوں میں آئی۔ دراصل منو نے جنکنس اینڈ کمپنی کے جنرل اسٹور والی دوکان کے شیشے سے اپنی ناک چپکا دی تھی۔ اندر انگریزی مٹھائیوں کے مرتبان سجے سجے ہوئے تھے۔ ایک میم صاحبہ اس کے سامنے دکھائی دیں سرخ و سفید رنگت پر باریک باریک کتھئی چھائیاں ہندستانی معمار کے مطابق تو ننگی نہیں کیونکہ ان کے ریشمی لباس میں ان کے دبلے پتلے بازو، پنڈلی ایسی ٹانگیں اور سپاٹ چھاتیاں بخوبی دکھائی دیتی تھیں۔

"کدھر جاتا۔ دیکھتا نہیں؟" اور سخت نفرت کا اظہار کرتے ہوئے منہ بنایا۔

ان کی یہ بگڑی ہوئی ہندستانی تو منو کی سمجھ میں ذرا بھی نہ آئی لیکن جس طرح وہ اس کی ہوا سے بھی بچکر چل رہی تھیں اس سے اسے یہ معلوم ہو گیا کہ کسی وجہ سے وہ اسے سخت قابل نفرت شے سمجھ رہی تھیں۔ اپنے چچا اور شام نگر والے بابو کے رویہ سے اسے معلوم ہو چکا تھا کہ انگریز برتر قوم ہیں، اور ہم ان کے آگے ذلیل ہیں۔ لہٰذا اس موقعہ پر اسے اپنی ہتک زیادہ محسوس نہ ہوئی۔ بلکہ وہ تو خوش ہوا کہ خیر کم از کم میم صاحبہ نے اسے بات کرنے کے لائق تو سمجھا۔ اسے یہ خیال ہوا کہ شاید کبھی وہ بھی ان لوگوں کے برابر چلنے کے لائق ہو جائے

اور اس خواہش کو دل میں چھپائے وہ ریلوے کا پل پار کر گیا جو صاحب لوگوں کی اس دنیا اور دیسی دنیا کو الگ الگ کرتا تھا۔

کچھ کوڑھی فقیر بیٹھے بھنبھنا رہے تھے: "ایک پیسہ بابو ایک پیسہ" کچھ اندھے سڑک پر ادھر سے اُدھر گاتے بھیک مانگتے پھر رہے تھے۔ منو تو ایک اور ہی دنیا سے گذر کر یہاں آیا تھا۔ اور اپنے تئیں برتر سمجھ رہا تھا کہ پانچویں کلاس تک پڑھا ہے، اور ایک ایسے بابو کے یہاں نوکری کر چکا ہے جہاں ایک مرتبہ ایک انگریز بھی آیا تھا۔ اگرچہ اس کے اور تجربات تلخ بھی تھے اور ذلیل تر بھی مگر اس نے جلدی سے ان کو بھلا دیا اور صرف اسکول کی پڑھائی اور شام نگر والے بابو کے یہاں ایک ہی کمرہ میں اپنی اور انگریز صاحب کی موجودگی پر دھیان دینے لگا۔

اتنے میں گاڑیوں کے اڈے اور پانی سرا کا شور پکار سنائی دینے لگا اور وہ ان سب میں کھو گیا، سانولے، مانولے، کھردرے، داڑھی رکھے ہوئے کسان اپنی اپنی گٹھڑیاں کاندھوں پر رکھے ایک لاری کے چھوٹنے کے منتظر تھے، سرخ سرخ کلوں والے غضور صورت پٹھان کلاہیں باندھے، زردوزی کی سرخ مخملی صدریاں، گھیردار شلواریں اور موٹے موٹے چپل پہنے چھریاں اور جڑی بوٹیاں بیچ رہے تھے، دُبلے دُبلے ہندو حلوائی، چکنے کپڑے پہنے اپنے پیتل کی تھالیوں میں مٹھائیاں سجائے دبکے بیٹھے تھے۔ گائیں بھینسیں چارہ کھا رہی تھیں، گھوڑے ہنہنا کر ٹاپیں مار رہے تھے۔ اس بھیڑ میں منو بڑی آسانی سے گھل مل گیا، وہ تو ان سب باتوں کا خوب عادی تھا، ایسے ہجوم میں سب ہی کھپ جاتے ہیں، چاہے کوئی بڑبڑاتا ہوا دیوانہ ہو، ننگا سادھو ہو، یا فراک کوٹ اور پتلون پہنے ہوئے کوئی انگریز ہی کیوں نہ

ہوا لیکن پھر وہ فوراً ہی میلے کرتے پائجامے۔ ننگے پاؤں اور سر پر چیٹ باندھے ہوئے قلی ہونے ہی پر قناعت بھی کر لیتا تھا۔ اسے تو دراصل سب سے بڑی فکر یہی کھائے جاتی تھی کہ کام کیسے ملے اور کہاں ملے۔

سبزی منڈی وہ جانا نہیں چاہتا تھا، اور تلسی کی واپسی سے پہلے گھر جانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ ویسے بھی آخر ایک مہینہ بعد تو گھر چھوڑنا ہی تھا۔ تب پھر کیا ہوگا۔ تلسی تو مزے میں تھا۔ وہاں منڈی میں مزدوری کر سکتا تھا لیکن میں؟ منو سوچنے لگا "میں کیا کروں؟ واپس چلا جاؤں۔ کہاں شام نگر؟" اُسے یاد آیا کہ اس نے اپنے چچا کو خط تک نہیں لکھا تھا۔

منو کے لئے دیا رام مرے کے برابر تھا اور دیا رام کے لئے منو مرے کے برابر تھا۔ وہ سر جھکائے خیالات میں غرق چلا جا رہا تھا کہ ڈھول کی آواز سنائی دینے لگی۔ دگڑ دگڑ دھم۔ دگڑ دگڑ دھم۔ دھم۔ دھم۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا کہ ایک دو ٹنڈی پیٹنے والا چوراہے پر آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ کئی آدمی ہیں جو ہاتھوں میں رنگین پوسٹر لئے ہوئے ہیں۔ اُن میں سے ایک تصویر میں ایک عورت صاحب لوگوں کے سے کپڑے پہنے سینے پر ان گنت تمغے لگائے، کئی عضو شیروں، چیتوں اور ہاتھیوں کو چابک سے مارتی ہوئی دکھائی گئی تھی۔ دوسری تصویر میں وہی عورت لیٹی تھی اور ایک بڑی سی چٹان اس کے سینے پر رکھی تھی۔ ایک تیسری تصویر میں وہی عورت آدمیوں سے بھری ہوئی ایک موٹر کو اپنے بالوں سے کھینچ رہی تھی۔

"مس تارا بائی! مس تارا بائی"، نقیب چلا رہا تھا "مس تارا بائی دیوی عورت، دنیا کے بہترین سرکس کی مالک، دولت پور شہر میں آخری بار اپنا کمال دکھا رہی ہے۔ طاقت کا ایسا کمال جو ہفت اقلیم میں

بھی نہ دکھائی دے گا۔ طاقت کے کمالات ان کے انعام
وہ ولایت کے تمام بادشاہوں اور ملکاؤں سے میڈل حاصل
کر چکی ہے۔
جنگلی درندوں کو نچا دکھانے والی آرٹسٹوں کی ملکہ، آج رات
کو ولایت جانے کے لئے بمبئی روانہ ہو جائے گی۔ آیئے اور
آخری بار دیکھ لیجئے۔ اب برسوں تارا بائی ادھر نہ آئے گی۔ یہ آخری
موقعہ ہے۔ مس تارا بائی مس تارا بائی، اس زمانہ کی سب سے
عجوبہ عورت!"

اور پھر اس نے زور زور سے ڈھول بجایا دگڑ دگڑ دھم دگڑ
دگڑ دھم۔ دھم۔ دھم۔ اور آگے بڑھ گیا۔

"میں ضرور سرکس جاؤں گا اور سبھی بھی جاؤں گا۔ منو نے لپک کر
ایک اشتہار لے لیا۔ جو کچھ لوگ پیچھے تقسیم کرتے آ رہے تھے لکھا تھا

مدن لال تھیٹر کے باہر
ہال گیٹ کے پاس
مس تارا بائی ——— زنانہ رستم ہند
دنیا کا بہترین تماشہ ——— خوبصورت شاندار کھیل

کوئی پچاس گز کے فاصلے پر ہال گیٹ تھا۔ اس کی سرخ سرخ
اینٹیں تیز دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ اور کوئی سو گز پرے، مدن لال تھیٹر
کی شاندار عمارت کے سامنے سرکس کا لمبا چوڑا تنبو تنا ہوا تھا۔

"بمبئی۔ بم بم۔ بم بم۔ ٹاؤن ہال کے بڑے گھڑیال کا گھنٹہ
گہنا ہوا سا دھم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ گھنٹے کے بار بار ہلنے میں منو کی زندگی کو

تمام عناصر گونج رہے ہیں اور اس نے جو کچھ بمبئی کے متعلق سنا تھا سب اس کے ذہن میں گردش کرنے لگا۔

سبزی بازار کے ایک قلی نے، جس کا بھائی بمبئی چلا گیا تھا، منو کو بتایا تھا کہ بمبئی میں کسی بھی فیکٹری میں انسان پندرہ روپے سے لے کر تیس روپیہ مہینے تک کما سکتا ہے۔ اور ویسے بھی وہ ایسا عجیب و غریب شہر ہے کہ مرنے سے پہلے تو اُسے ضرور ہی دیکھنا چاہیے۔ قلی نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کے بھائی نے لکھا ہے کہ دن رات کوشش کر کے اتنا روپیہ جمع کر لو کہ بمبئی پہونچ سکو کیونکہ ایک مرتبہ بمبئی پہونچنے کے بعد پھر تو کام بہت۔ وہاں سے جہاز سات سمندر پار بھی جاتے ہیں۔ ناریل اور کیلے کے درختوں کی بہتات ہے اور اس جزیرے پر بڑے بڑے امیر پارسی اور جنوبی ہندستان کے اور لوگ رہتے ہیں۔

"ہاں جزیرہ تو وہ ہے ہی۔ جزیرہ"، منو کو اپنی جغرافیہ کی کتاب یاد آ گئی جس میں اس نے پڑھا تھا کہ مالابار کے ساحل پر ایک جزیرہ ہے جس کو بمبئی کہتے ہیں "بم بئی۔ بمبئی میں ضرور بمبئی جاؤں گا"۔

وہ ایک چھوٹے سے باغ سے گذر کر ایک نالے کو پھلانگ کر دوسری طرف تاراباائی کے شاندار سرکس کے تنبو کی چوٹی نظر آ رہی تھی۔ اس نے اشتہار پڑھ کر معلوم کر لیا تھا کہ رسیٹ ٹکٹ آٹھ آنے کا ہے۔ اور اس نے یہ بھی ارادہ کر لیا تھا کہ بغیر دام دیئے سرکس دیکھے گا۔ اس نے سوچا کہ پہلے کے دیئے ہوئے روپے کو اس طرح فضول خرچ نہیں کروں گا۔ اور دھوتی کے کونے میں بندھے ہوئے چاندی کے روپے کو چھو کر اطمینان کا سانس لیا۔ عام طور پر وہ بے پروائی کیا کرتا تھا لیکن اس وقت وہ بے ایمانی پر تیار ہو گیا تھا۔ آخر وہ اپنے مالک کی مہربانی اور عنایت کو بے کار کیوں جانے دے۔ چنانچہ وہ عام دروازے سے

داخل نہیں ہوا۔

ایک کمیت گھوڑا، ایک سفید گھوڑی اور ایک چھوٹی ناک کا خچر گھاس کا ایک گٹھا کھانے میں لگے تھے اور خرخر کرتے جا رہے تھے۔ منو نے چپکے سے دیکھا کہ ایک پھرتیلا آدمی کھڑی مونچھیں رکھے اِدھر اُدھر پھر رہا ہے۔ اس کی صورت بہت کچھ گاؤں کے دواساز سوراب جی سے ملتی جلتی تھی مگر فرق یہ تھا کہ سوراب جی ہمیشہ سفید زین کا پتلون اور سیاہ کوٹ پہنا کرتا تھا اور یہ شخص برنجیں پہنے تھا۔

منو ایک گندے سے خیمے کے نیچے گھس گیا اور ایک منٹ تک تماشے کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر اس نے دیکھا کہ داہنی طرف سے ایک ہاتھی، ہوتے ہوتے خیمہ کے دروازہ سے اندر داخل ہو رہا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے شہر کے بہت سے لونڈے چلے آ رہے ہیں۔ ایک سیاہ رنگ کا مہاوت ہاتھی کے سر پر بیٹھا تھا اور اس کے پاؤں ہاتھی کے کانوں کے پیچھے چھپ گئے تھے، ایک لونڈا اپنے دوستوں سے کہہ رہا تھا۔

"پتہ بھی ہے یہ ہاتھی ناچتا ہے، سیڑھیوں پر چڑھتا ہے اور بانسلی بھی بجا سکتا ہے"

منو بھی دوڑ کر اس لونڈہار میں شامل ہو گیا۔

لیکن ان لڑکوں میں سے ایک نے منو کے اس طرح شامل ہونے سے سمجھا کہ وہ حملہ کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ منو کا صافہ سر پر سے اچک کر ہاتھی کے منہ پر پھینک دیا۔ ہاتھی نے نہایت ادب سے سلام کیا۔ اور صافے کو ایسے چبا گیا گویا وہ گھاس کا کوئی تنکا تھا۔ پہلے منو نے اس کا جواب یوں دیا کہ اس لڑکے کی ٹوپی چھین کر ہاتھی پر پھینک دی۔ اب تو اس لڑکے نے منو کی

گردن ناپ لی۔

لیکن منو ذرا لڑکھڑا کر سنبھل گیا اور اپنے مخالف کی ٹانگ پر ٹانگ جو رکھ کر اٹھائی تو وہ نالے میں تھا۔ جب وہ بڑی مشکلوں سے کیچڑ میں لت پت نالے سے باہر نکلا، تو سب لونڈے ٹھٹھے لگانے لگے۔

اس جھگڑے سے ہاتھی ذرا بدکا۔ مہادت نے ایک لوہے کی انکسی نکال کر اُسے کونچی اور ساتھ ہی ساتھ منو کو گالیاں دینے لگا۔

"اس نے پہلے کیا۔ اس نے شروع کیا" منو معافی مانگتے ہوئے بولا۔

مہادت نیچے کودا، اور منو کا کان پکڑ کر اُسے ڈرانے کے لئے ہاتھی کی سونڈ کے پاس لے گیا۔ سب لڑکے چیخیں مار مار کر بھاگے۔ منو نے سوچا کہ آ گئی موت لیکن ہاتھی نے اس پر صرف ایک زور کی پھونک ماری اور آگے بڑھ گیا

"میں نہیں ڈرتا" منو نے تن کر کہا۔

مہادت مسکرا دیا۔

"اچھا۔ اچھا" ۔ مہادت بولا "جاؤ وہ گھسیارا گھاس کا گٹھا لئے سڑک پر جا رہا ہے نہ، ذرا اُسے بلا لاؤ"

منو تو چاہتا ہی تھا کہ کسی طرح مہادت کو مشکور کر دے تاکہ مفت سرکس دیکھنے کو ملے، اور وہاں جگہ مل جائے جہاں بغیر پاس کے کسی کو گھسنے نہیں دیا جا رہا تھا۔ وہ گھسیارے کے پیچھے بھاگا، اُسے سرکس کے اصطبل کے دروازے ہی پر جا لیا، اور اپنے ساتھ لے آیا۔ جب گھاس والا گھاس لے آیا تو منو مسکرا کر لجاجت سے بولا۔

"میں تماشہ دیکھنا چاہتا ہوں"

"بس بس اب جاؤ" بہادت نے یوں ہی کہا۔
"دیکھو نا میں نے تمھارا کام کر دیا" منو مصر رہا۔
بہادت خیمے کے پیچھے جانے لگا۔ نہایت خوبصورتی سے منو دبے پاؤں اس کے پیچھے ہولیا۔
"دیکھو نا آخر میں نے تمھارا کام کر دیا" منو کہتا گیا۔ اب وہ دونوں خیمے کے پیچھے کافی دور جا چکے تھے۔
"اُونہہ تو میرا پیچھا کیوں پکڑ لیا ہے" بہادت نے جھنجھلا کر کہا۔
"یہیں کہیں بیٹھ جا۔ خیمے کے کسی سوراخ میں سے دیکھ لینا"
اور وہ چلدیا۔ منو نے خیمے میں سوراخ ڈھونڈنا شروع کیا۔ لیکن کوئی سوراخ نظر نہ آیا۔ اس نے ایک طرف سے خیمے کا پردہ اٹھانا چاہا۔
"ارے ہاں ہاں ایسا نہ کرنا" بہادت کی تیز آواز اس کے کانوں میں پہنچی "سارا خیمہ گر پڑے گا۔ یہاں سے دیکھو، یہاں سے"
بہادت نے اپنی انگلی سے خیمے میں ذرا سا چیر دیا تھا اور منو ادھر لپکا۔
تماشہ شروع ہو گیا تھا۔ چاروں طرف گیلری میں دوڑ کر کرسیاں ہی کرسیاں بھری پڑی تھیں۔ پاس ہی ایک انگریزی بینڈ بج رہا تھا، اور خیمے کی چھت سے لگی ہوئی دو رسیاں تنی تھیں۔ جن پر اسی کا ناچ کرنے والے ابھی ابھی اپنا کمال دکھا چکے تھے، ایک رسی سے کود کر دوسری رسی پہ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے لچک دار جسم تھک گئے اور وہ میدان سے باہر نکل گئے۔ تالیاں اس زور سے بجیں کہ منو کا دل دھڑکنے لگا، پھر تالیوں کا یہ شور ایک اور شور میں غرق ہو گیا۔ مس تارا بائی سامنے آگئی تھیں،

اُسی ہاتھی کی طرح جھومتی جھامتی جو منو کا صافہ چبا گیا تھا۔ مجمع میں بڑے زور وشور سے تالیاں بجیں۔

خیمے کے اُس چرے ہوئے روزن میں سے منو اس کی صورت اور خدوخال تو اچھی طرح نہ دیکھ سکا لیکن اس میں پھرتی تو بجلی کی سی تھی۔ وہ زمین پر لیٹ گئی، ایک بڑا سا پتھر اس کے پیٹ پر رکھ دیا گیا اور وہ چپ چاپ مزے میں لیٹی رہی۔ دو آدمیوں نے ہتوڑوں سے اس پتھر پر چوٹیں لگانی شروع کیں جیسی منو نے سڑک کوٹتے وقت بڑے پتھروں کو توڑنے کے لئے لگائی جاتی دیکھی تھیں۔ آخر کار وہ ایک دم سے پتھروں کو الگ پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور حاضرین کی طرف سر جھکایا۔ خیمہ تالیوں سے گونج اٹھا۔

منو پر تو جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو۔

لیکن اس کے فوراً ہی بعد، منو کے بائیں ہاتھ سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر کچھ آوازیں آئیں اور ایک سفید گھوڑا تڑاتڑ کرتا خیمے کے اسٹیج پر آیا منو نے اپنی آنکھ روزن میں چپکا دی۔ اور دیکھنے کے لئے پل پڑا۔ گھوڑے کے ساتھ ساتھ ایک نوجوان آدمی بھی اندر داخل ہوا جو بہت ہی چست قسم کے انگریزی برجیس اور ایک لمبا سا جھلملاتا ہوا روپہلا کوٹ پہنے تھا۔ آدمی کیا تھا اچھی خاصی ربر کی لچک گیند تھا۔ زمین سے اُچکا اور تیز دوڑتے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ایک منٹ تک وہ گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑا رہا پھر قلابازی کھا کر سر کے بل اس کے سر پر کھڑا ہو گیا ٹانگیں ہوا میں چرگئی تھیں، اور پھر جو قلابازی کھائی تو دم پر سے پھسلتا ہوا نیچے جیسے سنگ مرمر کی سیڑھیوں سے اتر آیا ہو۔

منو تو حیرت سے انگشت بدنداں رہ گیا۔ اور منہ کھولے تکتا ہی

رہا۔ اُس کا تو دماغ چکرا گیا جیسے کوئی معجزہ ہو رہا تھا۔

"اگر میں ایسا کروں تو کیسا ہو"، لیکن اس شخص کا ہوا میں یوں غلاظی کھانا اور پھر سر پر آکر ٹکنا، یہ سب وہ بھلا کیسے کر سکتا تھا۔ یہ شخص بھی ضرور سات سمندر پار ولایت جا رہا ہوگا۔ جہاں سے صاحب لوگ آتے ہیں، لیکن میں وہاں کیسے جا سکتا ہوں۔ میں قلی ٹھہرا لیکن میں بمبئی تو ضرور جاؤں گا شاید وہاں اتنے پیسے کما سکوں کہ پھر سات سمندر پار جا سکوں"

پھر تالیوں کا ایک شور اٹھا اور دو مسخرے کہیں سے وارد ہو گئے عجیب عجیب مضحکہ خیز قسم کی ٹوپیاں لگائے۔ رنگ برنگے چھینٹ دار بند کی دار کپڑے پہنے، چہرے رنگے ہوئے سفید، لال، کالے، کتھئی۔

پہلے تو وہ ایک ربڑ کی گیند سے کچھ کرتب دکھاتے رہے، اپنی نقلی بڑھائی ہوئی ناکوں پر گیند جھیل لیتے، کبھی اُچھال دیتے، پھر اُن رسی کے ناچنے والوں کی نقل کرنے لگے بڑی بھدی طرح سے، اور منو پر بالکل وہی اثر ہوا جو ان کا مقصد تھا، یعنی ہنسی۔

اب شیروں کے پنجرے آنے لگے۔ ... ...

لیکن اتنے میں ہاتھی والا مہاوت اُدھر سے گذرا اور منو کو کھینچ لیا۔

"اے لڑکے چل۔ کچھ کام کر۔ یہ پانی کی بالٹیاں ذرا میرے ساتھ اٹھوا، بہت سرکس دیکھ چکا"

منو کے لئے تماشہ چھوڑنا بڑا مشکل تھا لیکن اس نے سوچا کہ یہ سب مزے اس مہاوت ہی کی بدولت ملے۔ لہٰذا اس کی مدد کرنے سے انکار کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اپنی جگہ سے جہاں دبکا ہوا تھا۔ ذرا لنگڑاتا لنگڑاتا

اٹھا اور مہادت کے پیچھے ہولیا۔

"لیکن ہاتھی تو ایک بالٹی سے زیادہ پیتا ہوگا"، منو نے کہا اسے ڈر ہو رہا تھا کہ اب خدا جانے کتنی بالٹیاں دھونی پڑیں گی۔

"ہاں، ہاں۔ لیکن ابھی تو میں صرف ہاتھی کی ٹانگیں دھو رہا ہوں" مہادت نے جواب دیا۔

منو نے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک بالٹی اٹھالی، احاطہ کے ایک کونے میں نل کے پاس لے جاکر بھرا اور پھر ہاتھی کے پاس لے آیا۔ ہاتھی ابھی تک کھڑا ہوا وہ گھاس کھائے جا رہا تھا جو مہادت نے خریدی تھی۔

"ہر ایک پہچان سکتا ہے کہ میں قلی ہوں" منو بالٹیاں لاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اور اُسے بڑی مایوسی سی ہوئی کہ وہ اس گھوڑے والے آدمی کی طرح کبھی ولایت نہ جا سکے گا۔ "لیکن بمبئی تو شاید چلا ہی جاؤں"، اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ پانی کی بالٹیاں لانے سے منو کی خاصی ورزش ہوئی اور اس کے جسم میں جو لانی سی محسوس ہونے لگی۔ نل کے تین پھیرے کرنے کے بعد تو وہ بالکل ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ "میں اس آدمی سے پوچھتا ہوں مجھے بمبئی لے جائیے گا یا نہیں؟"۔ ہاتھی کے پاس ہی کھڑا ہو کر وہ ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا۔

"آپ مجھے اپنے یہاں نوکر رکھ لیں گے اور بمبئی لے چلیں گے"۔ اس نے آخر دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھ ہی لیا۔ جواب کے انتظار میں اس کا تمام خون گردش کرنے لگا اور جسم تن سا گیا۔

"میں تمھیں یہاں نوکر تو نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ ہاتھی چلانے کا کام بہت دن کی مشق کے بعد آتا ہے، اور ہم لوگ اب سات سمندر پار

جانے والے ہیں۔ لیکن تم اس سرکس کی ریل میں کہیں گھس پھس کے ضرور بیٹھ سکتے ہو اور ہمارے ساتھ بمبئی پہنچ سکتے ہو۔ میں خود جب تمہارے برابر تھا تو مال گاڑیوں میں ادھر اُدھر دب دبا کر سارے دکھنی ہندستان کا سفر کیا تھا۔"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں نا" منو نے اس مہیم سے وعدے کو اور پختہ کرنا چاہا۔

"ہاں، ہاں بھئی" بہادر بولا "تم یہیں ٹھہر جاؤ۔ ہمیں سامان وامان باندھنے میں مدد دو۔ میں تمہیں قلی کے کام کے پیسے دلوا دونگا۔ اور رات کو گاڑی میں کہیں گھسا دوں گا"

"آپ کتنے اچھے ہیں" منو کا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا "آپ کی مہربانی کا شکریہ کیسے ادا کروں"

"ش ش" بہادر بولا "بولو مت۔ کوئی سن لے گا۔ آؤ ہاتھی کے لئے ابھی اور گھاس لانا ہے"

چوتھا باب

سرکس کی خاص ریل کے انجن نے زور سے سیٹی دی اور پھر کھسکنے لگا۔

منو ایک کھلی گاڑی کے سرے سے لگا، لپٹے ہوئے خیموں کے ایک ڈھیر پر چت لیٹا اندھیرے میں تاروں کو تک رہا تھا۔ دولت پور چھوٹنے کے صدمے سے اور کچھ کچھ ڈر سے اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُسے اس خوفناک رات کی یاد آئی جب وہ شام نگر سے بھاگا تھا لیکن اُس وقت اُسے اِتنا پسینہ نہیں آرہا تھا جتنا اُس وقت آیا تھا اور نہ ہی اس کا دل ملامت کر رہا تھا۔ یہ سفر کرنے کا حق اس نے دن بھر سخت محنت کر کے حاصل کیا تھا۔ بڑے بڑے بوجھ اُٹھائے تھے۔ خیمے کی لوہے کی میخیں اور پہیے دن بھر ڈھو ڈھو کر گاڑیوں میں لادے تھے۔ جانھیں اٹھا کر ریل تک لائی تھیں۔ اس وقت اُسے اتنی تنہائی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی، کیونکہ پاس ہی نوکروں کے کسی ڈبے میں بہادت بھی تھا۔

لیکن رات کے اندھیرے میں انجن کی سیٹی میں اب بھی وہی بھیانک

پن تھا جو ایک سال پہلے اُسے محسوس ہوا تھا جیسے کوئی بھوت چیخ رہا ہو۔

بہرحال یہ سب باتیں تو ماضی کی تھیں، ایک گئی گذری دنیا کی جو اس دنیا سے بالکل مختلف تھی جدھر وہ اس وقت جا رہا تھا۔ وہ پرانی دنیا جو دولت پور سے بھی مختلف تھی، اب پیچھے، بہت ہی پیچھے چھوٹ چکی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ شام نگر اور دولت پور دونوں اس کے ذہن سے ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں ـــــ دونوں نے اس کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کیا تھا۔

اور اب تو اس کا رخ ایک نئی دنیا کی طرف تھا۔ بڑے سے شہر کی نئی اور انوکھی دنیا، بڑے بڑے جہازوں اور موٹروں کی دنیا، جہاں شاندار عمارتیں، حسین باغات ہوں گے، امیر آدمی ہوں گے، بہت ہی امیر آدمی جو گیلوں میں اِدھر اُدھر قلیوں کو روپیہ بکھیرتے ہوں گے۔

ریل، دھیرے دھیرے، برما آئل کمپنی کے بڑے بڑے پمپوں کے پاس سے گذر رہی تھی۔ منو کا دل چاہتا تھا کہ ریل اور تیز چلے کیونکہ اگرچہ وہ محفوظ تھا، پھر بھی اُسے یہ خدشہ لگا ہوا تھا کہ اب کوئی آیا اور نکال باہر کیا۔ اور پھر سبزی منڈی کا چکر ہوگا اور وہ ہوگا "میں تو مر جاؤں پھر بھی نہ جاؤں" اس نے اپنے دل میں کہا "وہاں کام کرنے سے تو اچھا ہے کہ مجھے موت آجائے"۔ پختہ ارادے کے لوگ جب کسی خیال پہ قائم ہو جاتے ہیں تو پھر اس کی ناکامیابی کا نتیجہ ان کے لئے موت کے برابر ہوتا ہے۔

انجن کی رفتار تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ اب تیز، مسلسل اور ہموار رفتار میں تبدیل ہو گئی تھی۔

دولت پور کی اونچی اونچی پانچ منزلہ عمارتیں پیچھے چھوٹتی جا رہی تھیں، گرم ہوا سرسر چلنے لگی تھی اور کنوں کے بھونکنے کی آواز انجن کی گرج

میں ڈوب گئی۔

منو، کینوس کے خیموں کے ڈھیر پر اٹھ بیٹھا، رات کے اندھیرے میں آسمان زمین کے درمیان، پھلوں کے درختوں کے جھنڈ سیاہ سیاہ دکھائی دے رہے تھے۔ مکانات کی چھتیں رات کے اندھیرے میں غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ دولت پور کے مینار، گنبد اور ٹیڑھی میڑھی دیواریں اندھیرے میں کھوتی جا رہی تھیں۔ منو نے سوچا کہ کہیں یہ مناظر اس کے ذہن پر نقش نہ ہو جائیں، وہ لیٹ گیا، آنکھیں بند کر لیں اور سوتے ہی سو گیا۔

ریل صرف ایک جگہ صبح تڑکے جا کر رکی۔ اور دوسرے پلیٹ فارموں پر اور ریلوں کی گڑگڑاہٹ اور مسافروں کی دوڑ بھاگ سے منو کی نیند میں کسی قدر خلل آ گیا، "کیا معلوم کون سا اسٹیشن ہے"، اس نے نیم خوابیدہ حالت میں اپنے آپ سے کہا لیکن آنکھیں نہیں کھولیں۔ سودے والے چلا رہے تھے۔ ہندو مٹھائی، مسلمان روٹی، گرم گرم چائے، ٹھنڈا پانی، اور اس چیخ پکار میں منو کو سنائی دیا "انبالہ جنکشن، انبالہ سٹی"

"کالکہ لائن گاڑی بدلی کرو"

ایک مکھی بھنبھنا تی ہوئی آئی اور گاڑی کے سن سن سے اس کی آواز ملنے لگی، صبح کی ٹھنڈی ہوا نے اس کے دماغ کو تر و تازہ کر دیا، دنیا نظروں سے اوجھل ہو گئی ——— وہ پھر سو گیا۔

اب کی منو دہلی سنٹرل اسٹیشن پر جاگا۔ منو نے تو اپنی کتابوں میں ہندوستان کے دارالسلطنت کے متعلق بہت کچھ پڑھا تھا، لیکن اسٹیشن کی یہ ٹین کی چھت سے تو شہر کی بڑائی کا ذرا بھی اندازہ نہ ہو سکتا تھا۔

یکایک اس نے جھانک کر دیکھا تو مردوں، عورتوں اور بچوں کا

ایک ہجوم پلیٹ فارم پر جمع تھا۔ ڈبے تمام پورے بھر چکے تھے لیکن لوگ تھے کہ چیختے چلاتے دھکے مارتے گھسے ہی چلے آتے تھے۔

منو نے اس بھیڑ بھڑکے سے یہ فائدہ اٹھایا کہ دوسری طرف کود گیا۔ ریل لائنوں کے جال میں ایک سگنل کے پاس بیٹھ کر فراغت حاصل کی، پھر آ کر لیٹ گیا اور ایک نیند اور لینے لگا۔

اتنے میں وہ مہادت آ پہونچا "آؤ میں کسی بند ڈبے میں تمہارے لئے جگہ کر دوں۔ دن کو یہاں بڑی گرمی ہوگی۔ اور یہ لو تمہارے لئے میں نے کچھ کھانا خریدا ہے" منو کو دیکھ کر گاڑی سے اترا اور اپنے مربی اور مہربان کے پیچھے پیچھے ایک ایسے ڈبے میں داخل ہوا جہاں تمام بانس ہی بانس بھرے ہوئے تھے۔

"یہ لو کھانا۔ میں اب زنلام کے اسٹیشن پر آؤں گا" مہادت بولا اور پھر چلا گیا۔ منو نے ابھی کھانا شروع ہی کیا تھا کہ گاڑی اسٹیشن سے روانہ ہو گئی۔

منو، لذیذ پوریاں اور گاجر کا اچار کھاتا جاتا تھا اور سوچتا جاتا تھا، کہ یہ مہادت بھی کتنا دریا دل آدمی ہے۔ اس کے دل میں اپنے آپ یہ سوال اٹھنے لگا کہ بعض لوگ پرجا اور اس مہادت کی طرح اچھے کیوں ہوتے ہیں، اور بعض گنپت اور اس پولیس والے کی طرح خبیث کیوں ہوتے ہیں۔ جس نے مجھے ریلوے اسٹیشن پر پیٹا تھا۔ پھر وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا بنجر زمین میں جنگلی جھاڑیوں اور درختوں کی جڑوں اور ٹھونٹھوں کے درمیان کتنی ہی عمارتیں، محلات، مسجدیں، قلعے کھڑے تھے۔ تپتے ہوئے سورج کی دھوپ بغیر جلائے ہی ایک عجیب طرح کا سادھواں پیدا کر رہی تھی۔

منو کو اس کہانی کا خیال آیا جو اس نے دلی کے متعلق سنی تھی کہ اس شہر کو سورج بنسی راجاؤں نے بسایا تھا۔ شاید اسی وجہ سے سورج اب مسلمانوں کی ان عمارتوں کو تباہ کر کے ان سے بدلہ لے رہا ہے کیونکہ انھوں نے سورج بنسیوں کے خاندان کو تباہ جو کر دیا تھا۔ ان عمارتوں کے بعد میلوں تک سر اڈورڈ لٹین کی بنائی ہوئی نئی دہلی کی سرخ سرخ عمارتیں تھیں، جیسے کسی نے ایسندھن چن دیا ہو اور منو کا پہلا خیال ذرا اور پختہ تو ہو گیا لیکن اس بات پر ذرا شک ہی رہا کہ سورج انگریزی عمارتوں کو بھی جلا سکے گا یا نہیں کیونکہ اس نے اپنی تاریخ کی کتاب میں یہ جملہ پڑھا تھا: سلطنت برطانیہ میں سورج کبھی نہیں غروب ہوتا۔

پھر دو کسان لڑکوں کو دیکھ کر منو جیسے آسمان سے دھم سے زمین پر آ رہا۔ لق و دق چٹیل میدان میں یہ دو نحیف بچے ہاتھوں میں کھردرے ڈنڈے لئے اپنی بھینسوں کو ریت اور دھول کے ان میدانوں میں ہانک رہے تھے۔

منو سوچنے لگا کہ ان لوگوں کی ساری ساری عمر اسی میں گذر جاتی ہے کہ اس بنجر زمین سے کسی نہ کسی طرح پیٹ پالنے کے لائق کچھ حاصل کر سکیں۔

پھر پہاڑوں کا ایک جھنڈ آ گیا۔ بڑی بڑی چٹانیں اور سرخ مٹی کے تودے دکھائی دینے لگے اور باقی دنیا نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ جب میدان پھر دکھائی دینے لگا تو منو کا ذہن ان خیالات سے خالی ہو چکا تھا اور وہ یوں ہی بیٹھا میلوں تک پھیلی ہوئی ریت کو تکتا رہا۔ سورج اپنی تیز کرنیں بنجر زمین پر برسا رہا تھا اور کہیں کہیں کوئی سوکھی جھاڑی یا ٹنڈ منڈ درخت اس منظر کے آڑے آ جاتا تھا۔

یکایک ریت کا ایک بگولہ اٹھا، دھول اور مٹی کو سمیٹتا ہوا، اور گیند کی طرح چکر کھاتا ایک غار میں جا گھسا۔

منو کو ایسا لگا جیسے وہ کسی راجپوت جنگجو کا بھوت ہو، کیونکہ یہ ایک عام عقیدہ ہے کہ شہیدوں کی روح طوفان بن بن کر دنیا میں آیا کرتی ہے، لیکن وہ خود تو ریل میں بیٹھا ہوا کافی محفوظ تھا، گاڑی بڑی شان سے وسیع اور پھیلی ہوئی زمین بلکہ وسیع تر آسمان، اور سنگدل آفتاب کا بھی جو زمین کو بھونے ڈالتا تھا، مقابلہ کرتی، دندناتی آگے بڑھی چلی جا رہی تھی۔

"ریل بھی کیا ہی خوب چیز ہے"، منو نے سوچا "اگر ریل نہ ہوتی تو میں شام نگر سے پیچھا چھڑا کر دولت پور کبھی نہ جا سکتا، اور بمبئی تو ہرگز بھی نہ جا سکتا کیونکہ اتنا سفر بھلا کوئی پیدل کیسے طے کر سکتا ہے" لیکن اب جو میں بمبئی جا رہا ہوں تو وہاں کروں گا کیا۔ کسی کو جانتا بوجھتا نہیں۔ سبزی منڈی والے نلی نے جس تیس روپے مہینے والی نوکری کا ذکر کیا تھا وہ مجھے کیسے ملیگی، بھکاریوں کی طرح گلیوں میں بھیک تو مجھ سے کبھی نہ مانگی جائے گی" اس کے نگاہوں کے سامنے ریگستان کے رہنے والے سیاہ فام مردوں، عورتوں اور بچوں کی صورتیں پھرنے لگیں جو دولت پور کے گلی کوچوں میں بھیک مانگتے پھرا کرتے تھے۔ اور وہ ذلت اور خواری جو وہ برداشت کرتے تھے بڑی دل ہلا دینے والی تھی۔

لیکن ابھی تو میری دھوتی کے کونے میں ایک روپیہ بندھا ہے اور سبزی منڈی والے نلی نے تو کہا تھا کہ بمبئی میں کام ملنا آسان ہے۔ اس نے بمبئی کی سڑکوں اور گلیوں کا تصور کرنا شروع کیا۔ اونچی اونچی عمارتیں، دولت کے سول لائنز کے سے سفید، ستھرے، سجل مکانات اس کی نظروں میں پھرنے لگے۔ اس کے سوا اور اس سے زیادہ وہ تصور بھی کیا کرتا۔

ریل گاڑی کے جھٹکوں اور دوپہر کی تپش سے اس کا جوڑ جوڑ دکھ

رہا تھا اور سر چکرا رہا تھا۔ نیند کے خمار کو دور کرنے کے لئے وہ بار بار ریگستان کو تکنے لگتا۔ لیکن باہر کی چمکتی ہوئی تمازت اس کے دماغ میں پھر ایک تضاد پیدا کر دیتی۔ یہاں تک کہ غیر ارادی طور پر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ نیند میں کھو گیا۔

گاڑی کو یک لخت ایک دھچکا لگا اور منو کی آنکھ کھل گئی۔ شام ہو چلی تھی اور سامنے ایک سیاہ تختے پر انگریزی اور ہندستانی حرف میں "کوٹہ جنکشن" لکھا تھا۔ منو اب بھی پسینہ میں تر اکڑا ہوا، بانسوں پر لیٹا تھا۔

"یہ لو۔ میں تمہارے لئے تھوڑی سی مٹھائی اور دودھ لایا ہوں" بہادر آیا اور بولا۔ "اور یہ لو لوری۔ رات کو اسے بچھا کر سو جانا۔ آج کی رات تم کھلی گاڑی میں نہ سو سکو گے۔ کیونکہ کمپنی کے پارسی مالک اِدھر اُدھر پلیٹ فارم پر ٹہلا کرتے ہیں۔ مجھے اپنے ہاتھی سے زیادہ تو تمہاری دیکھ بھال کرنی پڑ رہی ہے مگر خیر مجھے تمہاری مدد کرنے سے بڑی خوشی ہے۔ جب میں بھی تمہاری عمر میں تھا تو ایک آدمی نے مجھے کلکتے سے مدراس جانے میں مدد دی تھی۔ اچھا اب ذرا سنبھل کر رہنا، گر نہ پڑنا"

"اچھا" منو نے جواب دیا، اور للچائی نظروں سے پیڑوں، گلاب جامنوں اور دودھ سے بھرے ہوئے پورے کی طرف دیکھا۔

گاڑی چل پڑی اور پھر ریگستان کے وسیع میدان طے کرنے لگی، اپنے غضبناک اور جرمی انجن کا دامن پکڑے، جو کبھی کبھی سامنے سے آتی ہوئی گاڑیوں کو خبردار کرنے کے لئے تیز سیٹی بجاتا تھا۔ اور پھر وہ گاڑیاں بجلی کی سی سرعت اور بادل کی سی گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ دندناتی ہوئی پاس سے نکل جاتیں۔

آفتاب کی تمازت سے تپتے ہوئے صحرا میں بھی ایک عجیب

حسن نظر آرہا تھا۔ ریت کے بڑے بڑے تودوں میں زندگی سی جھلکتی تھی، اونٹوں کی وہ لمبی لمبی قطاریں، نکیل لگی ہوئی، ایک دوسرے میں بندھے، ریگستانوں کو پار کرتے ہوئے، ان کے پیچھے جفاکش اور تند خو انسان جو بھوک اور طوفان سے بیک وقت جدوجہد کرتے معلوم ہوتے تھے۔ کہیں کہیں خیموں کا کوئی جمگھٹا یا کوئی ٹوٹی پھوٹی پرانی عمارت دکھائی دیتی تھی تو منو کو ان سرائوں کا خیال آجاتا تھا جو اس نے شام نگر کے مضافات میں دیکھی تھیں اور وہ سوچتا کہ گھوڑوں کے ان سوداگروں اور گائے بھینسوں کے ان رکھوالوں کی زندگی بھی کیسی کٹھن ہوگی۔ لیکن افق لامتناہی تھا، اور گرم ہوا لگتے لگتے منو کی آنکھیں جلنے لگیں۔ آفتاب کی کرنوں میں جھلی ہوئی ہوا ایسی لگتی تھی جیسے کوئی بہت بڑا دہکتا ہوا تنور ڈکارے لے کر پھونک مار رہا ہے۔

شام ہوتے ہوتے چٹیل مسطح زمین اور میدان ختم ہونے لگے اور زیادہ تر پہاڑ دکھائی دینے لگے جن کے اوپر قلعے بنے ہوئے تھے۔ اور بڑے بڑے دور دور تک پھیلے ہوئے ٹیلے جن پر ڈوبتے ہوئے دن کے شوخ اور چمکدار رنگ بڑی محبت سے کیکر کے درختوں سے گلے مل رہے تھے، نیچی نیچی گھنی جھاڑیوں کے آس پاس بکریاں چر رہی تھیں اور اونٹ اپنی لمبی لمبی گردنیں تان تان کر پتے کھا رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی گدلی ندیوں کے پار ذرا ذرا سے جھونپڑوں کی بستیاں آباد تھیں۔ عورتیں دودھ کے مٹکے سر پر رکھے گھونگھٹ نکالے، شرماتی، لجاتی، چلی جا رہی تھیں، مرد ریل کی طرف جھک جھک کر سلام کر رہے تھے اور ننھے ننھے ننگ دھڑنگ بچے، بے پروائی سے انگلی چوستے ہوئے آنکھیں پھاڑے ریل کو تکنے لگتے تھے۔

منو کو اپنا بچپن یاد آگیا جو پہاڑوں میں بسر ہوا تھا۔ بیل گاڑی کے

راستوں پر کس مزے سے کھیل ہوا کرتا تھا۔ وہ موٹی توند والا شیشن، دبلا پتلا بشمبر اور اتراتا ہوا جے سنگھ!

لیکن کانگڑا کے اودے اودے پہاڑ بہت پیچھے رہ گئے تھے، وہاں ریل گاڑی کا کہیں گذر نہ تھا، دیکھنے کو بھلا کیا ملتی۔ اور منو دل میں سوچنے لگا، کہ اچھا ہی ہوا جو میں وہاں سے چلا آیا۔ اور اب تو میں بمبئی جا رہا ہوں۔ وہاں بڑی عجیب عجیب چیزیں دیکھنے کو ملیں گی، شام نگر اور دولت پور سے بھی زیادہ عجیب!"

منو سوچتا جا رہا تھا اور ریل چلتی جا رہی تھی، سرسبز گھاس اور جنگلی پھولوں سے لدے ہوئے ٹیلے پیچھے چھوٹتے جا رہے تھے، اور گاڑی ایک سرسبز وادی میں داخل ہو رہی تھی جہاں چاروں طرف لال اور اودے پہاڑ تھے۔ منو سوچنے لگا کہ چتوڑ کا وہ پرانا قلعہ بھی یہیں کہیں ہوگا جہاں پدمنی اور دہلی کے غلام شہنشاہ علاء الدین کا مقابلہ ہوا تھا۔ میواڑ کے بہادر سورماؤں نے کیسری لباس پہن کر جوہر کی رسم ادا کی اور محل کی عورتوں نے رانی کے ساتھ ستی ہو کر بھسم ہو جانا قبول کیا مگر فاتحین کے ہاتھ سے بے عزت ہونا گوارا نہ کیا۔ کاش میں بھی یہ قلعہ دیکھ سکتا۔ کاش وہاں جا سکتا۔ لیکن وہاں مزدوری کہاں ملے گی۔ مجھے بمبئی ہی جانا چاہئے، بمبئی جہاں مزدوری ملتی ہے ——— معلوم کب پہنچیں گے بمبئی "

انجن زور سے سیٹی دیتا ہوا نظام کے اسٹیشن میں داخل ہو گیا اور یکایک دن کی روشنی رات کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

اور پھر جب انجن رات کی مہکی ہوئی فضا کو چیرنے لگا تو منو کو ایسا لگا کہ تارکے کھمبے بڑی سرعت سے گذرتے جا رہے ہیں۔ اور جب منو بہت

کا لایا ہوا کھانا کھانے لگا تو ایسا معلوم ہوا کہ وقت کی رفتار تھم گئی ہے۔ لیکن رات کے اندھیرے میں، ریت کے ٹیلوں اور نیچی نیچی پہاڑیوں کی چوٹیوں، ستاروں کی لالٹینیں جگمگا رہی تھیں۔ آسمان اب سیاہی مائل گہرا نیلا نظر آرہا تھا، کہیں کہیں روشنی کی ایک باریک سی تہہ دی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اور ساری کائنات ایک نامعلوم سی فضا میں لپٹی ہوئی منو کے چاروں طرف پرچھائیں کی طرح ناچ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کہیں نہ کہیں سے بھوت پریت اب نکلے کہ نکلے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کی تھپکی سے منو کو نیند آگئی۔ اور وہ بانس کی ناہموار سطح پر رکھی ہوئی بوریوں پر پڑ کے سو گیا۔

آنکھ کھلی تو چاروں طرف کھجور، نیم اور کسیرو کے درخت اپنی چھاؤں پھیلا رہے تھے اور بڑ دوہ کے ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے تھے۔ مہاراجہ کے خاص سیلوں نے جس پر سفید چمک دار پالش تھی، اور جس کی چمک آس پاس ہر ایک چیز کو شرما رہی تھی، منو کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی کچھ سپاہی سفید بگھیں اور سیاہ کوٹ پہنے، سروں پر سنہری ٹوپیاں لگائے، پاؤں میں شام نگر والے بابو جی کے سے سیاہ چمکدار بوٹ ڈالے۔ سیلون کے آس پاس منڈلا رہے تھے۔

منو نے سوچا کہ اب تک مجھے ایسے جوتے نصیب نہیں ہوئے اگر بمبئی میں کام مل گیا تو سب سے پہلے ایسے جوتے لوں گا"

اب میلوں تک ہرے بھرے میدان پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں بیچ بیچ میں پہاڑیاں اور چٹانیں تھیں، کہیں بڑے بڑے مندر تھے اور اونچی اونچی عمارتیں جن کی چمنیوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ منو کا دل گھبرانے لگا۔ اب وہ منزل پر پہونچنے ہی والا تھا اور اسے رہ رہ کر شبہ ہو رہا تھا کہ

کام سے گیا یا نہیں۔

پانی کی ایک لمبی روپہلی لکیر دکھائی دینے لگی جس کا خاتمہ نظر ہی نہ آتا تھا۔ کہیں کہیں سے یہ لکیر ٹوٹ کر گول گول چمکدار ستارے سے بن گئے تھے اور اس اشتیاق سے منو کا دل بلیوں اچھلنے لگا کہ اب وہ زندگی میں پہلی مرتبہ سمندر دیکھے گا۔ جلد ہی یہ نیلا نیلا پانی ریل کے پل کے نیچے آگیا، اور منو کے قدموں تلے سے بہنے لگا۔ منو کا دل دھڑک دھڑک کے اس کا ساتھ دینے لگا، خوشی کے اس احساس سے اس کے دل کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہوگیا۔ اس نے ایک جھرجھری لی کہ ڈر جو اُسے خاموشی کے ساتھ نیچے گھسیٹ رہا تھا کم ہو جائے اور بوری پر سے اُٹھ کر کھڑکی کے پاس آگیا۔ سمندر کی ہوا اس کے چہرے پر لگ تو رہی تھی مگر پسینہ کی ایک ہلکی سی پرت بھی چھوڑ رہی تھی۔ اس نے اپنی میلی قمیض سے اپنا منہ پونچھا اور ریت کے ذرے جو اس پر لگے تھے، اس کے نرم نرم گالوں پر جم گئے۔ پھر اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر کر دیکھا تو ہتیلی پر بہت سے کوئلے کے ذرے چپک گئے تھے۔ وہ پریشان اور عاجز ہو کر رونکھا ہوگیا اور ٹھنڈی سانس بھرنے لگا۔ کس غضب کی تنہائی تھی۔ لیکن پھر وہ صبر کر کے چپکا ہو بیٹھا اور سرسبز کھیتوں کا نظارہ دیکھنے لگا جو سمندر کی اور اس اور صبح کی ہلکی ہلکی دھوپ میں نہا رہے تھے۔

"میں اترتے کے ساتھ ہی اپنی طرف کے کسی آدمی کو ڈھونڈوں گا" وہ سوچنے لگا۔ "لیکن اتنے بڑے شہر میں کوئی ملے گا کیسے"

اب اس نے دیکھنا شروع کیا کہ بمبئی شہر شروع ہوگیا۔ بڑی بڑی فیکٹریوں کی دیواروں پر انگریزی حروف اور کسی اجنبی زبان کے حروف میں مختلف نام لکھے تھے، رستم جی جمشید جی، کریم بھائی وغیرہ اور سب کے آگے بمبئی لکھا

تھا۔ شمال سے جنوب کے اس طویل، دو ہزار میل کے سفر میں کوئی شہر منو نے ایسا نہ دیکھا تھا جس کے مضافات یوں میلوں تک پھیلتے چلے گئے ہوں۔ یہ دنیا ہی اور تھی، ایک عظیم الشان دنیا!۔

ریل دوڑ رہی تھی، کھجوروں اور ناریلوں کے جھنڈوں سے گذرتی، مندروں کے سنہری کلسوں، مسجدوں کے شاندار گنبدوں، گرجاؤں کی بلند چوٹیوں سے ہوتی ہوئی، ملوں، مسانوں، قبرستانوں، بڑے بڑے مکانوں کے پھولوں سے لدے ہوئے باغوں، مچھلی سکھانے کے میدانوں سے نکلتی، بڑے بڑے میدانوں میں لوگ کپڑے رنگ رہے تھے، ریشم اور سوت کے کپڑوں کو طرح طرح کے رنگوں سے رنگا جا رہا تھا۔ بھیڑوں بکریوں کے گلے چر رہے تھے بھینسوں اور گایوں کے ریوڑ پھر رہے تھے، مرد، عورتیں اور بچے قسم قسم کے لباس پہنے غول کے غول ادھر سے ادھر گھوم رہے تھے۔ اور ریل ان سب کے درمیان سے دندناتی چلی جا رہی تھی۔

منو کی روح کو وحشت ہونے لگی، پیٹ میں کھلبلی سی مچی اور منہ کا مزا سوکھ کر تلخ ہو گیا۔ وہ گھبرا گھبرا کر کبھی ادھر دیکھتا کبھی اُدھر، کبھی سیٹ کو کھرچنے لگتا، کبھی پاؤں اٹھاتا کبھی رکھتا۔ ٹانگیں بالکل اکڑ گئی تھیں، دماغ گھوم رہا تھا۔ خون اس زور سے گردش کر رہا تھا کہ جیسے معلوم نہیں کتنا دوڑا ہو، چہرہ زرد پڑ گیا تھا، جسم پسینہ سے تر تھا اور ذہن بالکل خالی اور کھویا ہوا۔

مضافات کے اسٹیشن پر اسٹیشن گذرتے جا رہے تھے بالآخر کار ریل نے ایک آخری سیٹی بڑے زور سے دی، بریکوں سے ایک آخری دردناک چیخ سنائی دی، اور پھک پھک کرتی ریل آہیں بھرتی، جیسے وہ حد سے زیادہ تھک گئی ہو، وکٹوریہ ٹرمنس کے عظیم الشان پلیٹ فارم سے

لگ گئی۔

منو نے گھبرا کر پلیٹ فارم کے دوسرے حصے کو دیکھا جہاں ایک مال گاڑی کھڑی تھی کہ بہادت کے آنے کا انتظار کرے یا دوڑ کر گودام میں گھس جائے جہاں کچھ قلی سامان کے بورے اٹھا رہے تھے اور جہاں سے گلی میں نکل بھاگنا نسبتاً آسان تھا۔

"آؤ بھئی! تم جس شہر آنا چاہتے تھے آ گئے"، چیکر دو بہادت آہی پہونچا۔ "اب یہ ٹرین یہاں سے ہمیں لے کر بلیئر ڈپیر جائے گی اور پھر وہاں سے ہم ولایت جانے والے جہاز میں سوار ہو جائیں گے۔ یہ لو میں کچھ کھانا لایا ہوں، اور ادھر آؤ تمھیں اسٹیشن سے باہر نکلنے کا ایک ایسا رستہ بتا دوں کہ تمھیں کوئی نہ دیکھ سکے"۔

اب وہ اس آدمی کے سامنے کھڑا تھا جس نے اس پر اتنی مہربانی کی تھی لیکن اس سے شکریہ ادا کرتے بھی نہیں بن پڑ رہا تھا۔ بلکہ اس کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی، دل چاہتا تھا اس کے پاس سے کہیں بھاگ جائے وہ بہادت کے پیچھے ہو لیا۔

"شہر جتنا ہی بڑا ہوتا ہے اتنا ہی وہ انسان پر ظلم کرتا ہے"، بہادت ریلوں کے نیچے سے نکلتا ہوا کہنے لگا۔ "یہاں سانس لینے کے بھی دام دینے پڑتے ہیں۔ مگر تم تو بڑے بہادر لڑکے ہو"۔

اب وہ گودام کے پاس پہونچ گئے تھے۔

"اب یہاں سے اپنے نکل جاؤ، جیسے تم کوئی معمولی آدمی ہو۔ بھگوان تمھاری رکشا کرے"۔

منو نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا، بدصورت چہرہ تو صرف ایک

خول تھا۔

منو اس کی ہدایت کے مطابق چلنے لگا، اس کا دل اور احسان مندی سے پھٹا جاتا تھا ——— اور پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا تو اپنے آپ کو ایک چوک میں پایا۔

منو وکٹوریہ اسٹیشن سے باہر نکلا۔ اس کے سامنے بمبئی تھا ——— عجیب و غریب بمبئی، مخلوط، گوناگوں اور بوقلموں ——— جس کی گلیوں میں کہیں سرخ سرخ گالوں والے یورپین عمدہ سوٹ اور ٹنکوں کی ہیٹ پہنے طوطے کی ایسی ناکوں والے، فراک کوٹ، سفید پتلون اور گنبد نما ٹوپیاں پہنے پارسیوں کے پہلو بہ پہلو گھوم رہے تھے، تو کہیں گھیر دار شلواریں لمبے کرتے اور ترکی ٹوپیاں پہنے مسلمان، ڈبلے پتلے ململ کے کرتے دھوتیاں اور سیاہ کشتی نما ٹوپیاں پہنے ہندوؤں کے ساتھ ساتھ پھر رہے تھے، پارسی عورتوں کی قیمتی بھڑکدار ساریاں، ہندو عورتوں کے زیور سے لدے ہوئے جسموں سے ٹکر کھا رہی تھیں اور پردہ دار عورتوں کے معمولی سفید برقعوں اور مرد مار یورپین عورتوں کے سادے لباسوں کو شرما رہی تھیں۔ بجلی کے ہارن پوں پوں کرتے گونج رہے تھے۔ وکٹوریہ اور ٹرام کی گھنٹیاں ٹن ٹنا رہی تھیں، ٹراموں میں کتنے ہی قسم کے لوگ ٹھسے تھے۔ منو نے ان میں سے عربوں، پارسیوں ایرانیوں اور چینی لوگوں کو پہچان لیا۔ طرح طرح کی زبانیں بولی جا رہی تھیں جو اس کی سمجھ میں بالکل نہ آئیں۔

رنگ، ہیولے اور مختلف اشکال کے اس عجیب و غریب اختلاط کو منو حیرت سے تکتا رہا۔ کئی طرح کی زبانیں سنیں، ہر بار ایک نئی طرح کی بو

سونگھی۔ ایسی قسم قسم کی بو میں اس نے کبھی نہ سونگھی تھیں، میلے پسینے کی بو دھول اور گرمی کی بو، لہسن اور ادرک کی بو، پیشاب، پاخانے اور گوبر کی بو، اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے اور روح جو آگے بڑھے جانے کا خاموش تقاضہ کر رہی تھی۔ وہ رک گیا۔

جلدی سے وہ ایک فٹ پاتھ پر ہو لیا جہاں ذرا خاموشی تھی اور اس دنیا کے مقابلے میں اپنی طاقت کا اندازہ لگانے لگا۔ داہنے ہاتھ کو بڑے ڈاک خانے کے عظیم الشان مینار اور گنبد تھے، بائیں طرف ریلوے اسٹیشن کے بڑے بڑے مینار اور گنبد تھے۔ دور سامنے یونیورسٹی اور کچہری کے شاندار مینار اور گنبد تھے۔ اور یہ سب گاتھک اور مغل شان عمارت میں ایک دوسرے سے بازی لے جا کر منو سے یہ فیصلہ کروانا چاہتے تھے کہ ہم میں سے کون سب سے زیادہ عظیم الشان اور حیرت انگیز ہے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ منو ایک بھولا بھالا پہاڑی لڑکا ہے جو ہر عمارت کی شان دیکھ کر اسے بڑا ہی سمجھا کرتا تھا، اور اس طرح کی شان و شوکت کے مقابلے میں اپنے کو ہمیشہ ذلیل اور حقیر قرار دے لیا کرتا ہے۔

منو گھبرا گیا، اور پریشان ہو کر اپنے منھ سے پسینہ کے بہتے ہوئے چشمے پونچھتا بازار کی طرف چلا، یہاں تک کہ اسے ملکہ وکٹوریہ کا ایک سنگ مرمر کا، بھاری کوٹ والا چھوٹا سا بت دکھائی دیا۔ بت کے ہاتھ میں ایک لپٹا ہوا کاغذ تھا اور سر پر تاج! جس پر ایک کوا بیٹھا ہوا اگنے کے بعد اپنے پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ بت کے نیچے ہی ایک بنچ پڑی تھی۔ منو بنچ کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اور بازار کی طرف سے نگاہ پھیر لی جہاں لوگوں کا ایک ہجوم ٹرام کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ٹرام آئی پہیوں پر چلتی بغیر کسی

سہارے کے لیکن منواب سنبھل کر بیٹھ رہا تھا اور جہاوت کا دیا ہوا کھانا کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے مٹھائی کی پڑیا کھولی اور دیکھنے لگا۔ پیلی پیلی نکتیاں، سرخ گلاب جامنیں اور سفید پیڑے، اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کتنی لذیذ مٹھائیاں تھیں، لیکن اس کا پیٹ بھی تو خالی تھا۔ اس نے بچکے بھر بھر کر کھانا شروع کر دیا کہ مزہ بھی نہ آیا۔ بس نہ چلتا تھا کہ کس طرح سب ایک ہی دفعہ چٹ کر جائے۔ جب دونے میں صرف ایک ہی پیڑا رہ گیا تو منو کو پیاس لگی اور اس نے ادھر اُدھر دیکھا کہ کہیں نل ہو تو پیاس بجھائے، اس کی نظر کا بچنا تھا کہ کوے نے جو ملکہ وکٹوریہ کے سر پر بیٹھا تھا، ایک جھپٹا مارا اور دونے کو اس کے ہاتھ سے چھین کر فٹ پاتھ پر گھسیڑ دیا۔ منو چونکا، اسے ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی، "چور کا بچہ" اس نے گالی دی۔

پھر تو کوؤں کا ایک جم غفیر اس کے سر پر جمع ہو گیا۔ سب کے سب مٹھائی پر ٹوٹ پڑے اور لے کر اپنی محفوظ جگہ، ملکہ وکٹوریہ کے سر اور بھاری بھرکم جسم پر جا بیٹھے۔

منو گھبرا کر اٹھا اور کوشش کرنے لگا کہ کسی اور کی نگاہ نہ پڑے "اس چور کے بچے کو ضرور معلوم ہوگا کہ میں رستہ میں پڑی ہوئی چیز نہیں اٹھاؤنگا جہاں لوگ جوتے لے کر چلتے ہیں۔ میری آنکھ بچی اور کیا مکاری سے لے اڑا۔ چالاک حرامی کہیں کا"

اب منو فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ جہاں قدم قدم پر لوگ بکھرے ہوئے تھے۔ کہیں کوئی بوڑھا جوتشی ماتھے پر تلک لگائے، لمبی سفید داڑھی، موٹا سا جسم ململ کے لباس میں لپٹا بیٹھا کسی گجراتی کی قسمت کا لکھا پڑھ کر بتا رہا تھا۔ کہیں کوئی مسلمان حجام اپنے استرے اور دوسری چیزیں بکھیرے

بڑا سا آئینہ سامنے رکھے، گاہکوں کے انتظار میں بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا، کہیں کوئی کتب فروش کتابیں اور رسالے پھیلائے بیٹھا تھا جن پر یورپین عورتوں کی تصویریں بنی تھیں اور کچھ کتابچے رکھے تھے جن پر ہندستانی زبان کے بڑے بڑے الفاظ میں جنسیات کے رازہائے پنہانی عیاں کئے گئے تھے۔ کچھ آگے بڑھ کر ایک پھل والا اور پھر ایک مٹھائی والا تھا اور ذرا اور آگے بڑھ کر ایک قلی کہنیوں کے بل سکڑا ہوا لیٹا تھا، جیسے کم سے کم جگہ گھیرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس مزدور کو اس طرح لیٹا دیکھ کر منو کا دل ڈوب گیا۔ اُسے ایک دم سے محسوس ہوا کہ یہاں بھی قلی سڑکوں پر سوتے ہیں۔ پھر اُسے اس قلی کی بات یاد آئی جس نے کہا تھا کہ بمبئی کی سڑکوں پر دولت بکھری پڑی رہتی ہے اور اس نے سوچا کہ کتنی غلط تھی وہ بات، کیسا خام تھا وہ خیال! پیاس کے مارے اس کی زبان اینٹھی جا رہی تھی، حلق میں کانٹے سے پڑ گئے تھے۔ اور ہاتھ پاؤں الگ جواب دیئے دے رہے تھے۔ رات کا بھیانک تصور اس کی نگاہوں تلے ناچ رہا تھا آج کی رات بمبئی کی گلیاں ہوں گی اور وہ تنہا ہوگا، اس نے جلدی سے اس خیال کو بھلا دینے کی کوشش کی اور اس کا دماغ بالکل خالی ہو کر رہ گیا۔

اب وہ ایک چوراہے پر آ گیا تھا۔ چاروں سڑکوں پر ہر طرف اونچی اونچی شان دار عمارتیں تھیں، دولت پور کی سول لائن کی عمارتوں سے ملتی جلتی، صرف اتنا فرق تھا کہ یہاں یہ عمارتیں میلوں تک چلی گئی تھیں۔ ایک لحظہ کے لئے وہ اس جگہ پر جیسے گڑ سا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے، تہذیب و تمدن کی دنیا میں قدم رکھے یا نہ رکھے۔ پھر اس نے دیکھا کہ لوگ فٹ پاتھ پر مزے سے آ جا رہے ہیں اور ان لوگوں میں چند قلی بھی ہیں جن کے کرتے دھوتیاں اس کے اپنے کپڑوں سے بھی زیادہ میلی ہیں۔ اور وہ آگے

بڑھنے لگا۔ بیچوں بیچ سڑک میں پولیس کا ایک سپاہی کھڑا تھا، نیلی اور پیلی وردی پہنے جو شمالی حصوں کی وردی سے مختلف تھی، اس کی پنڈلیاں ننگی تھیں، اور ٹوپی سر پر ترچھی رکھی ہوئی تھی۔ منو بڑی تیزی سے اس پولس والے کے اٹھے ہوئے ہاتھ کے پاس سے بھاگا اور ایک بڑی سی بلڈنگ کے دروازے پر لگے ہوئے پیتل کے بورڈ کے پاس جا کر اپنی رفتار فوراً سست کر دی۔ بورڈ پر بڑے بڑے کالے رنگ کے، انگریزی حروف میں لکھا تھا "کاکس اینڈ کمپنی"۔ اس نے ایک دو حرف پڑھے اور ایک مسرت سی محسوس کی، ان حروف کے پڑھنے سے وہ صاحب لوگوں کی دنیا کے ذرا قریب آ گیا تھا۔ پھر اُسے یاد آیا کہ دولت پور میں اُن میم صاحبہ نے کیسی جھڑکی دی تھی، اور آگے بڑھتا ہوا ڈر سا محسوس ہونے لگا۔ لیکن یہاں تو فٹ پاتھ پر کتنے ہی ہندستانی آجا رہے تھے۔ زیادہ تعداد تو ان کی ہی تھی، لال چقندر تو خال خال تھے۔

چنانچہ وہ چل پڑا۔ لیکن اب اُسے پیاس اور بھی زوروں سے لگ رہی تھی۔ اس نے بازار کے اس سرے سے اس سرے تک نظر دوڑائی کہ شاید کہیں دولت پور کا سا خیراتی پیاؤ کہیں نظر آ جائے، لیکن کہیں کوئی نل یا کنواں نہ تھا کہ وہ پیاس بجھا سکتا، وہاں تو بس فرنیچر کی دکانوں کی بڑی بڑی شیشے کی کھڑکیاں تھیں، وہ ختم ہوئیں تو کسی آفس کا برآمدہ شروع ہو گیا۔ کہیں کسی بینک کی پراسرار سیڑھیاں آ گئیں۔

آخر منو کو، شیشے کے دروازوں کے پیچھے، کنوئیں کے پردے کے سرے پر سوڈا واٹر اور لیمن کی رنگی برنگی بوتلیں سجی ہوئی نظر آئیں۔ اندر، انگریزی کرسیوں پر لوگ بیٹھے کھا پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ منو نے ایک مرتبہ دولت پور میں کسی کام سے جاتے وقت، بالی سوڈے والے کے یہاں

سے ایک بوتل سوڈا پیا تھا، اور اس وقت بھی اس کا دل چاہا کہ سوڈا پیا جائے۔ لیکن اندر جتنے لوگ بیٹھے تھے اُن کے لباس صاف ستھرے تھے۔ وہ یا تو سوداگر لگتے تھے اور منو تو صرف ایک پھٹیچر قلی تھا۔ لیکن سوڈا واٹر کا دام تو صرف ایک آنہ ہوتا ہے اور میری مٹھی میں ایک روپیہ ہے۔ چلو پی ہی لوں" اس نے اپنے دل میں سوچا۔

بوجھل بوجھل قدم اٹھاتا وہ اندر داخل ہوا۔ لیکن اشتیاق کے مارے اس کا دل اڑا سا جا رہا تھا۔ اب وہ بڑے سے ریسٹوران میں اندھوں کی طرح کھویا ہوا کھڑا تھا۔ داہنی طرف ایک خالی میز دیکھی تھی، منو اس کے پاس جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

گھبراہٹ اور تھکن سے اس کا دماغ اڑا جا رہا تھا اور اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہوا میں قلابازیاں کھا رہا ہے۔ اس نے آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور اپنے آپ کو سنبھال کر ادھر اُدھر دیکھا۔ گرم گرم چائے کو لوگ طشتریوں میں انڈیل انڈیل کر سپ سپ پی رہے تھے۔

ابھی منو نے اُن عجیب و غریب لوگوں کی طرف سے نگاہ ہٹائی ہی تھی کہ ایک لمبا سا آدمی، ململ کا کرتہ دھوتی پہنے، سر میں خوب سا تیل چپڑے سیدھی مانگ نکالے اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "قلی؟"

"ہاں" منو نے اقرار کیا اور دل کی دھڑکن رک سی گئی۔

"تو نیچے فرش پر بیٹھیو، کیا چاہئے" اس آدمی نے حقارت سے پوچھا۔ منو کھسیا کر کرسی سے اترا، اور ڈرا ہوا، بغیر ایک لفظ منہ سے نکالے، سیمنٹ کے فرش پر بیٹھ گیا۔

"کیا چاہیے؟" اس آدمی نے پھر پوچھا

"ایک بوتل سوڈا واٹر"، منو نے جواب دیا۔

طشتریوں میں چائے انڈیلنے والے کچھ لوگوں نے اُسے ایسا گھورا جیسے وہ کوئی کوڑھی تھا۔ اور اس شخص نے ان کی طرف دیکھ کر طنز اور حقارت سے آنکھ ماری۔ قلی کی بھی اتنی مجال ہو سکتی ہے کہ سوڈا واٹر طلب کرے!

منو غصہ کے مارے پاگل ہونے لگا لیکن پھر اُس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ آخر یہ لوگ سفید پوش تھے اور اُسے عمر بھر یہ سبق دیا گیا تھا کہ سفید پوشوں کی عزت کرنی چاہیئے۔ اُسے محسوس ہوا کہ سب لوگ اُسی کی طرف دیکھ رہے ہیں اور وہ منہ پھیر کر شیشے کی کھڑکیوں سے باہر گلی میں دیکھنے لگا۔

"پیسے دو۔ دو آنے"۔ وہ آدمی تو بالکل منو کے سر ہی پر چڑھ آیا۔ منو چونک پڑا اور پھر سر جھکا کر اس نے اپنی دھوتی کی گرہ کمر سے کھولی اور چاندی کا روپیہ نکال کر اس آدمی کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

وہ آدمی ایک گلاس بھر کر جھاگ نکلتا ہوا، سبزی مائل سوڈا لے آیا۔ پھر اس نے چودہ آنے کی ریزگاری گن کر منو کی ہتھیلی پر رکھ دی سوڈے کے تیز، میٹھے اور ٹھنڈے مزے سے منو کے منہ میں جھنجھناہٹ سی پیدا ہو گئی اور آنکھیں اس کی تیزی سے پُرنم ہو گئیں۔ اس کا دل تو چاہتا تھا کہ آہستہ آہستہ چسکی لے لے کر سوڈا پیئے اور اس کا خوب لطف اُٹھائے۔ لیکن امیروں کی اس دنیا میں یوں گھس آنے پر اس کا دل اندر ہی اندر ملامت کر رہا تھا۔ لہٰذا اس نے جلدی جلدی بڑے بڑے گھونٹ لے کر سوڈا حلق سے اتار لیا اور گلاس ایک کونے میں رکھ کر چلنے لگا۔ سوڈے کا فوری انشراح کے باعث پر ہوا اور اس نے زور سے ڈکار لی۔

"بھاگ یہاں سے" کسی نے پیچھے سے کہا۔ اور منو جان لے کر وہاں سے بھاگا۔

کوئی سو گز جا کر اس کے پیچھے مڑ کر دیکھا، وہ آدمی اس کا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ لیکن پھر بھی منو خوفزدہ تھا، ادھر اُدھر آگے پیچھے دیکھ کر وہ چپکے سے ایک طرف کو کھسک گیا، اور اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ ایسی بری دوکان میں گیا ہی کیوں اور اپنا پیسہ فضول برباد کیا۔ اس آدمی کی گستاخی ابھی تک کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔

"خیر چلو پیاس تو بجھ گئی" اس نے اپنے کو تسلی دی "کتنے زور کی پیاس لگی تھی"۔ اور اس نے پھر ایک ڈکار لی اور اُسے ہنسی آگئی۔ پیٹ بھی اس کے خیالات پر صاد کر رہا تھا۔

"مجھے چاہیئے تھا کہ اس سے لڑتا۔ آخر اس نے مجھے نکالا کیوں اس نے مجھے قلیوں کی جگہ بٹھایا۔ حالانکہ میں نے سوڈا واٹر کے پورے دام دیئے تھے، اور پھر میں کوئی اچھوت نہیں ہوں۔ کھتری ہندو ہوں، راجپوت۔ جنگجو" اپنے کو جنگ جو فرقہ کا فرد خیال کر کے اُسے اپنے میں قوت محسوس ہونے لگی اور خود داری عود کر آئی۔ بے خودی کے عالم میں وہ شان کے ساتھ چلتا رہا سامنے مارکین ویسرش کی ایک بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی، بڑی بڑی آنکھیں اور گھنی پلکیں دلکش انداز میں کھلی ہوئی تھیں۔ ایک چمکدار چولی اور چمکدار لنگوٹ کے علاوہ پورا سفید دودھیا جسم برہنہ تھا۔ منو نے چلتے چلتے اپنی نگاہیں اس نظارے پر گاڑ دیں۔ اس نے چاروں طرف مڑ کر دیکھا کہ کہیں یہ حسین نظارہ بھی تو قلیوں پر بند نہیں ہے، اور پھر اُسے تکنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے وہ ہٹنے لگا کہ کسی ایسی جگہ کھڑا ہو جہاں سے اس حسین پیکر کو بخوبی دیکھ

سکے جس نے اس کے خون میں ایک عجیب قسم کی ہلچل پیدا کر دی تھی، کہ یکایک موٹروں کے ہارن سنائی دینے لگے۔ ٹام کی ٹن ٹن گونجنے لگی اور وکٹوریہ والے چاروں طرف سے چیخنے لگے "ڈیم نول۔ او کالا آدمی کدھر جاتا ہے" کی آوازیں آنے لگیں۔ منو پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ ٹریفک کے بیچوں بیچ پھنس جانے کا خیال ہی اُسے مارڈالنے کے لئے کافی تھا۔ اُسے ایسا لگا جیسے وہ مر چکا ہے یا مرنے ہی والا ہے لیکن پھر یکایک زندہ رہنے کی خواہش نے اُسے اُلٹے پاؤں گھسیٹ لیا۔ اب وہ محفوظ تھا، لیکن فٹ پاتھ کی دوسری طرف ایک سیاہ رنگ کا آدمی کھڑا تھا، کھچڑی بال، مڑی ہوئی سی ٹانگیں، پھٹے پرانے کپڑے، گٹھڑیوں سے لدا ہوا، ایک عورت کا ہاتھ پکڑے گھسیٹ رہا تھا۔ عورت بھی گٹھڑیوں سے لدی ایک لڑکے کی انگلی پکڑے اُسے گھسیٹ رہی تھی۔ اور سڑک کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی لڑکی ڈر کے مارے سہمی ہوئی کھڑی چیخیں مار رہی تھی۔

جوش میں آکر اضطراری حرکتیں کر بیٹھنا تو منو کی خاصیت تھی، یہ عالم دیکھ کر وہ عین سڑک کے بیچ میں کود پڑا جہاں وہ بچی دو طرف کے ٹریفک کے درمیان دبنے ہی والی تھی۔ اس نے جھپٹ کر بچی کو گود میں اٹھایا اور دوڑ کر اُدھر آگیا جہاں وہ سب پریشان مجبور کھڑے کبھی کوستے تھے کبھی دعائیں مانگتے تھے۔

"ارے تو جیتا رہ بیٹا، تیری بڑی عمر ہو"، عورت نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر منو کو دعائیں دینی شروع کیں، اپنی بچی کو گلے لگا لیا۔ اور اپنے میاں سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

"یہ تم کہاں سے آئے ہیں"

"چپ رہ عورت۔ تو نے میرے بچوں کی جان ہی لی تھی" میاں نے جواب دیا۔

"تو تم ہی اُسے پکڑ لیتے! مجھے تو سڑک پر چھوڑ دیا، اور خود مزے میں اِدھر آ گئے، کیسے باپ ہو تم"۔ بیوی نے بھنبھنا کر کہا۔

"جانے بھی دو ماں۔ جانے دو"۔ منو اس وقت بڑا سنجیدہ بن رہا تھا۔

"بھائی!"۔ اس آدمی نے منو کی پیٹھ تھپتھپائی اور اوپر سے ہاتھ بھی جوڑے "اگر تم نہ دوڑتے تو یہ چڑیل کچل ہی گئی تھی۔ یہ مشینیں تو ایسی ہیں جیسے بھوت"

"تمہارے پاس اتنا بہت سا سامان ہے، لاؤ تھوڑا سا میں لے چلوں۔ کدھر جا رہے ہو تم لوگ؟" منو نے کہا۔

"چھ مہینے ہوئے میں سرجائج دھاپٹ موتی مل د Sir Jeng (کلکتہ) میں کام کرتا تھا۔ پھر اپنے بال بچوں کو لانے دیس گیا" بوڑھے نے جواب دیا "اب کل صبح پھر جاؤں گا دیکھوں گا کہ کام مل جائے۔ اور اس وقت تو شہر جا رہے ہیں ہم لوگ، کہ کسی فٹ پاتھ یا کسی بند دکان کے پاس کوئی جگہ ملے تو رات کی رات پڑ رہیں۔ غریب آدمی ٹھہرے۔ اچھا تو پھر اب ہم چلے رام، رام"۔ اور وہ جانے لگا۔

"بھائی" منو جلدی سے بولا "میں بھی بمبئی میں نیا نیا آیا ہوں اور مجھے بھی نوکری ہی کی تلاش ہے۔ تمہارا خیال ہے کیا مجھے بھی اس جگہ کام مل سکتا ہے۔ میں قلی ہوں اور اُدھر ہی کار رہنے والا ہوں"

"اچھا! تو آؤ بھائی" بوڑھے نے کہا "اگر آج رات کو تم ہمارے

ہی ساتھ سو رہو تو صبح ہم دونوں ساتھ فیکٹری چلے چلیں گے، میں تمہیں بڑے مستری سے ملا دوں گا۔ ہم دونوں مل کر میل کے قریب ایک جھونپڑی لے لیں گے۔ تم بھی ہمارے ساتھ ہی رہ جانا "

" ہاں بھائی میں بھی یہی چاہتا ہوں " منو اپنی آواز انداز کو زیادہ سے زیادہ سنجیدہ بنا رہا تھا۔

پورا قافلہ یورپین کاروبار کی شاندار بلڈنگوں کے پاس سے گذرنے لگا۔ بڑی بڑی عمارتوں کے گنبد چاروں طرف اپنے تاریک سائے پھیلا رہے تھے۔ ایک کھیل کے میدان سے ہو کر یہ لوگ گرگام کی طرف روانہ ہو گئے جو بالکل مشرقی دنیا معلوم ہوتا تھا۔

منو بھی کو اپنے ایک کندھے پر اٹھائے تھا اور لڑکے کو دوسرے کندھے پر۔ ایسی حالت میں وہ بالکل ہنومان کی تصویر لگتا تھا جنھوں نے رام اور سیتا کو اپنے دونوں کندھوں پر اٹھا کر لنکا سے اجودھیا پہنچایا تھا۔

" بھائی " اس نے جلدی جلدی چل کر ہری کے برابر آتے ہوئے کہا " تمہارا نام کیا ہے؟ "

" مجھے ہری کہتے ہیں بھائی۔ ہری ہر " بوڑھا پسینہ پونچھنے کے لئے رک گیا تھا جو اس کے چاکلیٹی ماتھے پر سے بہہ بہہ کر اس کی گھنی سیاہ مونچھوں میں گھس رہا تھا۔ اس نے اپنے بوجھ کو ذرا کی ذرا ایک درخت کے لوہے کے گھیرے پر ٹکا دیا اور زور سے ایک گرم سانس لے کے پھونک ماری۔

" ابھی ہمیں کتنی دور اور جانا ہے " منو نے پوچھا۔ وہ متفکر ہو رہا تھا کیونکہ ہری بالکل پست ہو چکا تھا اور دونوں بچے الگ نیند کے مارے

اس کے کندھوں پر اونگھے جا رہے تھے۔

"بس تھوڑی دور اور ہے۔ بھنڈی بازار سے ہو کر چوپاٹی تک جانا ہے"

ہری نے یوں ہی جواب دیا اور پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہوا جو کچھ دور آ کر رک گئی تھی "ارے موتی کی ماں! تو بھی ذرا بیٹھ جا سستا لے"

عورت نے شرمیلے انداز میں اپنا سر ہلایا جس پر لمبا سا گھونگھٹ نکلا ہوا تھا۔ اور اس ٹین کے چھوٹے سے بکس کو جو وہ لئے تھی اس ہاتھ سے اس ہاتھ میں لے لیا۔

"بھئی رات کا اندھیرا چھایا جا رہا ہے اور بچے تو سو بھی گئے" منو نے بڑا عقلمند بنتے ہوئے کہا "ہمیں جلدی کرنا چاہیے"

"ہاں، ہاں بھگوان کا نام لے کر چل ہی پڑنا چاہیے" ہری بولا "میں چوپاٹی جانے کا ایک چھوٹا رستہ بھی جانتا ہوں"

اب وہ ایک پتلی سی گلی میں داخل ہوئے جہاں مکانات بالکل ایک دوسرے سے بھڑے کھڑے تھے اور راستہ چلتوں پر ان مکانوں کے برآمدوں کا سایہ پڑ رہا تھا۔ کہیں کہیں صرف کھڑکیاں تھیں جو خوار دی ہوئی پرانی بوسیدہ بالکونیوں میں کھلتی تھیں، دھوپ کی تپش نے جگہ جگہ سے رنگ روغن کو چاٹ لیا تھا۔

گلی میں بہت بھیڑ تھی، لوگ رنگ برنگے کپڑے پہنے مزے مزے میں ادھر اُدھر گھوم رہے تھے، اور اس جم غفیر سے نکلنا، بڑا مشکل معلوم ہو رہا تھا اور کیوں نہ مشکل ہوتا۔ ستر قوموں کے لوگوں اپنے اپنے لباس پہنے وہاں موجود تھے۔ جتنے بھی رنگ ممکن ہو سکتے تھے وہ سب فضا میں لہرا رہے تھے۔

منو نے دل میں سوچا کہ یہ جگہ بھی شام نگر اور دولت پور سے زیادہ مختلف نہیں البتہ یہاں اور بھی گڑبڑ اور گھچ پچ ہے۔ اس نے عربوں، ہندوؤں، مسلمانوں پارسیوں، انگریزوں اور یہودیوں کے مختلف روپہلی، سبز، نارنجی، سنہری، نیلے اور سرخ لباسوں پر سے نگاہیں ہٹالیں اور صرف اپنے متعلق سوچتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اب اس کی آنکھوں کی دوربین میں صرف سفید ہی رنگ نظر آرہا تھا لیکن ہر دوکان اور ہر سائبان میں لٹکے ہوئے بجلی کے بلب کی دھکا دھک روشنی میں یہ رنگ پھر چمکنے لگے، نارنجی، سرخ اور پیلے رنگوں کی چمک دمک منو کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی۔ ستر قوموں کے لوگوں اور پچاسوں قسم کی زبان سن سن کر منو کو غصہ آنے لگا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے سب اس کی ہی طرف دیکھ رہے ہیں، اور وہ اپنے کاندھے پر بوجھ لئے فٹ پاتھ پر لوگوں کے مجمع میں سے گذر رہا ہے۔ غصہ کے مارے اس کا خون کھولنے لگا۔ دوکانوں میں طرح طرح کی چیزیں سجی ہوئی تھیں، خاص کر لوہے اور ٹین کے کھلونے اور بڑے بڑے، دولت پور کی بازار سے بھی بڑے بڑے آم، لیکن دوکان کے آس پاس امیر لوگ جمع تھے اور چیخ چیخ کر چیزوں کے دام چکا رہے تھے اور منو مجبوراً آگے بڑھ جاتا پڑا۔ ایک سوکھا، ہڈی چمڑا آدمی، جس کے ٹھونٹھ ایسے اعضا فالج سے اکڑ گئے تھے، سڑک کے کنارے گھسٹتا جارہا تھا، کبھی کبھی تو وہ گذرتی ہوئی دکٹوریاؤں سے دبتے دبتے بچتا اور رونی آواز میں یکساں چلائے جارہا تھا۔

"بابا ایک پیسہ"

"چل، چل"، ایک پارسی دوکان دار ایک بانس لے کر اس پر لپکا کیونکہ اس نے گھسٹتے گھسٹتے سائبان کا بانس گرا دیا تھا۔

ذرا اور آگے ایک سیاہ رو، سفید مو اندھا آدھا اپنی لڑکی پر اور آدھا ایک لکڑی کے سہارے جھکا کھڑا تھا۔ لکڑی کو اس نے اپنی جھڑی ہوئی انگلیوں میں پکڑ رکھا تھا۔ لڑکی کا ناک نقشہ اچھا تھا۔ کبھی زندگی سے بھرپور رہی ہوگی لیکن اب تو اس کی کمزور مسکراہٹ اور آنکھوں کی ردی بھری چمک، ذلت اور حقارت کی ایک داستان معلوم ہوتی تھی۔ ہاتھ جوڑ جوڑ کر وہ بار بار بھیک مانگتی تھی۔

"ہٹ یہاں سے۔ ہمیں چین لینے دے چل"، ململ کا کرتا پہنے ایک بنیا بیٹھا دوکان میں مکھیاں مار رہا تھا۔ اس کے کانوں میں سونے کی مرکیاں تھیں اور اس میں جڑے ہوئے سرخ سرخ نانک، بھکارن لڑکی کی بیتابی پر کھلکھلا کر ہنستے ہوئے لگتے تھے۔

منو اپنے دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ آخر کار بمبئی کے بازاروں میں بھی روپیہ بکھرا ہوا نہ ملا۔ یہاں بھی غریب لوگ ہیں۔ اور اس کا دل ڈوبنے لگا اور وہ نگاہ اٹھا کر گہرے نیلے، جھکے آسمان کو تکنے لگا جس سے ستارے جھلملا جھلملا کر نور اور مسرت برسا رہے تھے۔ اتنے میں ہری آگے بڑھ گیا اور منو نے جلدی جلدی قدم اٹھانے شروع کئے کہ پچاس سال کا بوڑھا ہری کہیں آگے نہ نکل جائے۔

"ہری بھیا"، منو بولا "بڑی گھٹن ہے۔ چلو جلدی جلدی چلو، یہاں تو ہوا کا نام نہیں"

"موتی کی ماں کہاں ہے"، ہری نے ایک دم سے پوچھا۔ ایسا لگتا تھا۔ وہ اُسے بالکل بھول ہی گیا تھا۔ منو بھی بھول گیا تھا۔

ہری بے تحاشہ بھاگا۔ ہجوم میں لوگ غصہ ہو ہو کر اُسے گھورنے

لگے کیونکہ وہ جلدی میں ادھر اُدھر سب کو کہنیاں مارتا جا رہا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ جلد ہی مل گئی۔ ایک دوکان پر کیلے خریدنے لگی تھی۔

"اری یہاں کھو کر رہ جائے گی۔ یہ کوئی گاؤں نہیں ہے کہ گھر چلی آئے گی۔ یہاں کیا تیرے لئے گھر رکھا ہے"، ہری نے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔

عورت جلدی جلدی اس کے پیچھے چل پڑی۔ اس کا دل تو اُن خوبصورت سونے چاندی کے زیورات، نئے نئے چمکتے برتنوں، چوڑیوں اور ہاتھی دانت وغیرہ کی چیزوں پر لوٹ گیا تھا جو دوکانوں میں سجی ہوئی تھیں۔ اور اپنی شرم کو توڑ کے اپنے میاں سے کہنے لگی۔

"جب رہنے کا ٹھکانہ ہو جائے گا تو یہاں چیزیں لینے آیا کریں گے"

"چل۔ چل۔ کتیا کہیں کی۔ رات کو سر ٹیکنے کا تو ٹھکانہ نہیں ہے اور چلی شیخ چلی کی طرح ہوائی محل بنانے"

عین اس درمیان میں کھڑا ہوا وہ کنٹوریہ والوں کا جھگڑا دیکھ رہا تھا، ان دونوں نے اپنی اپنی گاڑیاں ایک دوسرے سے اتنی سٹا کر نکالی تھیں، کہ امیر ریشمی ساریوں والی پارسی خواتین کو اپنی جانوں کا خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ اتنے میں ہری اور اس کی بیوی آ پہونچے۔

اب یہ قافلہ بازار سے نکل کر ایک رہائشی گلی میں پہونچا۔ چاروں طرف اونچی اونچی عمارتیں تھیں، جن پر پھول بوٹے بنے تھے، نقاشی کی ہوئی تھی اور یورپین طریقے سے سفیدی پُتی تھی۔ سڑک کے آخر میں ایک سینما ہاؤس تھا جس کے بڑے بڑے پوسٹر اور رنگ برنگے بجلی کے بلب تہذیب و تمدن کا اعلان کر رہے تھے۔

"کیوں بھائی"۔ منو نے کہا "یہاں سو رہیں۔ کیا رائے ہے؟"

"نہیں بھائی" ہری نے جواب دیا "امیروں کے گھروں تلے سونا ٹھیک نہیں۔ یہاں آئے دن چوریاں ہوتی ہیں اور بدمعاش کے ساتھی ایمان داروں کو بھی پکڑ کر جیل میں ٹھونس دیتے ہیں آگے والی گلی میں چلتے ہیں۔ وہاں دوکانیں جلد بند ہو جاتی ہیں اور تختے سب خالی ہو جاتے ہیں"

بھاری بھاری قدم اٹھاتے وہ اور کوئی بیس قدم چل کر ایک اور گلی میں مڑے۔ یہاں ہری دہنے بائیں مڑنے کے بعد ایک دم ٹھٹک گیا منو تیز تیز قدم اٹھائے پیچھے پیچھے آرہا تھا اور ہری کے اس طرح ایک دم رکنے سے وہ اس سے ٹکرا گیا۔ بچے کندھے پر سے گرتے گرتے بچے، چاروں طرف اونچی اونچی عمارتیں رات کی تاریک فضا میں اپنی مدھم پرچھائیاں پھیلا رہی تھیں۔

"کیوں؟ کیا راستہ بھول گئے"؟ منو نے ہری کو اس طرح کھڑے دیکھ کر کہا۔

"نہیں تو" ہری نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا "ہم بہت دیر میں آئے۔ یہاں ساری جگہ بھر گئی۔ اب جس بازار سے ہو کر آئے ہیں وہیں چلنا پڑے گا۔ وہاں جب دوکانیں بند ہو جائیں گی تب سونے کو جگہ ملے گی۔ اور وہ بھی اگر آس پاس کے قلیوں نے جگہ نہ روک لی تو"

منو نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہری کی بیوی چپ چاپ کھڑی تھی منہ پر گھونگھٹ نکالے اور دور سے سینما کی جگمگاتی روشنیاں مسرت کا نور پھیلا

رہی تھیں۔ پھر اس نے سڑک کے مدھم دھندلے سے لیمپ کی روشنی میں آگے گلی کا جائزہ لیا۔ ان گنت قلیوں کے جسم چیتھڑوں میں لپٹے، چاروں طرف بکھرے تھے۔ بعض کنڈلی مارے پڑے تھے، بعض اوندھے ہاتھوں پر سر رکھے سو رہے تھے۔ بعض سروں کے نیچے اپنی پوٹلیوں اور بکسوں کا تکیہ لگائے چت پڑے تھے۔ کچھ ادھر اُدھر کونوں میں دبکے بیٹھے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ کچھ دو کانوں کے دروازوں کے آگے گڑمڑے پڑے تھے، یا تختوں پر پڑے سو رہے تھے۔ ان کی نیند میں موت کی سی خاموشی تھی، جو کہیں کہیں سے کسی کے کراہنے سے ٹوٹ جاتی تھی۔

"آگے کیوں نہ چلیں۔ شاید کہیں جگہ مل جائے"، منو نے کہا

ٹھنڈی سمندری ہوا کا ایک جھونکا تاریکی سے نکل کر سانپ کی طرح پھنکارتا منو کے چہرہ پر لگا اور اس کا جی چاہنے لگا کہ آگے بڑھ جائے، ہمت کر کے وہ آگے ہو لیا۔ کوئی تین گز گیا ہو گا کہ اس نے ایک پیوند لگی ہوئی گدڑی میں لپٹے ہوئے ایک کوڑھی کے سڑے ہوئے جسم سے ٹھوکر کھائی حالانکہ اس نے راستہ چلتوں کو خبردار کرنے کے لئے اپنے چیتھڑوں میں لپٹے سڑے ہوئے ہاتھ پاؤں گدڑی کے باہر نکال دیئے تھے۔

منو کو نفرت اور رحم سے آبکائی سی آنے لگی، ڈر الگ لگا اور وہ جلدی سے اچک کر ایک طرف ہوا ہی تھا کہ اُدھر سے ایک فقیرنی کی کراہ سنائی دی جو وہیں لیٹی ہوئی ایک ہاتھ کی کہنی پر سر ٹکائے دوسرے ہاتھ سے اپنے پاس سوئے ہوئے بچے کو بچا رہی تھی، اور شیرنی کی طرح آہنی نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ منو ہری سے آہلا، اور گھسیائی ہوئی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"سنبھل کر چلو بیٹا۔ دوسروں کی نیند خراب نہ کرو۔ آؤ میں تمہیں راستہ دکھاتا ہوں"۔ منو کھسک گیا اور ہری آگے ہو لیا۔

منو نے سوئے ہوئے بچوں کو پھر ٹھیک سے لادا، ہری پیچھے چلنے لگا اور سوچنے لگا کہ ایسے اندھیرے میں ہری کی بیوی گھونگھٹ نکال کر کیسے چلے گی۔ اس کا دل چاہا کہ ہری کی بیوی سے گھونگھٹ اٹھا دینے کو کہے۔ اگر وہ ہری ہی کے عمر کی ہوتی تو وہ ضرور اس سے کہہ ہی دیتا کیونکہ منو تو ابھی چودہ برس ہی کا تھا اور اس کے بیٹے برابر ہوتا۔ وہ اس سے مخاطب ہونے کو پیچھے مڑا ہی تھا کہ ایک دلدوز چیخ کی صدا اس کے کانوں میں آئی اور دیکھتا کیا ہے کہ کوئی دس گز پرے ایک قلی دھڑام سے گرا اور پیچھے سے کسی مکان کے چوکیدار نے اسے لاتیں لگانی شروع کر دیں۔ چوکیدار اپنے مالک کی دولت محفوظ رکھنے کے لئے لوہے کی سلاخوں والا دروازہ بند کرنا چاہتا تھا۔

فٹ پاتھ پر جو تمام سوئے ہوئے جسم بکھرے تھے ان میں کھلبلی مچ گئی، ادھر ادھر سے کراہنے، آہیں بھرنے اور کھسر پھسر کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر کئی ایک قلی اپنے اپنے کونوں سے اٹھ کھڑے ہوئے جہاں وہ رات بسر کرنے کو پڑ رہے تھے کہ کہیں ان کا بھی یہی حشر نہ ہو۔ ادھر ادھر لیٹے ہوئے جسم سرکنے لگے۔ تعجب سے گھبرا گھبرا کر اپنی پھٹی چادریں اتار پھینکیں اپنے اکڑے جسموں کو سیدھا کرنے لگے اور دھیرے دھیرے تسلی کے الفاظ بدبدانے لگے، جیسے ان کے تسلی دینے سے ساری بدبختی ٹل ہی تو جائے گی۔

اتنے میں ہری نے منو کو آواز دی اور وہ اس گھبراہٹ کے عالم سے نکل کر ہری کی اطمینان بخش آواز سننے لگا "آؤ یہاں جگہ ہے۔ سڑک کے

اُس پار"۔ منواس کے پیچھے چلا اور دل ہی دل میں سوچتا جا رہا تھا کہ پربھا نے جب پولیس کی مار کھائی تھی اور ہمیں دھان منڈی جا کر سونا پڑا تھا تو وہاں کے قلی یہاں کے قلیوں سے کتنے مختلف لگے تھے۔ شمالی ہندستان کے کشمیری اور پہاڑی مزدور، کیسے مضبوط گٹھے ہوئے اور جفاکش نظر آتے تھے، اور ان کے مقابلے میں یہ لوگ پتلے دُبلے، گھٹنے کمزور، کمر میں جیسے دم ہی نہیں۔ لیکن ویسے وہاں اور یہاں کے قلیوں میں کوئی فرق نہ تھا شمال کے قلی بھی چوکیداروں سے اُسی قدر ڈرتے تھے۔ جیسے یہاں جنوب کے۔ اور اُسے اس خوفناک لمحے کا خیال آیا جب وہ اناج کی بوریوں پر چڑھا تھا، اس کا دل خوف کے مارے دہلا جا رہا تھا ——— چوکیدار کی لاٹھی کا خوف!

سڑک کے اُس پار، ایک دوکان کی سیڑھیوں تلے بیچ بیچ تھوڑی سی خالی جگہ تھی، ایک پتلی سی لکڑی کے تختوں کی چوکی سی تھی جس پر غالباً دوکاندار دن کے وقت اپنی جوتیاں رکھتے ہوں گے۔ لیکن ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس وقت وہ جگہ خالی کیوں تھی، اور کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے کہ اُس جگہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے یا نہیں۔

ایک نیم برہنہ عورت، اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے وہیں قریب ہی بیٹھی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا وہ کسی جانگداز درد کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے سر اٹھا کر ان لوگوں کی طرف دیکھا اور ہچکیوں بھری آواز میں کہنے لگی۔

"کل رات کو اسی جگہ میرا شوہر مرا تھا"

"چلو اس کی تو جان مصیبت سے چھوٹ گئی۔ اب ہم اس جگہ

آرام کریں گے "

منو کو ایسا لگا کہ موت منہ پھاڑے سامنے کھڑی ہے۔ دولت پور کی ایک دوکان میں اس نے موت کے دیوتا کی بڑی سی دیوار ایسی بھیانک تصویر دیکھی تھی، جو گنا ہگاروں کے ایک مجمع پر چھائی ہوئی تھی اور گنا ہگار لوگ خون کا ایک دریا پار کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت وہی تصویر منو کی نظروں تلے پھرنے لگی۔ اس کا خون سوکھ گیا۔ لیکن پھر ہری کے بچے کی سانس اُسے اپنے رخسار پر محسوس ہوئی اور ہری کی آواز بھی آئی۔

"ہم بھوتوں سے نہیں ڈرتے "

خوش قسمتی سے ہری کی بیوی نے اس عورت کی بات نہ سنی تھی، کیونکہ وہ بوجھ گھسیٹتی کافی پیچھے چھوٹ گئی تھی۔ اتنے میں وہ آ ہی پہونچی اور ہری بولا۔

"آ لکشمی! یہاں ذرا کمر سیدھی کرلے "۔ اور پھر وہ لیٹے ہوئے بستر کو کھول کر بچھانے لگا۔ لکشمی نے نہایت فرمانبرداری سے اپنے سرتاج کا حکم مان لیا۔

"ہم لوگ وہاں فٹ پاتھ پر سوئیں گے "۔ ہری نے منو کی پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ رکھا "بچے اپنی ماں کے ساتھ یہاں سو جائیں گے "

منو نے بچے کو کندھے سے اُتار کر بچھے ہوئے بستر پر لٹا دیا۔ پھر آکر دیوار سے پیٹھ لگا کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ گرم پتھر میں دن کی دھوپ کی تپش اب بھی کسی قدر باقی تھی۔ لیکن چاروں طرف آدمی ہی آدمی چادروں میں لپٹے ہوئے سو رہے تھے "شاید اس کی عادت پڑ جاتی ہوگی " اس نے سوچا "میں بھی جلد اس کا عادی ہو جاؤں گا۔ ابھی تو نیا نیا آیا ہوں " اس نے

گلی میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور اُسے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔

دولت پور کے مکانات نسبتاً نیچے تھے اور اُن کے اِدھر اُدھر موٹے ہوئے قلی ایسے لگتے تھے جیسے بہت سی چیونٹیاں کسی بڑی سی گڑ کی بھیلی میں چمٹی ہوں۔ مگر یہ اونچی اونچی فلک بوس عمارتیں اور ان کے نیچے پتلی تاریک گلیاں ان میں قلیوں کے سیاہ جسم ایسے لگتے تھے۔ گویا زبردستی ٹھونس دیئے گئے ہوں۔ جنوب کا بھیانک، نیچا لگتا ہوا آسمان اور تاریک گھٹی ہوئی فضا گلا گھونٹتی سی معلوم ہوتی تھی اور ہر چیز پر مکمل خاموشی اور مردنی چھائی تھی، منو کو بڑی تنہائی اور بے کسی محسوس ہونے لگی۔

پھر ہوا کا ایک جھونکا آیا، گرم ہوا کا ایک جھونکا جس میں بنا پسی گھی کی چکپٹی مہک، صندل کے برادے کی خوشبو، پیشاب، گھٹے دودھ مچھلی اور سڑے ہوئے پھلوں کی بو ملی جلی تھی،

منو نے اُدھر دیکھا جدھر سے ہوا کا جھونکا آیا تھا، لیکن وہاں تو صرف ایک لاش نے اپنا کمبل اتار پھینکا تھا اور ہلکی ہلکی آہ بھرنے اور کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ منو نے دوسری طرف دیکھا۔ اُدھر ایک دوسرا قلی بے چینی سے کروٹیں لے کر نیند میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ منو نے ادھر سے اپنی نگاہیں ہٹالیں اور ایک ننگے جسم کو دیکھنے لگا جو تڑپ تڑپ کر کروٹیں بدل رہا تھا اور بار بار مچھروں کو گالیاں دے دے کر اپنے گھٹنوں پر چپتیں لگا رہا تھا۔

منو نے اس شخص کے بھی پار، سڑک کی جانب دیکھنا شروع کیا۔ وہ کی نگاہیں بائیں طرف سوئے ہوئے بہری اور اس بیوہ عورت پر جا ہوتی، جو اب تک اپنا سر کپڑے میں چھپائے بیٹھی ہوئی تھی، دور تک پھیلتے چلے گئیں جہاں تک دکھائی دے سکتا تھا، لاشیں ہی لاشیں نظر آتی تھیں، اور اگر نیم مردوں

کی موجودگی کو ساتھ کہا جا سکتا ہے تو مزا کیلا نہ تھا لیکن پھر بھی منو کے دل میں خوف تھا کہ گھسا ہی چلا آتا تھا۔ نیند کا خوف، ان لیٹے ہوئے نیم مردہ جسموں کا خوف جو ابھی نہ معلوم کیا کر بیٹھیں، خراٹے لینے لگیں، اپنی سرخ خون کبوتر ایسی آنکھیں پھاڑ دیں، غرائیں، کراہیں، بلکیں یا اسی طرح بھوتوں کی سی مکمل خاموشی سے پڑی رہیں۔

منو نے جلدی سے خاموشی کے ساتھ اپنی ٹانگیں پھیلا لیں، اپنے جسم کو کھینچکر سونے کے انداز میں لیٹ گیا اور اپنے آپ کو تسلی دینے لگا کہ چاروں طرف سوئے ہوئے لوگ بھی آخر انسان ہی ہیں کچھ بھوت پریت نہیں ہیں۔

کون جانے یہ سب بھی میری طرح کام کی تلاش میں اسی طرف سے یہاں آئے ہوں۔ کون جانے یہ سب بھی میری طرح ریل میں چھپ کر آئے یا کرایہ دے کر آئے اور وہ بہادت۔ وہ تو اب سمندر کی سیر کر رہا ہوگا۔ کیسا اچھا آدمی تھا۔ اور پربھا۔ کاش اُسے معلوم ہوتا کہ یہاں میں نے کچھ لوگوں سے دوستی گانٹھ لی ہے اور کل مجھے نوکری بھی ملنے والی ہے۔ بہادت اور پربھا دونوں نے کہا تھا کہ میں بہادر لڑکا ہوں۔ ہاں میں محنت تو ضرور کر سکتا۔ لیکن کیا کروں دنیا میں ایسے لوگ بھی تو ہیں جیسے گنپت اور وہ پولیس والا اور یہاں کا وہ ہوٹل والا۔ کون جانے ہری مجھے کیا سمجھتا ہے، اس کا کالا سیاہ چہرہ ہمیشہ ایک ہی سا رہتا ہے۔ کل اس سے کہوں گا کہ مجھے اپنی داستان سنایئے۔ اور اس کی بیوی تو ہمیشہ اپنا منہ چھپائے رہتی ہے۔ کون جانے اس کے خیال سے منو کے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی اور اُسے بخار کا سا محسوس ہونے لگا۔ اف نیند کہیں آ بھی آ بھی چک، ایک عجیب قسم کی بے چینی اس کی رگ رگ میں پھیل گئی، اور اُسے بے قرار کر کے ہیجان پیدا کرنے

لگی۔ ایسا زبردست ہیجان کہ اس کے خیالات بھی اس کے ذہن میں چبھنے لگے اس نے زبردستی آنکھیں میچ لیں اور اس کی روح نیند کے لئے پکارنے لگی اگرچہ اس کی ہڈیاں تھکن سے دکھ رہی تھیں اور آنکھیں جل رہی تھیں، پھر بھی اُسے نیند نہیں آ رہی تھی، اس کا جسم تھرایا اور وہ پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر ایک زور کی سانس کھینچی اور کروٹ لی اور دیکھا کہ ہری گہری نیند سو رہا ہے۔ اس نے بھی اُسی طرح لیٹنے کی کوشش کی جیسے ہری لیٹا تھا اور سوچا کہ اگر فٹ پاتھ پر لیٹنے کا صحیح طریقہ آتا ہو تو شاید انسان کو نیند آ جائے۔ ایک لمحظہ وہ اس طرح لیٹا رہا۔ ہری کی بیوی کا گھونگھٹ نکالے ہوئے پیکر اس کی نظروں میں پھرنے لگا۔ اس نے آنکھیں کھولدیں، سونے کی کوشش بیکار تھی۔ اس کا دل چاہا کہ کہیں دور بھاگ جائے، دور، دور ——— بہت ہی دور، جہاں تازہ ہوا کا ایک جھونکا اُسے سانس لینے کو مل سکے۔ لیکن بھاگے کیسے۔ اگر ان لپٹی ہوئی لاشوں میں سے کسی سے ٹھوکر کھا گیا تو۔ پھر ایک قصہ شروع ہو جائے گا۔ وہ اپنے پتھریلے بستر پر کروٹ لینے لگا۔ اور اپنے کولہے اِدھر اُدھر پھیرنے لگا یہاں تک کہ اُسے محسوس ہوا کہ پتھر کی رگڑ سے اس کے کولہے کی ہڈیاں دُکھنے لگی ہیں۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر دبا لیا اور پیٹ کے بل لیٹ کر منہ زمین کی طرف جھکا دیا۔ تاریک، فضا اس پر چاروں طرف سے چھا گئی۔

صبح تڑکے ٹھنڈی تازی ہوا گلی میں چلنے لگی۔ اور قلیوں، فقیروں کوڑھیوں اور ٹکڑ گدوں کی چھلنی چادروں کے چھیدوں سے گذر گذر کر ان کے جسموں سے مس ہونے لگی۔ ان کے جسم کپکپائے، اور انھوں نے بے چینی

سے کروٹ لی۔ ایک دوسرے سے سٹ گئے یا کنڈلی مار کر گڑمڑ ہو گئے یا صرف کروٹ بدل کر رہ گئے۔ ہوا کا ایک جھونکا پھر آیا۔ ننگے کوڑھی کراہنے لگے۔ کچھ نے اپنے کپڑوں کو اچھی طرح لپیٹا، کچھ صبح کی میٹھی نیند کے نشہ سے ایک دم چونک پڑے۔ اور اس مصیبت اور تکلیف کے عالم میں بھی خدا کا نام بڑبڑانے لگے "رام، رام۔ سری، سری۔" سمندری ہوا کا یہ جھونکا جلد ہی تیز ہوا میں تبدیل ہو گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ خدا کے نام کا ورد بھی ان بدبختوں کے نام پر تیز تر ہوتا گیا کیونکہ اس بدنصیب ملک میں چاہے کوئی چھینکے، چاہے تھوکے، چاہے کھانس کھانس کر بلغم گرائے ہر موقعہ پر خدائے عزوجل کا نام ضرور لیا جاتا ہے۔

جو لوگ دمہ یا دق کی کھانسی، بلغم کے متواتر چٹاخوں، یا ناک چھینکنے کے زوردار سڑاکوں اور خدا کے مختلف ناموں کی پکار سے بھی نہیں جاگے، وہ پولس اور قانون کے ہاتھوں جگائے گئے۔ جو ڈنڈا سنبھالے چوپاٹی کے ان فٹ پاتھوں کو خالی کرا رہا تھا۔ منو بھی ان ہی لوگوں میں تھا، کیونکہ ہری پہلے ہی اٹھ چکا تھا۔

"رام رام بھائی"، ہری نے منو کو دیکھ کر کہا "اب ہمیں کارخانے چلنا چاہئے"

"کیا بچے اٹھ گئے"، منو نے اشتیاق سے پوچھا "نہیں اٹھے ہوں تو میں گود میں اٹھا لوں گا"

"ہم پر خدا کی مار۔ ان کمبختوں کو صبح اٹھنے کی عادت ہونی چاہئے" ہری بولا "صبح سورج نکلنے سے پہلے فیکٹری میں کام پر چلا جانا ہوگا۔ چار پیسے ہونے میں گیا کیوں تھا۔ ان ہی کو لانے کہ اور لوگوں کے بچوں کی

یہ بھی اپنی روزی کمانا سیکھیں۔ اسی طرح گذر ہو سکتی ہے"
پھر اس نے ان تختوں کی طرف دیکھا جہاں رات کو اس کی بیوی بچوں کو لے کر سوئی تھی۔ "کیوں لکشمی؟ بچے اٹھ گئے"
لکشمی آہستہ سے بچوں کو جگانے لگی لیکن بچے صرف کراہے اور اکڑ گئے۔ ہری غصہ میں بھرا ہوا ان کی طرف بڑھا۔
"میں انھیں گود میں اٹھالوں گی، ان کی نیند خراب نہ کرو" لکشمی نے جھک کر بچوں کو اپنے شوہر کی زد سے بچایا۔
"آٹھ آٹھ نو نو برس کے لونڈوں کو گود میں لادے گی؟" ہری نے جھڑکا۔ اور اس نے لپک کر، ایک ایک کر کے بچوں کی باہ پکڑ پکڑ کر انھیں اٹھایا اور جھٹک کر جھنجھوڑا۔ ان کے ہاتھ لٹکنے لگے۔ آنکھیں کھولے بغیر انھوں نے رونا شروع کر دیا۔ نیند میں جسم اب تک لوتھ جیسے بے جان ہو گئے ہوں۔
"بھائی ہری ایک کو تو میں اٹھالوں گا جیسے کل رات اٹھایا تھا" منو کا دل گھبرا رہا تھا کہ اب یہاں ان لوگوں میں آپس میں جھگڑا شروع ہوا۔ اور اس نے آگے بڑھ کر لڑکے کو گود میں اٹھا لیا۔ لڑکا کافی مضبوط تھا اور اس کا رنگ گہرا جامنی تھا۔ لکشمی نے لڑکی کو اٹھایا۔ ہری نے بستر لپیٹا، ٹین کا بکس اٹھایا اور یہ قافلہ پھر چل پڑا۔
شہر کی تمام گلیاں جاگنی جا رہی تھیں۔ سفید، کتھئی، سیاہ سب رنگ کے لوگ لنگوٹیاں باندھے یا جانگھئے پہنے جلدی جلدی چلے جا رہے تھے، کچھ امیر سوداگر اور بیوپاری، موٹروں میں لدے جا رہے تھے، اسکول کے لڑکوں اور لڑکیوں کے گروہ کہیں دھیرے دھیرے بادلِ ناخواستہ اور

کہیں تیز تیز چلے جا رہے تھے۔ مختلف قسم کی عمارتوں کی احمقانہ شان اب سورج کی پھیلتی ہوئی روشنی میں غائب ہوتی جا رہی تھی۔ منو اس چہل پہل کا کوئی خاص نوٹس نہیں لے رہا تھا۔ اب اس نے بمبئی شہر کو قبول کر لیا تھا۔ البتہ گھروں کے اندر تاریک کوٹھریاں تھیں ان کو دیکھ کر اسے تعجب ضرور ہوا۔ ان کوٹھریوں میں کتنے بہت انسان رہتے تھے، مرد اور عورتیں، ایک کے اوپر ایک پلا پڑتا تھا۔ عمارتوں سے باہر نکلتے وقت وہ ایک دوسرے سے بات تک نہ کرتے تھے۔

واہ بھئی، منو نے دل میں سوچا، یہ دکھن کے لوگ بھی عجیب ہیں، اُسے کیا معلوم کہ وہ لوگ کیوں اس طرح ایک دوسرے سے کھنچے ہوئے ہیں، وہ لوگ دھیرے دھیرے چل رہے تھے۔ بالکل بے جان جیسے ابھی تک نیند میں ہوں۔ منو نے جوش میں آکر ایک دو قدم ذرا تیز بڑھائے لیکن فضا ایسی تھی کہ اس کا سر چکرانے لگا اور ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے ہری کی طرف دیکھا۔ ہری کی چال یکساں تھی جیسے گھسٹ رہا ہو اور پاؤں کی تمام طاقت کہیں غائب ہو گئی ہو۔ وہ تیز چلنے کی کتنی ہی کوشش کرتا مگر اس کی ٹانگیں پھڑپھڑا کر رہ جاتیں اور رفتار خاک بھی تیز نہ ہوتی تھی۔

ہری کی بیوی اپنی بچی کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی۔ عورت ذات اور اوپر سے بھاری گھوم گھما لہنگا پہنے۔ منو نے اپنے دل میں سوچا کہ کاش میں اس کا بوجھ ہلکا کر سکتا۔ اور پھر ایک نم پسینے میں ڈوبا ہوا گرمی کا بھبکا تیزی سے اُسے اپنی پیٹھ پر رینگتا ہوا محسوس ہوا۔

بمبئی کے مکانوں اور چھتوں پر سے ہوتا ہوا سورج اب اپنی دھوپ پوری طرح پھیلا رہا تھا۔ منو کا کلیجہ جیسے خشک ہوا جا رہا تھا، ساری طاقت سلب ہوتی جا رہی تھی اور منہ کا مزا سیٹھا ہو گیا تھا۔ زور لگا کے وہ آگے بڑھنے لگا جیسے

اپنی ہڈیوں میں نئی طاقت پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہو، صبح کی کُہر چھٹتی جا رہی تھی۔ اونچی سڑک کی دونوں طرف گڈھے تھے جن میں کہیں کہیں سے کھجور کے درخت اُبھرے ہوئے نظر آتے تھے، اور ان درختوں کی چوٹیوں کی سبزی سورج کی روشنی سے زردی مائل ہو گئی تھی۔ لیکن یہ نظارہ دور ہی سے بھلا معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ ذرا اور اوپر چڑھ کر چاروں طرف لمبے لمبے میدان تھے جن میں چمڑا سکھانے والے، گوبر لگا لگا کر چمڑا سکھا رہے تھے۔ پاس ہی ان لوگوں کے مٹی کے جھونپڑے تھے۔ بائیں طرف دور قطار میں بہت سی خاکی رنگ کی اونچی اونچی عمارتیں تھیں اور ان کے آس پاس ہزاروں پھوس کے جھونپڑے تھے جن کے چھیدوں کو جگہ جگہ بوری کے ٹکڑوں سے بند کیا گیا تھا۔ اَن گنت چولہوں سے نکلتا ہوا دھواں ان جھونپڑوں میں گھس رہا تھا۔

"اب زیادہ دور نہیں ہے۔ کوئی ایک میل اور ہوگا"، ہری نے ہانپتے ہوئے اپنی آنکھوں کے ڈھیلے گھما کر کہا جن پر پسینہ چمک رہا تھا۔

"لیکن یہ آپ کا دکھنی میل ہمارے میل سے شاید بڑا ہوتا ہے" منو نے مذاق کے لہجے میں جواب دیا۔

"ہم ان بڑے گھروں میں رہیں گے کہ ان پھوس کے جھونپڑوں میں؟" ہری کی بیوی نے کولھے مٹکا کر کہا۔

"ذرا دم تو لے! ہمیں نوکری ہی مل جائے تو بڑی بات ہے"

ہری اتنی دور چلنے سے تھک کر چڑچڑا رہا تھا۔ فورمین صاحب سے ملاقات کا خیال الگ پریشان کئے تھا۔ اب یہ لوگ ایک اور سڑک پر چڑھنے لگے جو پتھریلی تھی اور مٹی سے اَٹی ہوئی، جھونپڑوں اور ان کے پاس لگے ہوئے کوڑے کے ڈھیروں کے نزدیک سے گذرتے ہوئے یہ لوگ اُن اونچی عمارتوں کے

نزدیک پہنچے۔ یہ بلند چار منزلہ عمارتیں بالکل سادی بنی ہوئی تھیں۔ دیواروں کہیں کہیں سے شکستہ ہو گئی تھیں اور جگہ جگہ سے تھپا ہوا سفید سیمنٹ کالی بھٹ چمنی کے ساتھ ایک عجیب تضاد دکھا رہا تھا۔ اب یہ لوگ اپنی منزل پر پہنچ چکے تھے۔

وہ ہری سنگھ جائٹ فیکٹری جہاں ہمیں جانا ہے" ہری نے ایک چمنی کی طرف انگلی اٹھائی جو باقی تمام چمنیوں سے بڑی تھی اور جس میں سے دھوئیں کے بادل نکل رہے تھے۔ منو نے ادھر دیکھا مگر اس کی نگاہیں فیکٹریوں کی چمنیوں کے ہجوم میں کھو گئیں، جو پہاڑوں کی چوٹیوں ایسی چمنیوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔

پھوس کے جھونپڑوں کے آس پاس گلیوں میں بے شمار کتے شور مچا رہے تھے۔ پاس ہی کچھ نیم برہنہ عورتیں اور مرد بیٹھے فارغ ہو کر اپنی اپنی طرح پر دھائیں بند بدار رہے تھے۔ آس پاس نہ تو کہیں کوئی پمپ تھا نہ کنواں۔ منو نے دل میں سوچا کہ یہ لوگ نہاتے کہاں ہوں گے۔ لیکن تھوڑے فاصلے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی اور اس کے نیچے ایک گدلا سا تالاب تھا، جس پر کائی جم گئی تھی۔ تالاب پر کوؤں کی اور بھی بہتات تھی جو تالاب میں بیٹھے یا آس پاس چرتے ہوئے مویشیوں کے زخموں میں ٹھونگیں مار مار کر اڑ جاتے تھے۔ منو کو تالاب کے پاس کھیلتے ہوئے لونڈوں کی شرارتیں بڑی بھلی معلوم ہوئیں، اسے وہ دن یاد آ گئے جب وہ خود بیاس کے پانی میں دھومیں مچایا کرتا تھا اور اس کا دل ایک دم ننگا ہو کر پانی میں غوطہ مارنے کے لئے مچلنے لگا۔ یہاں تک کہ اسے اپنے شوق کے مارے تالاب کی بدبو بھی محسوس نہ ہوئی اور اس نے کنارے پر فوراً ٹھٹک کر بڑے اشتیاق سے ہری سے

کہا "یہاں نہانا نہ لیں"

"نہیں بھائی، اس وقت جلدی ہے۔ ہمیں یہاں تالاب کے پاس کوئی جھونپڑا رہنے کو مل جائے گا تو روز نہایا کرنا"

منو نے اس عاقلانہ رائے کو قبول کر لیا کیونکہ آگے چل کر اس نے دیکھا کہ تالاب کے پاس ہی ایک بڑا سا گھورا تھا جو تالاب ہی میں مل گیا تھا۔

"اب بس ایک میل اور ہے"۔ ہری نے اپنے ساتھیوں کو تسلی دی۔ یہ دوری ایک میل کے بجائے کوئی پانچ سو گز کے قریب نکلی، ایک پتلی سی سڑک تھی جو ابھی بنائی جا رہی تھی، اور اس کے آگے ایک بڑی سی دیوار تھی جس کے سرے پر جمے ہوئے شیشے کے ٹکڑے دن کو سورج کی روشنی کی عکاسی کرتے تھے اور رات کو چوروں سے حفاظت۔ میدان میں ریل کی پٹریوں کے بیچ بیچ میں فیکٹری کا کوڑا، بجھا ہوا کوئلہ وغیرہ پڑا تھا۔ زمین نرم تھی اور جگہ جگہ کیچڑ بھی تھا جس میں پاؤں بار بار دھنس جاتا تھا۔ اونچی نیچی جگہوں کے آڑ میں لوگ بیٹھے پاخانہ پھر رہے تھے۔ چوڑے میں ٹھپے ہوئے اپلے سوکھ رہے تھے اور ایسی بدبو تھی کہ ناک نہ دی جاتی تھی۔ منو کا دل بیٹھنے لگا۔ جیسے وہ بدبو اور گوبر کی اس پریشان کن فضا سے بچنے کے لئے سکڑ جانا چاہتا تھا۔ سامنے ایک بڑا سا آہنی پھاٹک تھا اور اس پر بڑے بڑے حرفوں میں لکھا ہوا بورڈ ٹنگا تھا۔

"سر جارج وہائٹ کاٹن ملز"

"ٹھہرو" ایک لمبے تڑنگے پٹھان نے دونالی بندوق زور سے زمین پر مارتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک مخمل کی زرکار صدری پہنے تھا، کندھے پر سے گولیوں سے بھری پیٹی لٹکی ہوئی تھی، لمبے کرتے

کے نیچے اور آگے سے مڑی ہوئی پٹھانی جوتی کے اوپر۔ گھیردار شلوار ہوا میں پھڑپھڑا رہی تھی، زرتار کلاہ پر بندھا ہوا نیلا ریشمی صافہ لہرا لہرا کر اس کے چہرے کے رنگ کو عام شمالی ہندستانی لوگوں کے رنگ سے بھی زیادہ سرخ اور خوفناک بنا رہا تھا۔

لکشمی ڈر گئی۔ اور منو پر بھی انگریزی سرکار کا نہیں مل کے انتظام کا بڑا رعب پڑا۔ خاصکر اس وجہ سے بھی کہ لوہے کے پھاٹک کے اندر جھانکنے سے معلوم ہوتا تھا کہ تمام کاروبار باقاعدہ ہو رہا ہے اور مل کی عمارت سے لے کر اس کی پرچھائیں تک ہر چیز مکمل اور باقاعدہ ہے۔ ہری پہرہ داروں سے واقف تھا۔

"سلام خاں صاحب"، ہری نے خوشامدانہ لہجے میں کہا "میں ہری ہوں، پہلے یہاں کام کرتا تھا۔ چار مہینے ہوئے کام چھوڑ کر بال بچوں کو لینے وطن چلا گیا تھا۔ چمٹا صاحب فورمین سے ملنا چاہتا ہوں"۔

"اچھا"، نادر خاں حقارت سے بولا اور ایک پارسی لڑکے کی طرف مخاطب ہو کر بولا جو پاس ہی ایک چوبی بکس پر انگریزی کپڑے پہنے بیٹھا تھا۔ "لالکا کا جا کر چمٹا صاحب سے بولو کہ ایک پرانا قلی کام چاہتا ہے"۔

منو نے کندھے پر سویا ہوا لڑکا بیدار ہو گیا اور لکشمی کی گود کی لڑکی بھی جاگ پڑی اور دونوں کے دونوں ہر ایک بات سے بے نیاز سڑک کی مٹی میں کھیلنے لگے۔

منو ایک میل کے پتھر پر بیٹھ گیا اور گوبر کے اونچے نیچے ڈھیروں کوئلے کے انباروں، ٹوٹی پھوٹی ادھر اُدھر بکھری ہوئی شہتیروں اور میدان میں گندگی کے گڈھوں کو تکنے لگا۔ وہ تمام عجیب و غریب نظارے، طرح

طرح کی چیزیں جو اس نے پچھلے چند دنوں میں دیکھی تھیں۔ اگرچہ اس کے دل کا گہرا سکوت میں ڈوب چکی تھیں پھر بھی اس وقت ابھر کر اس کے سامنے ناچنے لگیں۔ یہاں تک کہ اس کا دل اس بوجھ سے کچلنے لگا۔ اور اس کا دل چاہا کہ ایک دم اٹھ کر کہیں بھاگ جائے۔ بے تحاشہ بھاگے۔ کانگڑا کی پہاڑیوں کی طرف یا شام نگر کی اس تنہا سڑک پر یا اور کچھ نہیں تو دولت پور کی پریشان کن لیکن کم از کم واقف کار گلیوں میں بھاگ جائے۔ لیکن جب اس نے نظر اٹھا کر فیکٹریوں کی طرف دیکھا تو ان کے سپاٹ وجود سے کچھ ایسے نظر آئے کہ اس کا دل تھم گیا۔ ان فیکٹریوں کے وجود میں ایک عجب پُراسرار برتری تھی لمبی لمبی چمنیوں کی بناوٹ میں منو کو فنِ تعمیر کا کمال محسوس ہوا اور اس نے سوچا کہ وہ مشینیں کیسی ہوں گی جو ان عمارتوں کے اندر چلتی ہوں گی۔ ضرور وہ بڑے بڑے الاؤ سے چلتی ہوں گی، ان تنوروں سے بھی بڑے الاؤ جن کی راکھ وہ دولت پور میں صبح ہی صبح صاف کیا کرتا تھا۔ منو نے سوچا کہ اگر پرماتما کی دھواں نکلنے کے لئے ایسی ہی ایک چمنی بنوا لیتا تو روز روز کیوں سر ٹوڈرمل والوں سے لڑائی ہوتی اور اس کے لڑکے کے حکم سے ماک کو کوتوالی میں بند کیوں پڑتی؟ لیکن دولت پور میں ایسی چمنی کے متعلق تو انسان سوچ بھی نہیں سکتا تھا بنوانا تو الگ رہا۔

"پرانا شہر جو ٹھہرا"، منو نے حقارت سے سوچا۔ "بھئی اتنا پرانا نہیں۔ بالکل نیا ہے۔ بنیری منڈی والا لالی ٹھیک کہتا تھا۔ انھیں فیکٹریوں کے بارے میں کہتا ہوگا وہ کہ بڑی بڑی تنخواہیں ملتی ہیں"۔ وہ ان بڑے بڑے گھروں میں سے کسی میں رہنے کا خواب دیکھنے لگا جو راستہ میں ملے تھے اور جن میں اَن گنت چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں تھیں۔

"صاحب بڑا اچھا آدمی ہے" ہری نے منو سے کہا۔ انہوں خاموشی سے انتظار کرتے کوئی بیس منٹ گزر چکے تھے۔ منو بڑے اشتیاق سے انتظار کرنے لگا کہ اب پھر ایک انگریز سے واسطہ پڑنے کی خوشی نصیب ہونے والی ہے۔ اسے مسٹر انگلینڈ کا چھوٹا سا چہرہ یاد آیا جو اس نے شام گڑھ (بابو جی) کے یہاں دیکھا تھا اور ان صاحب کی چمکتی ہوئی گنجی چاند جو پر بال کا گچھا۔ یکتے کو چھ بجے مادولیا آئے تھے۔

منو کا شوق بڑھ گیا۔ لکشمی نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ اسے بھی اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ اب کسی صاحب کا لال بند ایسا منہ دیکھنے کو ملے گا۔ پہلے تو وہ صاحبوں کو گھونگھٹ کی آڑ ہی سے دیکھ پاتی تھی۔ لیکن وہ اپنی خوشی کو دل ہی میں دبا کر خاموش ہو رہی۔ اس نے بچوں کو سڑک کے کنارے لگے ہوئے پتھروں سے کھیلنے میں لگا دیا کہ کھانا نہ مانگنے لگیں۔

"اے۔ پتھر اور ہرا دھرنہ کرو"۔ نادر خاں گرجا۔ اور بچوں کی ہنسی کی آواز سن کر اپنے بندوق کا کندہ زمین پر پٹخا۔

بچے دوڑ کر اپنی ماں کے لہنگے میں چھپ گئے۔ ہری نے قہر بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

منو ہمدردانہ طور پر مسکرایا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب ٹامس صاحب دارد ہو گئے۔ کسی زمانے میں وہ لنکا شائر کے ایک کارخانے میں مستری تھے، اور ادھر پندرہ سال سے ہندستان کے ایک بڑی سوتی مل میں ہیڈ فورمین تھے۔ لمبے چوڑے سے آدمی تھے، سرخ بلڈاگ قسم کا چہرہ، بھاری جسم پر ایک چکٹی سی قمیص اور چکٹ ہی پتلون پہنے تھے۔ پوپو کی ٹوپی بھی چکٹی ہی تھی اور اس کا چمڑے کا تسمہ آگے کے

بجائے پیچھے ان کی موٹی سی گردن پر لٹک رہا تھا۔

"سلام حضور چمپا صاحب" ہری نے دوہرا ہو کر اپنی ہتیلی بالکل پیشانی سے ملا دی۔

"تم ہاری" جمی صاحب بولے "تم آگیا"

"ہاں حضور مائی باپ" ہری نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "اور میں اپنی بیوی اور بچے کو بھی کام پر رکھوانے لایا ہوں اور ہمارے دیس کا ایک جوان بھی آیا ہے"

"تو سارے گاؤں کو کیوں نہیں لیتا آیا، سور کا سالا" جمی ٹامس نے ہندستانی زبان تو نہ سیکھی تھی، مگر ہندستانی میں گالی بخوبی دے سکتے تھے۔

"تو حضور آپ کا حکم ہو اور مزدوروں کی ضرورت ہو تو لکھ کر بلوا سکتا ہوں"۔ ہری نرا احمق ہی تھا۔ صاحب کی گفتگو کا طنز اس کے فرشتوں کے بھی پلے نہیں پڑ سکتا تھا۔

"ابے بیوقوف بیل! یہاں نوکری ہے کہاں؟" جمی نے چڑ چڑا کر کہا "ہاں شاید اس لڑکے کو رکھ لیں" اس نے منو کی طرف دیکھ کر کہا "مگر یہاں جگہ بہت کم ہے"

"مگر حضور" ہری ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا "آپ غریبوں کے ان داتا ہیں آپ مائی باپ ہیں۔ آپ چاہیں تو ہمارے لئے جگہ نکل سکتی ہے"

"اچھا، اچھا۔ سب ملا کر تیس روپیہ ملیں گے" جمی ٹامس نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ان کے ننگے بازوؤں پر گدے ہوئے سانپ اعوذ تیں اور چیتے نظر آرہے تھے۔ "دس تم کو، دس اس لڑکے کو، پانچ تمھاری بیوی کو اور ڈھائی ڈھائی دونوں بچوں کو"

"مگر حضور" ہری نے جھک کر فورمین کے سیاہ جوتوں کو چھوا اور جوتے کے چمڑے کو لگا ہوا ہاتھ اپنے ماتھے کو لگا کر بولا "رحم کیجئے۔ یہاں رہنے کے لئے ہمیں کھولی بھی لینی ہوگی اور کھانے کا سامان کتنا مہنگا ہے"

"تم نے میرے ساتھ کیا کیا ہے کہ میں تمہارا خیال کروں" فورمین صاحب ہری کی اس حرکت سے کسی قدر شرمندہ ہو گئے تھے اور گھبراہٹ اور درگزر کرنے کے لئے اپنی مونچھیں مروڑنے لگے "تم گاؤں سے میم صاحب کے لئے کون سا تحفہ لائے کہ میں تمہارے ساتھ رعایت کروں۔ تم تو میرے یا میم صاحب کے لئے کبھی بڑے دن پر بھی ڈالی نہیں لائے۔ اگر تنخواہ ٹھیک لگے تو کام کرو، ورنہ جاؤ"۔ اور فورمین صاحب چلنے لگے۔

"حضور۔ حضور" ہری چیخیں مار کر رونے لگا اور صاحب کے پیچھے دوڑا "ہم آپ کو خوش کر دیں گے۔ لیکن ہم پر مہربانی کیجئے۔ میں پہلے یہاں تھا تو مجھے پندرہ روپے ملتے تھے"

"یو بلیڈی فول۔ تم سمجھتا ہے کہ جب چاہے گا گھر چلا جائے گا اور واپس آئے گا تو وہی تنخواہ ملے گی۔ بڑے صاحب نے مجھ سے منع کر دیا ہے کہ بڈھے اور پرانے قلیوں کو نہ لیا جائے۔ میں تو تم پر مہربانی کر رہا ہوں۔ بہن ..."

"حضور حضور" ہری نے پھر ہاتھ جوڑے "ان بچوں کی طرف دیکھ کر ہم پر ترس کھاؤ"

"ہاں ہاں۔ تم سور لوگ۔ سات سوتا اور خرگوش کی طرح بچے پیدا کرتا اور بچے پیدا ہوتے تو ہم سے مہربانی کو کہتا، کالا آدمی، زمین کا کھودنے والا"

"حضور صاحب" سوہن میں بولا "میں نے دولت پور میں سنا تھا کہ فیکٹری میں کام کرنے والے کو کم از کم تیس روپیہ تنخواہ ملتی ہے"

"جھوٹ بکتا ہے" اور صاحب پھٹ ہی پڑتے کہ اتنے میں لالکا کا ایک رجسٹر لئے آگیا۔

"چلو کہیں اور تلاش کریں" منو نے ہری کو ایک ٹھوکا دے کر کہا۔ لیکن ہری کو اور فیکٹریوں کے متعلق اتنی بھی امید نہ تھی۔ اُسے سب حالات معلوم تھے۔

"اچھا! بولو۔ نوکری مانگتا ہے کہ نہیں" صاحب نے اپنی مونچھوں کو مروڑتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا "تمھیں اور کہیں کام نہیں ملے گا، بمبئی میں سینکڑوں قلی بھرا پڑا ہے جسے کام نہیں ملتا تمھیں تو اس لئے لیتا کہ کام جانتا اور یہ لڑکا تیز معلوم دیتا"

"حضور ہم تو آپ کے ہی پاس کام کرنا چاہتے ہیں۔ پر ہماری بدنصیبی پر ذرا ترس کھائیے۔ یہاں چاول بڑا مہنگا ہے"

"اچا۔ اچا۔ تم دونوں کو پندرہ روپیہ مہینہ ملے گا" نورمین نے ہاتھ اٹھا کر دھمکانے کے انداز میں کہا "اب کے ہم تم پر ترس کھاتا ہے پچھلی دفعہ تم یہاں تھا تو ہمارے لئے کچھ نہیں کیا۔ ہم تم لوگوں پر بہت ترس کھاتا" اور پھر وہ کاروباری انداز میں مسکرائے "تمھارے پاس روپیہ تو نہیں ہوگا۔ اچھا ہم روپیہ پر مہینہ کے حساب سے دس روپیہ پیشگی دیتا ہے اور مہینے پر جو پیسہ تم کو ملے گا، اس میں جوڑ دے گا۔ برابر ہے؟ اچھا اب روپیہ لادیتا"

صاحب روپیہ لینے گئے۔

"میں اس سے کم سود پر اُدھار دیتا ہوں۔ روپیہ پیدا کرنا" نادر خاں بولا۔

"اب تو ہم نے صاحب سے حامی بھر لی" ہری نے جواب دیا۔ اس کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا کہ اب نادر خاں خفا ہو جائے گا۔

صاحب کی غیر موجودگی اور نادر خاں کے کوٹھری میں چلے جانے پر منو نے موقعہ پا کر ایک دفعہ پھر ہری کو بھیلا اور فورمین کو کمیشن دینے اور پھر اتنے بھاری سود پر روپیہ لینے کی بے وقوفی جتائی "ارے سب بے کار ہے" ہری بولا "ہر جگہ یہی معاملہ ہے۔ فورمین کو کمیشن دینا تو اپنی حفاظت کا سامان کرنا ہے۔ اسی کا حکم فیکٹری میں چلتا ہے"۔ منو نے سوچا کہ واقعی ایسا ہی ہوگا لیکن صاحب کے کپڑے تو بالکل چکنے چکٹے تھے۔ منو کو کیا معلوم کہ فیکٹری کے زیادہ تر کام فورمین ہی کے سپرد تھے اور اس لحاظ سے وہ فیکٹری میں سب سے زیادہ اہم شخص تھا۔ مل مالکوں کی طرف سے مزدوروں کو یہی رکھنا نکالنا وہ تو خدا تھا جس کے سہارے سے مزدور اپنی حاصل کی ہوئی نوکریوں سے لٹکے رہتے تھے۔ وہی کام کاج کرتے وقت مزدوروں کی دیکھ بھال کرتا تھا چیف میکینک بھی وہی تھا اور مستریوں کی مدد سے مشینوں کو چالو رکھتا تھا۔ مزدوروں کو کام بھی وہی سکھاتا تھا۔ مزدوروں اور مالک کے درمیان بھی وہی تھا۔ جب کبھی مالک کو کسی تبدیلی کی اطلاع مزدوروں کو پہنچانی ہوتی تھی تو اسی کے ذریعہ پہنچائی جاتی تھی ـــــ اور ان ہی وجوہ کی بنا پر وہ ہر مزدور سے نوکری کے عوض کچھ نہ کچھ رشوت لیتا تھا۔ اگر فیکٹری میں مزدوروں کی تعداد نوکریوں سے بڑھی ہوئی ہوتی تو یہ رشوت بھی بڑھ جاتی تھی، ساتھ ہی ساتھ وہ

سود پر روپیہ بھی قرض دیتا تھا ـــــ اور آخر میں وہ زمیندار بھی تھا، فیکٹری کے آس پاس کی زمین پر اس نے سینکڑوں پھوس کے جھونپڑے بنوا رکھے تھے جو کرائے پر مزدوروں کو دیا کرتا تھا۔

چٹا صاحب جب روپے لے کر واپس آئے تو زمینداری کی حیثیت سے آئے۔

"یہاں صاحب کی گلی کے سرے پر میرا ایک جھونپڑا ہے جس کا کرایہ پانچ روپیہ ہے اور وہ کھلا ہوا بھی ہے۔ تم لوگوں سے تین روپیہ لوں گا۔ جا کر لے لو ورنہ پھر کسی اور کو دے دوں گا"

"حضور مائی باپ، آپ بڑے مہربان ہیں" ہری نے پھر ہتھیلی سے اپنا ہاتھ چھوا۔

"اچھا۔ اچھا۔ جاؤ اور تم سب کل پہلی سیٹی پر حاضر ہو جانا"

جمی ٹامس نے اپنی مونچھ مروڑی، ہونٹ سکوڑے اور اس کے موٹے تھپے چہرے پر ایک نرمی سی آگئی جو بھلائی کرنے کے بعد آتی ہے۔

قافلہ جس راستہ سے آیا تھا اسی سے واپس ہوا۔

"یہی ہے صاحب کی گلی" ہری بولا۔ اب یہ لوگ سڑک پار کر کے ایک نشیب میں اترے جس کے کناروں پر کوڑے کا ڈھیر لگا تھا اور گندے پانی کی نالیاں بہہ رہی تھیں۔ "صاحب نے کہا تھا کہ گلی کے سرے پر ہے جھونپڑا۔ تو وہ یہی جھونپڑا ہوگا" اس نے پاس کے ایک پھوس کے جھونپڑے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ چھ فٹ اونچا، اور پانچ فٹ چوڑا جھونپڑا فیکٹری کی خاکی رنگ کی عمارت سے کوئی سو گز کے فاصلہ

پر تھا۔ ہری یہاں کے چپہ چپہ سے واقف تھا کیونکہ وطن جانے سے پہلے وہ سال بھر یہاں رہ چکا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور بوری کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ سب اس کے پیچھے اس تندور نما کوٹھری میں داخل ہوئے۔ پھوس سے چھائی ہوئی چھپر کی چھت جو گھن کھائے ہوئے شہتیروں پر ٹکی تھی اتنی اونچی نہ تھی کہ لکشمی اور منوتن کر کھڑے ہو سکتے۔ البتہ ہری کا سر چھت میں نہیں لگا کیونکہ اس کی کمر کسی قدر جھکی ہوئی تھی۔

کچی زمین کا فرش باہر کی سڑک کی سطح سے بھی نیچا تھا اور اس پر جا بجا گھاس اگ آئی تھی جسے بارش کے پانی نے سینچا تھا۔ یہ جھونپڑی کھڑکی اور چمنی سے بھی قطعی بے نیاز تھی، نہ روشنی اندر آ سکتی تھی نہ دھواں باہر جا سکتا تھا لیکن دروازے پر ٹاٹ کا پردہ تو تھا جب کہ اور جھونپڑوں میں دنیا کی نظروں سے محفوظ رہنے کے لئے پھٹیچر بوریاں، ٹین کے ٹکڑے، اور سینک کی ٹوٹی ہوئی چکیں لٹک رہی تھیں۔

"آؤ بھئی بیٹھ جائیں۔ ذرا آرام کر لیں"، ہری نے چاروں طرف دیکھ کر مطمئن لہجے میں کہا۔ "لکشمی راستے کے کھانے میں سے کچھ بچا ہو تو دے"

منوا اس قبر نما جھونپڑی کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ جب اسے دوہرا ہو کر جھونپڑی کی دیواروں سے نکلتی ہوئی نم آلود بو سونگھنی پڑی تو اس کے تمام خواب مٹی میں مل گئے۔ اس نے تو ان اونچی اونچی عمارتوں کو اس امید سے دیکھا تھا کہ سب سے اوپر والی منزل پر رہے گا اور وہاں سے اس شاندار شہر کے نظارہ کا لطف اٹھایا کرے گا۔ ایک دم اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔ اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا، آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ جی گھبرانے لگا، غشی سی طاری ہونے لگی اور وہ اس گھٹے ہوئے ماحول میں سانس لینے کی کوشش کرنے لگا۔ اس

نے مسکرانے کی ایک ناکام سی کوشش کی اور گرنے سے بچنے کے لئے وہ ایک دم سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

نکشی جو ٹرنک میں سے باسی میٹھی پوری نکال کر بانٹ رہی تھی، ایکدم دوڑ کر اس کے پاس پہنچی۔

کچھ دیر بعد منو کی طبیعت ٹھیک ہوئی اور وہ سفر کی اور رات بھر سونے کی تھکان اور فیکٹری کے ماحول کی پریشانی کو جلد ہی قابو پا کر ہری کے ساتھ گھومنے پھرنے اور خریداری کرنے نکلا۔

یہ بازار ایک پتلی سی سڑک پر تھا جو سر جارج وہائٹ اور جمشید جی کاؤس جی کی فیکٹری کے بیچ میں سے گزتی تھی۔ بازار کیا تھا کچھ ٹوٹے پھوٹے معمولی سائبان لگے تھے جن میں رنگ برنگے کپڑے، جھوٹے موتی، ٹین کے کھلونے چھریاں، سستے قسم کے عطر وغیرہ بک رہے تھے۔

البتہ کچھ دوکانیں باقاعدہ تھیں، مثلاً ایک شراب کی دوکان جس کا لک ایک موٹا سا پارسی تھا، ایک پان بیڑی کی دکان جس میں ایک بڑا سا آئینہ لگا تھا، ایک نانبائی کی دکان جہاں ایک چکنے کپڑوں والا مسلمان بیٹھا تھا، ایک کپڑے کی دوکان جہاں ایک درزی بھی سنگر مشین لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ اور سب کے آخر میں ایک بنئے کی دوکان تھی جس پر ایک گورے رنگ کا دبلا سا سکھ بیٹھا تھا۔ صاف ستھرا صافہ، بند گلے کا کوٹ، سفید چوڑی دار پاجامہ اور کالے پمپ۔ ہاتھ میں ترازو لئے آٹا دال چاول شکر وغیرہ لکڑی کے بکسوں میں سے نکال نکال کر پتھر اور لوہے کے باٹوں سے تولتا جا رہا تھا۔

"سلام سردار جی" ہری نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں حد درجہ لجاجت کی روشنی جو کہ ہمیشہ ہی تھی۔ منو کو بڑا عجیب لگا۔ اور وہ کوئی گز بھر دور ایک

اینٹ پر بیٹھ کر تلیوں کو دیکھنے لگا جو کمریاں، لنگوٹ سے اور پہنے پھینٹے باندھے ایک نیم دائرہ کی شکل میں دوکان کے آس پاس کھڑے تھے۔ ایک ادھ آدمی بھی تھا سفید براق صافہ، سفید کوٹ، کمر پر سرخ پیٹی بندھی ہوئی اور اپنے آگے ایک سفید چادر پھیلائے تھا۔

"ایکا - دوا - ایکا - دوا"

ہری کے مودبانہ سلام کا قطعی نوٹس لئے بغیر سکھ چاول تولتا جارہا تھا۔

"کب آئے ہری؟" ایک قلی نے پوچھا اور اپنی دونوں بغلوں میں دو مرغیاں دبائے دوکان سے پھر کر کھڑا ہوگیا "بال بچے اچھے ہیں؟"

"سب آئے ہیں میرے ساتھ" ہری نے جواب دیا

"ایکا - دوا - ایکا ... ... ارے یہاں کیوں بھیڑ لگا کر بک بک کر رہے ہو۔ سکھ چینیا" یہ دوکان ہے کہ کوئی جھنگڑ خانہ ہے تمہارے گپ شپ کرنے کو۔ چلو۔ چلو کھسکو۔ ادھر سے ہوا چھوڑ کر کھڑے ہو۔ کھڑے کھڑے سب چیزوں پر اپنی منحوس چھایا ڈال رہے ہو"

سب قلی چپ ہو گئے۔ اور کھسیانی سی مسکراہٹ چہرے پر لاکر سر جھکا لیا۔

"ایکا - دوا - ایکا - دوا - تیا" سکھ نے خاموش ماحول میں دال تولنی شروع کی۔

"اور چٹا صاحب کو کیا چاہئے؟" اس نے سات مختلف قسم کی چیزیں تولنے کے بعد بیرے سے پوچھا جو چادر کے مختلف کونوں میں ہر چیز کو رسی سے باندھ رہا تھا۔

"دو ڈبل روٹی، ایک درجن انڈے اور دو مرغیاں؟" بیرا بولا
"یہ لو ڈبل روٹیاں" سکھ نے دو ڈبل روٹیاں نکالیں "اور یہ لو
ایک - دو - تین - چار - ایک درجن انڈے اور مرغیاں ... "
اب اس نے اس قلی کی طرف دیکھا جو مرغیاں بغل میں دبائے کھڑا تھا "ابے
او اُلو کے پٹھے شمبھو - ان دو مرغیوں کا کیا لے گا؟"
شمبھو جلدی سے آگے بڑھا، تیزی سے اس کی ٹانگیں آپس میں ٹکرا
رہی تھیں -
"سردار جی ہاتھ لگا کر تو دیکھو" اس نے ایک کے بعد ایک دونوں
کڑکڑاتی مرغیاں آگے بڑھائیں -
"ہوں" سردار جی مرغیوں کو چھو کر ایک طنزیہ مسکراہٹ لبوں پر
لائے - اور ساتھ ہی ساتھ صاحب کے بیرے کو بھی آنکھ ماری "یہ مرغا تو بڈھا
ہے اور دوسرا تو ہلکا پھول ہے - اس میں رکھا ہی کیا ہے، ہڈیاں
ہی ہڈیاں ہیں - بول کیا لے گا؟"
"سردار صاحب آپ مالک ہیں، مائی باپ ہیں - آپ خود ہی سمجھ
کر ٹھیک دام دے دیجئے - یہ تو بالکل جوان پٹھے ہیں - ہم نے
خود بھوکے رہ رہ کر ان کو روٹیاں کھلا کھلا کر پالا ہے"
"یہ لو بدرالدین" سکھ نے دونوں مرغ فورمین صاحب کے
بیرے کے حوالے کئے اور آنکھ بھی ماری اور مسکرایا بھی، کیونکہ ابھی تک دام
کچھ طے نہیں ہوئے تھے "میں سب کچھ صاحب کے حساب میں لگا دونگا
اور یہ لو" انھوں نے اپنے پیچھے رکھی ہوئی برفی میں سے رنگ
برنگی انگریزی مٹھائیاں نکالتے ہوئے کہا "یہ میم صاحب کے واسطے۔

تم کسی دن دوپہر کو آجانا تو سب حساب ہو جائے گا"

بیرے نے مرغوں کو بغل میں دبایا، منھائی جیب میں رکھی اور گوری چمڑی والوں کے نوکروں کی طرح اکڑتا ہوا چل دیا۔

"اے شمبھو! مرغوں کے پیسے لے گا کہ چاول دے دوں؟" سردار جی نے پوچھا۔

"آدھے پیسے دیدیجئے سردار جی اور آدھے کے چاول" شمبھو نے لجاجت سے کہا۔

"اچھا تو یہ لے چار آنے اور ایک سیر چاول دیئے دیتا ہوں" سردار جی نے ترازو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مگر سردار جی" شمبھو ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کرنے لگا "ایک ایک مرغ روپیہ روپیہ کا ہے۔ میری بیوی نے اسی لئے انھیں اچھی طرح کھلایا پلایا تھا کہ بکیں گے تو کم از کم آٹھ دن کا کھانا تو نکل آئے گا۔ ہم تو انھیں کبھی نہ بیچتے مگر پیسے سب ختم ہو چکے ہیں خدا تو انصاف کیجئے اور ایمانداری سے سودا کیجئے"

"تو میں کیا بے ایمانی کر رہا ہوں" سردار کا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا "صاحب مجھے ان مرغوں کے دام دینے سے رہے۔ یہ تو ان کی کمیشن ہے کہ میں یہاں دوکان لگا سکوں۔ مجھے ان مرغوں میں کچھ نفع نہیں ملنے والا ہے"

"آپ اور صاحب دونوں میرے مالک ہیں۔ آپ لوگ امیر ہیں ایک دوسرے سے لینا دینا کر سکتے ہیں۔ میرے پاس فالتو مرغی ہوتی تو آپ کو ضرور دیتا۔ میری تو کل پونجی یہی دو

مرغیاں ہیں، قرضدار الگ ہوں۔ میری ساری تنخواہ قرضے میں کٹ گئی۔ بال بچوں کے کھانے کو کچھ نہیں۔ سیر بھر چاول تو ایک دن بھی نہیں چلیں گے۔ اور چار آنے کا اس مہنگی میں کیا ملے گا ذرا تم کھائیے میرے ساتھ انصاف کیجئے۔ ایمان کی بتلائیے۔"

"تو میں تمہیں ٹھگ رہا ہوں؟ میں بے ایمان ہوں؟ میں؟ مگر دغا کرنے کا ماننے والا؟ مجھ پر الزام لگاتا ہے۔ چل دو آنے اور لے لینا۔ اور جا یہاں سے شور نہ مچا۔ اور بھی گاہک کھڑے ہیں۔"

"مگر حضور ... ..." شمبھو نے اپنے دھنسے ہوئے گالوں اور آنکھوں کے سیاہ گڑھوں میں انتہائی لجاجت پیدا کر کے کہا "ہم پر ترس کھائیے۔ میرے بال بچوں پر رحم کیجئے۔ مرغیوں کا دام دیجئے۔"

"دور ہو میری نظروں سے،" خالصہ جی گرجے اور ایک دم سے اٹھ کر شمبھو کو ایک ڈونی رسید کی "نکل یہاں سے نکھرا کہیں کا۔"

شمبھو پیچھے کو ہٹا۔ مگر ڈونی منہ پر لگ چکی تھی اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

منو حیرت سے اپنی جگہ جما رہ گیا اور خلا میں گھورتا رہا جیسے اُسے اس لڑائی سے کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔ جب شمبھو کو ڈونی لگی تو منو ایک تڑپ کا نپا ضرور۔ لیکن جب شمبھو گر پڑا تو پھر اس کا رویہ وہی کا وہی ہو گیا۔

ہری اور دوسرے قلیوں نے لپک کر شمبھو کو اٹھایا "اٹھ۔ اٹھ بھی جا۔ مرو بنا،" قلی اپنے ساتھی سے اپنی ہمدردی کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ ہر ایک کا مارنا برداشت کر لیتا اور ان کو کبھی کبھی

ناراض نہ کر سکتے تھے۔

"یہ لو ایک آنہ اور اور اس سود کا چاول۔ لو اور گرو کے لئے اسے میری نظروں سے الگ لے جاؤ"، قلیوں نے مل کر شمبھو کو اٹھایا شمبھو نے منہ سے نکلتا اور ٹھوڑی پر بہتا ہوا خون پونچھا، پیسے لئے، چاول کی پڑیا سنبھالی، سردار کی طرف ہاتھ جوڑ کر رونے لگا "سردار جی مجھے معاف کرو" اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

"تم لوگوں کو کیا چاہئے"، سردار نے اور قلیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کچھ نہیں سردار جی"، ایک قلی سب کی طرف سے بولا "ہم اس لئے کھڑے ہیں کہ کہیں کوئی بوجھ پہنچوانا ہو تو دیجئے"

"نہیں۔ آج کوئی بوجھ نہیں ہے"، سردار جی نے چڑ چڑا کر کہا اور پھر منو کی طرف مخاطب ہوئے "او ہے۔ تجھے کیا چاہئے"

"یہ لڑکا میرے ساتھ ہے"، ہری نے کہا "میری ہی میل میں نوکر ہوا ہے۔ آپ کے یہاں حساب کھولنا چاہتا ہے۔ اور مجھے تو آپ پہچانتے ہوں گے۔ آپ کا چاکر ہری۔ میں پچھلے سال یہاں قلی تھا"

"اب میں نے قرض کے روپیہ پر سود بڑھا دیا ہے"، سردار جی بولے "میں قرض لینے آیا ہوں سردار جی۔ پر دو روپیہ کے چاول اور ایک روپیہ کی دال آپ ادھار دے دیں گے تو مہربانی ہو گی۔ باقی سامان میں نقد خرید لوں گا"

"ادھار سامان پر ایک آنہ فی روپیہ کے حساب سے سود لگے گا"، سردار جی نے اعلان کیا۔

"آپ مالک ہیں۔ اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے"

"اچھا تو پھیلاؤ اپنا انگوچھا" سردار جی نے ایسے کہا جیسے کوئی احسان کر رہے ہوں "اور اور کیا کیا چاہئے۔ بولو"

"آٹا کیا بھاؤ ہے سردار جی"

"آٹا روپیہ سیر، چاول آٹھ آنے سیر، مسکہ پانچ روپیہ سیر، سرسوں کا تیل روپیہ سیر، چنے کی دال آٹھ آنے سیر، گڑ چار آنے سیر، انگریزی شکر آٹھ آنے سیر" سردار جی نے چڑچڑاتے ہوئے جلدی جلدی سب چیزوں کے دام بتائے۔

ہری نے دس سیر آٹا، پندرہ سیر چاول، پانچ سیر دال، ایک سیر تیل اور ایک سیر دیسی شکر کی درخواست کی۔ اس نے حساب نہیں کیا کہ سب ملا کر مہینے کے آخر میں اسے کتنے روپے دینے پڑیں گے کیونکہ اسے پندرہ روپے مہینے کی نوکری کے خیال سے کافی خوشی اور جوش تھا۔

صبح کی ٹھنڈی ہلکی ہوا میں فیکٹری کی سیٹی کی تیز آواز گونج رہی تھی۔ لکشمی اٹھ چکی تھی اور تقریباً برہنگی کے عالم میں کوٹھری کے اندھیرے میں چاروں طرف ٹٹول رہی تھی کہ رات کا باسی دال بھات نکال کر اپنے عزیزوں کو کھلائے۔ جب وہ جھک کر مٹی کی نئی ہنڈیا کو کھرچ رہی تھی کہ جتنا ممکن ہو نکال سکے تو اس کے ماتھے پر پسینے کی بڑی بڑی بوندیں ابھر آئیں۔ لیکن وہ گرمی سے پریشان نہ ہوئی۔ اس کا دوشیزہ چہرہ ابھی تک دیہات کی فضا کی تازگی لئے تھا حالانکہ وہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ یا تو وہ بالکل معصوم تھی اور صعوبتوں کو سمجھ نہیں سکتی تھی یا پھر اس میں اتنی توانائی تھی کہ اس کی شرمیلی سیاہ آنکھوں میں

ہمیشہ روشنیاں جھلکا کرتی تھیں جو اس کی چمکتی ہوئی ناک کی کیل سے ہمیشہ کھیلتی رہتی تھیں۔ اس کے نیم وا ہونٹوں پر ہمیشہ ایک بھولی بھالی بہادرانہ مسکراہٹ کھیلا کرتی تھی، ٹھوڑی پر ایک ننھا سا گڑھا تھا، اپنے اور دنیا دونوں کے وجود سے بالکل بے خبر اور بے نیاز!

فیکٹری کی سیٹی کی آواز سن کر لکشمی ایسی دوڑی جیسے جنگل میں شیر کی دھاڑ سن کر ہرن چھلانگ مارتا ہے۔ کسی نامعلوم خوف سے اُسے اپنے پیٹ میں ایک ٹھنڈک سی محسوس ہوئی یہاں تک کہ وہ اس کے احساس سے ہنس پڑی وہ اٹھی اور اپنا خوف اپنے شوہر کے ساتھ بانٹنے کے خیال سے اس تک گئی جیسے کوئی بچہ مشکل کے وقت اپنے ماں باپ کے پاس بھاگتا ہے۔ اس نے اس کے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر ہلایا۔

"ہوں۔ ہوں۔ ہو" ہری نے آنکھیں کھولدیں اور ایک دم سے اٹھ بیٹھا۔

"کام پر جانے کا وقت آگیا" لکشمی نے نرمی سے کہا۔ "پہلی سیٹی ہوگئی ہے" اور پھر وہ بچوں کو جگانے لگی۔ اپنی ساری کا ایک کونہ بھگو کر اس نے ان کی کیچڑ بھری آنکھیں پونچھیں۔

"اٹھو بھائی" ہری نے منو کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔

منو نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں، ادھر ادھر سر گھمایا، جمائی لی، ہاتھ تانے، دو ایک کروٹیں لیں اور اٹھ بیٹھا۔ اٹھتے ہی اس کی نگاہ لکشمی پر پڑی جو اس وقت گھونگھٹ نہیں نکالے تھی۔ منو نے لکشمی کی عمر، رنگ، اور شکل صورت کی لڑکیوں کو پہلے بھی دیکھا تھا۔ اس کے سارے وجود

میں ایک ایسی گرمجوشی سی پیدا ہوگئی جو کسی حسین شے کو دیکھ کر ہوتی ہے۔

"تھوڑا سا پانی ملے گا منہ دھونے کے لئے" اس نے لجاجت سے کہا، وہ لکشمی سے مخاطب تو نہیں ہوا لیکن اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ سن لے۔ لکشمی نے اس کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے نگاہیں ہٹا کر مسکرا دی اور ایک پیتل کے گڑوے میں پانی بھر کے جھونپڑی کے پرلے سرے پر لگے ہوئے پتھر کے صندلے پر رکھ دیا۔ یہ صندلا ذرا جھکا کر لگا ہوا تھا اور آخر میں ایک سوراخ پانی نکلنے کے لئے بنا تھا۔

"اگر تالاب پر نہانے کو جائیں گے تو کھانے کے لئے وقت نہیں رہے گا" ہری نے اپنی بیوی کو کھانا نکالتے دیکھ کر کہا۔

"کل سے پہلی سیٹی سے پہلے اٹھنا چاہئے"

لکشمی نے شوہر کی باتوں کے باوجود بچوں کو پھسلا کر کھانا کھلانا شروع کر دیا لیکن دونوں بچے نیند پوری ہونے سے جگا دیئے جانے سے چڑچڑے ہو رہے تھے اور ٹھنٹھنا کر کھانا کھانے سے انکار کرنے لگے۔

"چلو۔ چلو" ہری تو بستر سے اٹھتے ہی چلنے پر تیار ہوگیا تھا اور باہر نکلا۔ منہ کرتے سے منہ پونچھا اور اس کے پیچھے نکل آیا۔ اس کو اپنا چہرہ تو دھونے کے بعد تازہ محسوس ہو رہا تھا مگر منہ ابھی تک باسی تھا۔ کئی دن سے دانت نہیں مانجے تھے۔

لکشمی نے اپنے تیار ہونے اور بچوں کے تیار کرنے میں اور پھر گھر ٹھیک ٹھاک کرنے میں ذرا دیر کی۔ ہری غصے میں گرج پڑا۔

"چل چل۔ کتنا کہیں کی۔ دیر لگائے جا رہی ہے۔ سب لوگ روانہ بھی ہو چکے"

تب کہیں جا کر لکشمی بچوں کو لئے باہر نکلی۔

تالاب کے کنارے پر جا کر یہ لوگ اور لوگوں کے آس پاس فراغت کے لئے بیٹھ گئے۔ ابھی بیٹھے دیر نہیں ہوئی تھی کہ دوسری سیٹی کی چیخ سنائی دی۔ جلدی جلدی سب اٹھے، دھویا دھایا۔ تالاب کے پانی پر سے کائی ہٹا ہٹا کر چلو بھر بھر کر پانی منہ پر ڈالا۔

تیسری اور آخری سیٹی انھیں فیکٹری سے چند گز کے فاصلے پر ہوئی۔ یہ لوگ بھی قلیوں کے جم غفیر میں مل گئے۔ اور کیچڑ بھرے راستوں اور پھسلندی پگ ڈنڈیوں سے ہوتے چلے۔ سب مزدور خاموش تھے، ان کے ماتھوں پر خوف کے آثار نمایاں تھے اور جھکے ہوئے سر فکر میں غرق تھے، کبھی کبھی کسی قلی کا پاؤں چھپاکے کے ساتھ کیچڑ میں جا پڑتا تو وہ ایک گالی بک دیتا، یا کوئی بوڑھا اللہ والا قلی کسی دوسرے قلی کو دیکھ کر رام۔ رام کہتا۔ یا کوئی نوجوان قلی اپنے ساتھی کو جلدی چلنے کے لئے ٹھیلتا کیونکہ اس پورے قافلے کی رفتار سست، بہت ہی سست تھی۔

منو نے دیکھا کہ فیکٹری کے گھڑیال میں چھ بجے تھے۔

نادر خاں کے پاس سے گذرتا ہوا وہ ہری کے پیچھے پیچھے ایک گندے سے صحن میں داخل ہوا جہاں ہر طرف کوڑا پڑا تھا اور بڑی بڑی موٹر لاریوں میں روئی کی گٹھریاں لدی پڑی تھیں۔

فیکٹری کے کئی حصے تھے اور ایک دوسرے میں ایسے ٹھونس ٹھانس کر بنائے گئے تھے کہ اگر پھیلائے جاتے تو آدھے بھی اتنی جگہ میں نہ آتے، دوسرے مزدوروں کو اس پچ پچ کا احساس بھی نہیں ہوا۔ اور سب قلی ادھر سے ادھر چھپا چھپ چلے جا رہے تھے گویا ان کی زندگی ہی یہی تھی،

یا تو وہ میل کے ماحول کے عادی ہو گئے تھے یا پھر انھیں اپنے چھوٹے تنگ جہنم نما کوٹھریوں کے مقابلے اس نسبتاً کھلی فضا میں رہنا اچھا لگتا تھا۔ منو کو تو ایک بنگلہ بہت پسند آیا جو بعد میں معلوم ہوا کہ چمٹا صاحب کا تھا۔ یہ بنگلہ منیجر کے آفس کے بائیں طرف تھا اور اکیلا کھڑا ہوا بڑا بھلا لگتا تھا۔ اس میں باغ بھی تھا جس میں نرگس اور گل داؤدی خوب پھول رہے تھے۔ فیکٹری کے سامنے جو سائبان تھا اس کے دروازے پر جمی ٹامس صاحب کھڑے تھے۔ قلیوں کا ایک ایک جتھا نگاہیں اٹھا کر انھیں مونچھیں مروڑتے دیکھتا، ہاتھ اٹھا کر سلام کرتا اور پھر جھپ سے اندر گھس جاتا جیسے مرغی کے بچے چیل کے سائے سے چھپتے ہیں۔ لیکن فیکٹری کا دروازہ اتنا بڑا تو تھا ہی نہیں کہ سب ایک ساتھ دھنس جاتے۔ لہٰذا چمٹا صاحب نے پہلے ہی موقعہ پر کالی چمڑی والوں کو منظم ہونے کے قواعد پر لیکچر پلانا شروع کر دیا۔

"سؤر کا بچہ۔ اب بھاگتا۔ پہلے برابر ٹائم سے کیوں نہیں آیا کہ اب بھاگ بھاگ کر پورا کرتا ہے۔ ایک کے پیچھے ایک لائن سے آؤ۔" صاحب اپنی ہندستانی میں چیخے جا رہے تھے۔

"سلام صاحب" ہری نے کہا۔ اس نے یہ عقلمندی کی کہ سب سے پیچھے ٹھہر گیا اور جب سب جا چکے تو آگے بڑھ کر سلام کیا۔

"تم نئے قلی ہو" صاحب نے ایک چکنے رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "چلو ہم تم کو کام بتائے گا"

"ہاں حضور" ہری اور اس کی امت پیچھے ہو لی۔

ڈھلائی کا سائبان نیچے کی منزل پر فیکٹری سے کوئی دس گز پرے تھا اور اس میں ایک چھوٹے سے دروازے سے داخل ہوتے تھے۔ صاحب

اس چھوٹے سے دروازہ پر ٹھہر گئے جس میں سے کوئی سر جھکائے بغیر اندر نہ جا سکتا تھا۔

"عورتیں اور بچے ادھر جاؤ۔ ادھر کام ہے۔ یہاں میٹرن کو پوچھو، وہ تم کو کام بتائے گی"۔ اور پھر ان کی ہندستانی ذرا گڑبڑا گئی۔

"میٹرن" اس نے آواز دی۔ لکشمی کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہ آیا اور وہ گھونگھٹ نکالے اپنی جگہ پر جمی رہی۔

"چلو۔ چلو۔ جلدی کرو" صاحب نے زمین پر پیر پٹخے۔ گرمی اور پسینہ سے ان کا چہرہ گلابی ہو گیا تھا۔ ہری ڈر کے مارے کانپتا آگے بڑھا اور اپنی بیوی کو سائبان میں دھکیل دیا۔ ایسے کہ بچے بھی پیچھے چھوٹ گئے۔

"چل۔ چل۔ عورت۔ تجھے سانپ نہیں کاٹے گا" میٹرن نے سائبان میں لکشمی کا استقبال کیا۔

چمٹا صاحب کے بشرے سے منو کو یہ محسوس ہوا کہ اب ہری کی اور اس کی اپنی باری ہے۔ اور وہ بڑی احتیاط سے لوہے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا، لیکن حد سے زیادہ احتیاط کرنے سے اس کے پیر لڑکھڑانے لگے۔

"جلدی چلو" اوپر سے فورمین صاحب چیخے۔ وہ اپنے بھاری جسم کے باوجود بھی زیادہ تیزی سے سیڑھی چڑھ کر اوپر پہنچ چکے تھے۔

"میں تمہارا نوکر ہوں کہ تمہارے لئے کھڑا رہوں گا" منو جلدی جلدی چڑھنے لگا۔ ڈر کے مارے برا حال تھا کہ ایک قدم بھی غلط پڑا کہ نیچے گر کر مرا۔ لوہے کی سیڑھی سے سر کے پرخچے اڑے۔ تاریک دیوار اور بیس منا کمروں کے پاس سے گذر کر وہ فورمین صاحب کے قریب پہنچا۔ ہری کا کہیں

پتہ نہ تھا۔ وہ فیکٹری کے اندر باہر ہر جگہ سے واقف تھا۔ کہیں گھس گیا ہوگا۔ "چلو۔ سؤر"، اور صاحب نے منو کی گردن میں ہاتھ دے کر اُسے ہری اور ایک دوسرے مزدور کے درمیان ایک بکس پر بٹھایا۔ اس دوسرے مزدور کی عمر کوئی تیس برس کی ہوگی، اچھی بھلی صورت، لیکن کان کٹے ہوئے جیسے کوئی پہلوان ہو۔ "یہ قلی تجھے کام بتائیں گے"، چمٹا صاحب بولے، اور پھر مڑ کر غائب ہو گئے۔ منو نے اطمینان کا سانس لیا۔ اندر گرمی بے حد تھی اور منو پسینہ میں تر تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ قلیوں کے سیاہ چہروں پر کسی قسم کا احساس نمایاں نہ تھا۔ پھر اس نے مشین کے لمبے، گول، چوکھونٹے، گاؤدم، ہشت پہلو، ہر قسم کے پرزوں پر نگاہ ڈالی۔ پہلا تجربہ کافی دلچسپ تھا۔ پھر سینکڑوں ایکنوں کے ایک ساتھ چلنے کی آواز سے اس کے کان بہرے ہونے لگے۔ چاروں طرف لگے ہوئے لکڑی کے لمبے لمبے ستونوں سے اُسے کسی قدر تسلی ہوئی مگر ان کا وجود بھی قید خانے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر گھما کر دیکھا ستونوں پر تمام کالک بھری روئی جگہ جگہ چپک گئی تھی۔ پھر اس نے اوپر دو ننھی ننھی کھڑکیاں دیکھیں جن میں سے روشنی اندر کی طرف جھانک رہی تھی۔ ہوا گرم اور گھٹی ہوئی تھی اور روئی اور تیل کی ملی جلی بھاری بُو اس کے نتھنوں کو چیر رہی تھی۔ منہ تمام پسینہ میں تر تھا، کرتا بھیگ کر پیٹھ سے چپک گیا تھا اور اسے ایسی پریشانی اور تنہائی محسوس ہو رہی تھی کہ اب پاگل ہو جائے گا۔

"تم یہاں کھڑے ہو جاؤ"، ہری نے بائیں طرف سے کہا۔ "اور جیسے میں ہینڈل گھما رہا ہوں اسی طرح گھماتے جاؤ۔ اگر تاگا ٹوٹ جائے تو جوڑ لینا"

منو نے سوچا کہ یہ تو بڑا آسان کام ہے اور وہ کام میں جُٹ گیا۔

پہلے تو اس کے ہاتھ دھیرے دھیرے چلتے رہے جیسے خوف زدہ ہوں۔
"ذرا اور تیزی سے گھماؤ بھائی" ہری نے کہا۔
اب کی منو نے ذرا تیز چلایا۔ تاگہ ٹوٹ گیا۔ اور اُسے جوڑنا بھی نہ آتا تھا۔
اس کی دوسری طرف ضرور بیٹھا تھا اس نے آواز دی
"دیکھو اس طرح تاگا جوڑا جاتا ہے" اور اس نے جان بوجھ کر تاگا توڑا اور جوڑ کر منو کو بتایا۔ منو نے ویسا ہی کیا اور کام بن گیا۔ اُسے بڑی ہی خوشی ہوئی کہ اب اسے اپنا کام آگیا ہے اور وہ معمولی رفتار سے مشین کو چلانے لگا۔
کام آسان تھا، مشین ہی سارا کام کرتی تھی۔ وہ تو صرف ایک ہینڈل گھمائے جاتا تھا۔ تاگا نکلتا جاتا تھا اور آگے جاکر نمونوں میں تبدیل ہوتا جاتا تھا۔ ہاں اتنی بات ضرور تھی کہ نگاہ برابر تاگے پر جمائے رکھنی ہوتی تھی جس سے کافی تھکن ہوتی تھی مگر کام کی نوعیت میں اُسے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اور وہ جلدی جلدی مشین گھمانے اور ٹوٹے ہوئے تاگے بخوبی جوڑنے لگا۔ مشین کی گھنگھناہٹ، پستونوں کے چلنے کی چھک چھک، پہیوں کی ٹک ٹک اور بڑے بڑے مہیب پہیوں کی رگڑ کی آواز فضا میں گونج رہی تھی، ساتھ ہی ساتھ گرمی غضب کی تھی، تیل اور سوت کی بُو مل جل کر منہ میں کڑوا مزہ پیدا کر رہی تھی ـــــ اور اس پوری فضا سے ایک سیاہ دھواں سا اٹھ رہا تھا جو گلا گھونٹے ڈال رہا تھا۔ منو کو اپنے گاؤں کے جولاہے اور تیلی کی دوکان کے تاریک سائبانوں کی یاد آگئی جہاں ہر وقت کو لھو چلا کرتا تھا۔ اور دھان منڈی کی وہ آٹے کی مشین جہاں وہ نفاست پسند عورتوں کے لئے تازہ آٹا پسوا کر ڈھویا کرتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے دن چڑھتا گیا منو کو ایسا لگا کہ اس فیکٹری کا سا جہنم اس نے کبھی بھی نہ دیکھا تھا۔ جون کا سورج تیزی سے اپنی گرم کرنیں کھڑکیوں میں سے پھینک رہا تھا اور اس کی چمک میں روئی کے ذرّے

مشینوں پر جھلملاتے دکھائی دینے لگے تھے، ایسے رنگین جیسے دھنک کے سب رنگ ان میں سمو دیئے گئے ہوں۔ صرف کھڑکیوں ہی میں سے نہیں بلکہ لوہے کی چھت کی درازوں میں سے بھی روشنی اور دھوپ چھن چھن کر آ رہی تھی۔

دوپہر ہوتے ہوتے تو منو کا چوٹی کا پسینہ ایڑی تک آنے لگا۔ کام میں مشغول ہونے کی وجہ سے وہ پسینہ پونچھ بھی نہ سکتا تھا اور ویسے بھی اس نے سوچا کہ چلو اچھا ہی ہے بدن کا سب زہر نکل جائے گا۔ پسینہ میں تو کوئی برائی نہ تھی لیکن اس کی وجہ سے جو چپک اور گرمی ہو رہی تھی۔ وہ ناقابل برداشت تھی۔ پھر پسینہ اس کی آنکھوں پر سے ہو کر سامنے بھی گر رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا کہ اور قلیوں کی کیا حالت ہے۔ چاروں طرف تقریباً سب ہی قلیوں نے، اپنے کرتے اتار دیئے تھے اور ان کے ننگے جسم چکنے پسینے میں تربتر چمک رہے تھے، منو نے بھی اپنا کرتا اتارنا چاہا۔ مگر ہاتھ دونوں مصروف تھے۔ اتنے میں ایک تیز سیٹی بجی اور بینڈل سب کے سب اپنی جگہ جامد ہو گئے، ہاں پہیے البتہ چلتے رہے اور دھیرے دھیرے رگڑ رگڑ کر رکے۔ سب قلی اٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھوں سے پسینہ پونچھنے لگے۔ منو بھی اٹھا اور ہوا کھانے کے لئے دروازے کے قریب جا کر کرتا اتارنے لگا۔ آستینیں اتارنے کے بعد جب وہ اپنے میلے، موٹے کرتے کو سر پر سے اتارنے لگا تو وہ گلے میں آ کر اٹک گیا کیونکہ وہ بٹن کھولنا بھول گیا تھا۔ منو نے کرتے کو کھینچا تو اس کی بائیں آستین لٹکنے لگی۔ اتنے میں گرم ہوا کا ایک جھونکا آیا اور آستین ایک مشین کے پہیے میں الجھ کر چشم زدن میں غائب ہو گئی۔ منو اپنے اس نقصان سے بوکھلا کر بے تحاشہ اس مشین کی طرف دوڑا ہی تھا کہ پاس والے مزدور نے ہاتھ بڑھا کر روکا اور ایک گالی دی "ابے حرامی! کچھ حواس میں ہے؟ جان سے ہاتھ دھوئے گا کیا؟" اتنے میں ہری

بھی گھبرا کر دوڑا اور منو کو کھینچ کر لے گیا۔ جاتے وقت منو کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ بڑی سی متعدد سروں اور متعدد ہاتھ پیروں والی مشین اس کمینے پن کے ساتھ منو کو بیوقوف بنا کر اور اُسے قمیص سے محروم کر کے خوب ہنس رہی ہے۔ لیکن باہر نکل کر منو کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا کیونکہ سب ہی قلی ننگے تھے۔ ان کے چہروں پر جھریاں تھیں گال اندر دھنسے ہوئے تھے، جبڑے ابھرے ہوئے تھے۔ اور منڈے ہوئے سروں، چٹیوں، بھوؤں، پلکوں اور پپوٹوں پر روئی کی ہلکی سی تہہ تھی۔

"ٹفن ٹیم" ہری بولا۔ ان انگریزی الفاظ کو ادا کرتے وقت وہ کافی مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ جب سے جمی ٹامس صاحب اس مل میں آئے تھے دوپہر کے کھانے کی چھٹی کو ٹفن ٹیم کہا جانے لگا تھا۔

قلیوں کے منہ ہاتھ دھونے کا کوئی سامان نہ تھا۔ صرف تیل کے خالی ٹینوں اور روئی کے گٹھروں کے درمیان ایک واحد پمپ تھا جس پر کوئی سو آدمی پانی پینے کے لئے جمع تھے۔ آس پاس نہ کہیں کوئی کھانے کی دوکان تھی نہ کھانے کا کوئی اور سامان تھا۔ صرف ایک آدمی دو ٹوکری بھنے چنے اور ایک سستی سی مٹھائی لئے فیکٹری کے باہر بیٹھا تھا۔ لیکن مزدوروں کی عورتیں اپنے رشتہ داروں کے لئے کھانا لیتی آئی تھیں۔ اور زیادہ تر قلی ادھر ادھر درختوں کی چھاؤں میں بیٹھے، چاول کے بڑے بڑے گول گول نوالے بنا بنا کر بھکر بھکر کھا رہے تھے۔ منو نے اتری ہندستان میں کسی کو ایسے کھاتے نہ دیکھا تھا۔

"میری بیوی کیا ہوئی" ہری نے اوروں کو اطمینان سے کھاتے دیکھ کر کہا۔ اور سائبان کی طرف دوڑا۔ منو ایک جھاڑی کے سائے میں لیٹ اور ہری کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن وقت گذرتا گیا۔ سیٹی بھی بج گئی اور

سب کے پیچھے پیچھے منو بھی، دھوپ میں سن سناتے تنل کے پاس سے ہوتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ اندر پہنچتے ہی سہ پہر کی تپتی ہوئی گرمی اس کے دماغ پر بجلی کی طرح گری، آنکھیں جلنے لگیں اور سر ایسا بھاری ہو گیا کہ ہلائے نہ ہلتا تھا۔ بھوک سے ہاتھ پاؤں الگ بے دم ہو رہے تھے۔ ہری کی جگہ چٹا صاحب نے ایک اور قلی کو لا بٹھایا تھا۔ اور منو کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ کیا قصہ ہوا۔ اور وہ اسی طرح بیٹھا ہینڈل گھمائے جا رہا تھا۔ آخر کار ہری بھاگا ہوا ہانپتا کانپتا آیا اور بتایا کہ اس کے لڑکے نے بھولے سے کسی مشین کے پہیے سے ہاتھ میں رگڑ لگا لی۔ منو ہمدردی بھی نہ کر سکا صرف چپ ہو رہا جیسے کسی نے اس کے دل کے تمام تار توڑ دیئے ہوں۔

"تم نے اُسے ڈاکٹر کو بھی دکھایا" پاس بیٹھے ہوئے کن کٹے پہلوان نے پوچھا۔

"نہیں بھائی۔ ابھی تو نہیں دکھایا۔ یہاں میل میں اس وقت کوئی ڈاکدر ہے ہی نہیں۔ چٹا صاحب نے مجھے چھٹی دے دی ہے کہ لڑکے کو شہر لے جا کر ہسپتال میں دکھا دوں۔ لیکن اب میری نوکری گئی سمجھو۔ صاحب بہت بگڑ رہے تھے کہ پہلے ہی دن یہ بات ہوئی اور مجھے جانا پڑ رہا ہے"

یہ کہہ کر وہ مایوسی کے عالم میں جانے لگا۔ پھر وہ منو سے مخاطب ہوا جیسے کچھ بھول گیا ہو۔ اور کہنے لگا

"بھائی شام کو گھر واپس جاتے وقت بچوں کی ماں کو اپنے ساتھ لیتے جانا۔ اُسے خود راستہ معلوم نہیں ہے"

جب ہری چلا گیا تو منو کا دل اس کے واسطے بھر آیا۔ اس کا دل چاہا

کہ اس کے ساتھ جائے اور بچے کو اپنے کندھے پر اٹھا کر ہسپتال تک پہنچا دے۔ ہری بوڑھا اور کمزور تھا۔ وہ بچے کو لے کر فیکٹری سے ہسپتال تک کا طویل رنیلا راستہ کس طرح طے کر سکے گا۔ اس نے ہری کو لوہے کی سیخوں کے پاس گذر کر، کھدی ہوئی مٹی کے ڈھیر پر پڑے ہوئے زنگ آلودہ شہتیروں کے پاس سے گذر کر جاتے دیکھا پھر اسے تالاب کے پاس سے گذرتے دیکھا۔ یہاں گائیں اور بھینسیں گلے تک گدلے پانی میں بیٹھی تھیں۔

پھر اس نے دیکھا کہ ہری نے اپنے پھوس کے جھونپڑے کو جس پر بوری کا پھٹیچر پردہ لگا تھا۔ حسرت کی نظر سے دیکھا اور پھر اس میدان کے پار اوجھل ہو گیا جس پر چمڑے سوکھ رہے تھے۔ منو کو نہیں معلوم تھا کہ ہسپتال کہاں ہے اور وہ سوچنے لگا کہ اگر ہری کا لڑکا مر گیا تو ان لوگوں کے ساتھ رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ یہ لوگ سمجھیں گے کہ یہ میری ہی نحوست ہے۔ اچھا ہے ان لوگوں کو اب تک یہ نہیں معلوم کہ میں یتیم ہوں ورنہ تو یقیناً مجھے منحوس سمجھتے۔ کیا میں سچ مچ منحوس ہوں؟ پہلے تو پیدا ہوتے ہی باپ مر گیا۔ پھر ماں بھی مر گئی۔ میری وجہ سے پرجا کی کمبختی آئی اور اب ہری پر بھی یہ مصیبت ٹوٹی۔ اگر میں منحوس ہوں تو مر کیوں نہیں جاتا؟ اچھا ہو جو مر ہی جاؤں۔ ہاں بہت ہی اچھا ہو جو مر جاؤں، کیونکہ یہ شہر بھی امیدوں کے خلاف ہی نکلا۔ یہاں کتنی گرمی ہے اور صاحب کی گلی والے جھونپڑے سے تو میری چچی کا کچا جھونپڑا ہی ٹھیک تھا۔

ہری کے نہ ہونے سے اسے بڑی تنہائی محسوس ہونے لگی۔ اور کسی سے اس کی جان پہچان نہ تھی۔ مشینوں کا لامتناہی شور اس کے اعصاب کو شکنجے میں کسے دیتا تھا۔ بھوک کسی بڑے سے گندے مکڑ جیسے

کی طرح اس کے پیٹ کو کتر رہی تھی اور ہاتھ پاؤں چور چور ہو کر بیدم ہونے جا رہے تھے۔ خیالات آن آن کر اس کا سر چکرا رہے تھے جیسے لہریں اٹھنے سے کنارے پر جھاگ جمع ہو جاتا ہے اور اس جھاگ میں اس کی روح کی کشتی ہچکولے کھا رہی تھی جیسے وہ کوئی بے حقیقت حقیری شے ہو جو سمندر پار کر جانا چاہتی ہو اور جسے کسی زبردست طوفان کا خطرہ ہو۔ اس کی نظروں تلے وہ رنگین بازار پھرنے لگے جہاں صاحب لوگوں، امیر سوداگروں اور مفلس انسان کا مخلوط ہجوم گھومتا پھرتا دکھائی دیتا تھا، بڑی بڑی شاندار عمارتیں، فیکٹری کے احاطے میں بنے ہوئے اونچے اونچے مکانات، اور خود فیکٹری جہاں وہ کام کر رہا تھا پھر دل میں خواہشوں کا ایک طوفان اٹھنے لگا۔ چٹا صاحب نے اس کی جتنی تنخواہ مقرر کی تھی اتنی اسے زندگی میں کبھی نہ ملی تھی، وہ ان روپیوں سے کیا کیا خریدے گا سیاہ جوتے، گھڑی اور اس کی زنجیر، پوپو ہیٹ، پتلون، قمیص اور صاحبیت کے اور ضروری لوازمات ——— یہ یہ سب تو خواب تھے، پوشیدہ خواب، ان کو تخیل کی نگاہ سے آلودہ کرنا بھی غلط تھا۔ "ہاں ہاں" اس نے اپنے دل ہی دل میں کہا۔ اور زندگی کی طرف پھر ہاتھ بڑھایا۔ زندگی جو چند خواہشوں کے پورا ہونے کا نام تھا۔ "میں زندہ رہوں گا کام کروں گا۔ میں بڑا ہو کر پورا مرد بن جاؤں گا اس پہلوان کی طرح ... ..." اور اس نے پہلوان کی طرف مڑ کر دیکھا۔ ایسا لگا کہ گویا منوا اپنے خیال ہی خیال میں اس سے باتیں کر رہا تھا کیونکہ پہلوان نے جواب دیا۔ "مجھے رتن کہتے ہیں میں پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ تم پہاڑی لگتے ہو؟"

"ہاں میں پہاڑی ہوں۔ لیکن میں نے نیچے شام نگر اور دولت پور میں بھی کام کیا ہے"

"پھر تو ہم دونوں ہم وطن ہیں۔ تمہارا نام کیا ہے"

"منو!" منو نے جواب دیا اور دل ہی دل میں پہلوان کے سیدھے سادھے بے لاگ چہرے کو سراہنے لگا۔ اُسے ایسا لگا کہ اب وہ اکیلا نہیں ہے۔

لیکن ابھی اس دوستی کی ابتدا ہی ہوئی تھی کہ سیٹی کی آواز سنائی دی۔ اور تمام مشینیں آہیں بھرتی، سانسیں لینی، ہانپتی کانپتی رک گئیں۔ قلی سب باہر بھاگے جیسے بھوکا شیر دور سے شکار کی بو سونگھ کر لپکتا ہے۔ باہر نکلتے وقت منو اس سائبان میں گیا جہاں کتائی ہو رہی تھی۔ سائبان عورتوں اور بچوں سے اَٹم اَٹ تھا، کچھ بچے اپنی ماؤں کی پیٹھوں سے بندھے تھے، کچھ گودوں میں تھے اور کچھ اِدھر اُدھر مٹی میں لوٹ رہے تھے۔ رونے، چلانے، پکارنے کا شور اتنا تھا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ بچے اِدھر اُدھر لوٹ رہے تھے اور خطرناک حد تک مشینوں کے منہ میں گھسے جا رہے تھے جو اِدھر اُدھر روئی پھینک رہی تھیں۔ منو کو تعجب ہوا کہ ایسی حالت میں سب بچوں کے ہاتھ رگڑ کھانے سے کیسے بچ گئے اور سب کے سر کس طرح سلامت رہ گئے کیونکہ وہاں ان کو مشینوں سے محفوظ رکھنے کو تھا ہی کون؟ منو جب لکشمی سے ملا تو وہ رو رہی تھی۔ منو رو تو نہیں سکا مگر ساتھ ساتھ گھر جاتے ہوئے اُسے سارے راستے بڑا عجیب سا احساس رہا۔ منو نے نادر خان کے سر پہ جو بڑا گھڑیال لگا تھا۔ اس کی طرف نگاہیں اٹھائیں انہیں ہال میں داخل ہوئے گیارہ گھنٹے گذر چکے تھے۔ سورج تقریباً چھپ چکا تھا اور چھٹ پٹے کا اندھیرا میلے کپڑوں کی طرح چاروں طرف پھیلا تھا۔ آسمان پر بادل چھا گئے تھے اور میبئی کی نم فضا میں گھٹن تھی۔

سنیچر کی شام کو قلیوں کو بھی آدھے دن کی چھٹی تھی۔ ہری کو اپنے بچے کو پٹی بندھوانے ہسپتال لے جانا تھا۔ لکشمی بھی دوکانیں وغیرہ دیکھنا چاہتی تھی اور منو بھی تہذیب و تمدن کے عجائبات دیکھنے کا مشتاق تھا۔ لہٰذا سنیچر کی شام کو یہ سب لوگ گھومنے کے لئے نکلے۔

یہ چھوٹا سا قافلہ گھر سے نکل کر مزدوروں کی ایک بھیڑ میں مل گیا۔ جن میں سے کچھ تاڑی پینے جا رہے تھے اور کچھ گرانٹ روڈ کے نظارے کرنے جا رہے تھے۔ جب یہ لوگ نکلے تو تیلی سڑک پر بڑی گرمی تھی، آسمان پر ایک طرف سرخی چھائی تھی اور دوسری طرف دیکھا اور پھر گرمی سے گھبرا کر ایک زور کی سانس لی اور شکر ادا کیا کہ اس گرمی میں قمیص کی مصیبت سے نجات ملی ہوئی ہے۔ ہسپتال کے موڑ پر ٹھنڈی ہوا کا ایک تیز جھونکا اس کے منہ پر لگا اور وہ حیران رہ گیا کہ اس جمود کے عالم میں یہ خنجر ساکس نے مارا۔ ہسپتال میں لڑکے کی پٹی بدلی جانے سے پہلے ان لوگوں کو باہری مریضوں کے کمرے میں ٹھہرنا پڑا۔ ہری کی تو صبر کرنے کی عادت پڑ گئی تھی، لکشمی نے منہ ڈھانک رکھا تھا۔ لڑکی بڑے اشتیاق سے ادھر ادھر تک رہی تھی اور لڑکا اپنے باپ کی گود سے بیٹھا بیٹھا ساری دنیا کا نظارہ کر رہا تھا۔ صرف منو ہی تھا جسے اس انتظار کا بھاری پن محسوس ہو رہا تھا۔ کمرے میں مختلف دواؤں کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ اور گلابی گلابی رنگ کی مکھیاں بجلی کی طرح چلتی اور بلبلوں کی طرح چمکتی پھر رہی تھیں۔

منو بچوں کے آخر میں ایک جگہ بیٹھ گیا اور ہری اور اس کی بیوی وغیرہ نیچے سیمنٹ کے فرش ہی پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بنچ کے دوسرے سرے پر بیٹھ گیا۔ کیونکہ اس پر بجلی کا پنکھا چل رہا تھا اور منو

نے سوچا کہ وہاں ہوا ایسی باسی اور گھٹی ہوئی نہ ہوگی۔ ایک بیمار بیوپاری لعل کے کپڑے پہنے وہاں پاس ہی بیٹھا تھا۔ منو کو آتے دیکھ کر کھسکا اور اور مریضوں پر اپنے وزن کا دباؤ ڈالنے لگا۔ ایک نرس جو دھیرے دھیرے رجسٹروں میں مریضوں کا نام لکھ رہی تھی وہاں آ پہونچی جہاں منو بیٹھا تھا اور منہ سکوڑ کر چہرے پر لکیریں لا کر بولی "جاؤ"

منو جھینپتا ہوا گھبرا کر واپس ہوا۔ اُسے ہری اور دوسرے قلیوں کے سامنے شرمندگی ہو رہی تھی حالانکہ ان لوگوں نے دیکھا بھی نہ تھا۔ اور وہ وارڈ سے باہر نکل آیا۔

ہسپتال میں داخل ہوتے وقت اس نے گڑگڑاہٹ کی آواز سنی تھی جو غالباً بحر عرب کی تھی۔ آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ سمندر دور نہیں ہے وہ باہر گلی میں نکل آیا اور تھوڑی دور پر اس نے دیکھا، سمندر کی بے چین لہریں اٹھ رہی ہیں اور ان کا جھاگ سفید غضب ناک گھوڑوں کی طرح آگے بڑھتا آ رہا ہے۔ جس تیزی کے ساتھ کنارے پر آ کر ان لہروں کے گھٹنے ٹوٹ جاتے تھے اور وہ واپس ہو جاتی تھیں، اسے دیکھ کر منو دنگ اور ساکت کھڑا رہ گیا۔

پھر یکایک دور کہیں سے آسمان کے کلیجے سے بجلی کے کڑکنے کی آواز آئی اور روشنی کی لہر نمودار ہو کر پھر چھپ گئی۔ تمام زمین ہل گئی عناصر میں تھرتھری پیدا ہو گئی۔ منو کو ایک دم سردی سی لگی اور وہ ہسپتال کی محفوظ فضا کی طرف بھاگا۔ وہاں پہنچتے ہی ہری کی بچی نے اس کو دیکھ کر بڑی خوشی سے چیخ ماری اور ایک پتنگ کی طرف اشارہ کیا، جو اوپر آسمان میں اڑ رہی تھی اور تیز ہوا کا مقابلہ کیے جا رہی تھی۔ لیکن منو کو بادلوں سے ڈھکے ہوئے سیاہ آسمان سے ڈر لگ رہا تھا، جس سے بار بار بجلی کا کوندا لپکتا تھا اور بادلوں کی ایسی گرج

سنائی دیتی تھی کہ کان پھٹے جاتے تھے۔ وہ بچی کو بھی اندر لے گیا۔ لکشمی اور ہری بچے کو گود میں لئے باہر نکل ہی رہے تھے۔ ابھی وہ گلی میں نکلے ہی تھے۔ جہاں سڑک کے لیمپ تیزی سے جل رہے تھے اور ایک حلوائی کے کڑھاؤ سے بھاپ اٹھ رہی تھی، کہ آسمان پر بڑے زوروں کی گڑگڑاہٹ ہونے لگی جیسے بہت سے شیر مست ہاتھیوں سے لڑ رہے ہوں۔ اور پھر ایسا لگا کہ بہت سے غضبناک گھوڑے ایک ساتھ ہنہناتے ہوئے حملہ کر رہے ہیں، ان کے نعلوں سے چنگاریاں نکل نکل کر آسمان پر پھیل رہی ہیں، ان کے سوار اپنے شکاروں کے جسموں میں بھالے کی نوک مار رہے ہیں اور تازے تازے خون کی بوندیں ان جانوروں کے زخمی جسموں سے ٹپک رہی ہیں۔

پانی آیا اور خوب آیا، تیز، ترچھا، موٹی موٹی بوندوں والا لامتناہی پانی۔ اور خشک زمین پر اس طرح چھا گیا کہ انسان اور حیوان اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکتے تھے۔

دو گھنٹے بعد جب سڑک پر حبابوں کی کچھ کمی نظر آئی تو ہری اپنے قافلے کو لے کر بوندا باندی ہی میں بستی کی طرف چلا۔ سڑکیں بالکل ننھے ننھے دریا نظر آ رہی تھیں، شہر سے باہر والا میدان جھیل بن چکا تھا اور پاس والا تالاب پورا بھر کر پھوس کے جھونپڑوں کو بہا لے گیا تھا۔

یہ لوگ سب کے سب بھیگ کر چوہا ہو گئے تھے اور اسی بھیگی حالت میں، بارش کی خوفناک آواز، بادل کی اندوہناک گرج سر پر چمکتی ہوئی بجلی اور پاؤں تلے کی بھیگی اینجان زمین پر سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھنے کے لئے اور ناریل کے درختوں کے ایک جھنڈ میں پناہ لینے کھڑے ہو گئے۔ یہ جھنڈ

تالاب کے کنارے ایک ٹیلے پر بنے ہوئے مندر کے پاس ہی تھا۔ سینکڑوں اور مزدور جن کے گھر بارش سے تباہ ہو گئے تھے، آس پاس دبکے ہوئے تھے

"رام۔ رام" ہری نے لمبی سانس کھینچ کر کہا۔

منو پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا، لکشمی کانپ رہی تھی اور بچے ٹھٹھٹھا رہے تھے۔

"او منو! ابے او منوڑے" منو کے کان میں ایک بھاری آواز آئی۔ وہ ہری کی لڑکی کو پیٹھ پر لادے اس کے بوجھ سے بالکل دبا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اپنے گاؤں میں جب بڑھیا آتی تھی تو کیسا مزا رہتا تھا۔ چچی پکوان پکاتی تھی، مال پوے تلتی تھی اور اس طرح برسات منائی جاتی تھی۔

"منو۔ او منوڑے" بھاری اور جانی پہچانی آواز پھر آئی۔

"کون ہے" منو نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔

"ابے بہن ... " اب کی آواز ذرا پاس سے آئی "اگر تم لوگوں کا بھی جھونپڑا بہہ گیا ہو تو میرے ساتھ آؤ میں تمہاری مدد کروں گا"

منو نے پہچان لیا۔ یہ رتن تھا۔ وہی پہلوان جو فیکٹری میں اس کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ اور منو رک گیا۔

"ارے ٹھہر ذرا" پھر آواز آئی۔ اور رتن پھسلتا، لڑھکتا سامنے آ کھڑا ہو گیا۔ ہری اپنے لڑکے کے بوجھ سے دوہرا ہوتا جا رہا تھا۔ لکشمی بھیگی ہوئی بھی خوبصورت لگ رہی تھی اور اپنے کپڑوں کو جو اس کے سڈول جسم اور چھاتیوں سے چپک گئے تھے سنبھال رہی تھی۔ وہ دونوں ایسے پریشان تھے کہ ٹھہرنا ان کے لئے ناممکن تھا۔

"ہری بھائی۔ ٹھہرو تو ذرا" منو نے مڑ کر کہا "رتن ہے۔ اپنا رتن" لیکن پھر منو نے رتن کو جو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک نظر آ رہی تھی، ہونٹ بے تحاشہ مسکراہٹ سے چوڑے تھے اور موٹے موٹے لبوں سے شراب کی ہلکی سی بو آ رہی تھی۔ اور منو کو ڈر لگنے لگا کہ وہ کہیں مذاق تو نہیں کر رہا۔ فیکٹری میں بھی وہ سب کو بے وقوف بنا کر ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اس کا ڈر اور بھی بڑھ گیا۔ جب ہری اور لکشمی نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور رتن ان دونوں کے پھسلنے اور چھپچھپا نے پر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"آؤ ہماری چالی میں چلو" پہلوان نے منو کے کندھے پر ایک دھپ دیا "چلو۔ چلو۔ آؤ بھی" ۔ وہ گرجا "آؤ بھی بیٹی ... ... کمبختو! جاؤ گے کہاں۔ کہیں ٹھکانہ بھی ہے؟"

"پر میں تو ہری اور اس کے بال بچوں کے ساتھ ہوں"

"آؤ۔ آؤ۔ تم سب آجاؤ" رتن شراب کے نشہ میں فیاضی دکھانے لگا "چلو کمبخت فقیرو! دنیا میں کمائی کرنا بڑا کٹھن ہے اور کما کر بھی کہاں جا سکتے ہو۔ بس تاڑی کی دکان ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ چلو۔ سورو۔ میں تمہاری خبر گیری کروں گا۔ اپنے رتن پر بھروسہ کرو۔ رستم ہند پر بھروسہ کرو۔ دنیا کے سب سے تگڑے پہلوان کو یاد رکھا کرو۔ ارے یہ بیٹی ... بارش۔ یہ بارش، بھگوان موت رہا ہے" یہ کہہ کر اس نے اپنا سینہ ٹھونکا اور ایک گالی بکتا ہوا گر پڑا۔

"ارے بارش وارش کچھ نہیں۔ بھگوان موت رہا ہے۔ سمجھے" اس نے اپنے مضبوط جسم کو دو تین مرتبہ تولا اور ہچکیوں کے لئے معذرت کرتا تن کر کھڑا ہو گیا "معاف کرنا۔ معاف کرنا۔ اپنے رتن کو معاف کرنا، ذرا

شراب پی لی ہے۔ اس نے اور کوئی بات نہیں۔ مگر ڈرو نہیں۔ رتن تمہیں اچھی جگہ لے جائے گا۔" اور وہ پھسلتا، لڑھکتا، سنبھلتا آگے آگے چلنے لگا۔ منو نے ہری کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ پریشان کھڑا تھا کہ کیا کرے جائے یا نہ جائے۔

"آؤ۔ آؤ۔ سب کے سب آجاؤ"، رتن نے نسبتاً معمولی آواز میں کہا۔ "رستم ہند مصیبت کے وقت ضرور تمھاری مدد کرے گا"۔ منو نے بڑھ کر ہری کو کھینچا اور سب کے سب پہلوان کے پیچھے چل پڑے۔

"آؤ۔ آؤ کمبختو"، رتن کہتا جا رہا تھا۔ "آؤ۔ آؤ"

پورا قافلہ پھسلتا، راستہ ٹٹولتا، کھائیاں پھاندتا اندھیرے میں چلنے لگا۔ کبھی کبھی بجلی کی روشنی ایک دم ہو کر غائب ہو جاتی تھی اور کبھی بادل بڑے زور سے گرج اٹھتے تھے۔ باری باری سے سب گرتے تھے اور ایک مرتبہ تو تینوں نے ایک ساتھ ٹھوکر کھائی۔ لیکن ایک دوسرے کی مدد کرتے سردی میں سسیاتے چلے جا رہے تھے۔ سوائے رتن کے جو کافی گرمجوشی کے ساتھ انھیں برابر لئے جا رہا تھا۔ آخرکار وہ اپنے جھونپڑے سے دو تین گلی ہٹ کر ایک چال میں پہنچ گئے۔

"آؤ۔ آؤ۔ کمبختو"، پہلوان نے پھر ایک تازہ بتازہ دھپا منو کی پیٹھ پر جمایا جس سے منو کا دل کسی قدر ضرور بڑھ گیا لیکن جسم ویسا ہی ٹھٹھرتا رہا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ آج میرا بیٹا بچارا مرا ہی جائے گا"۔ ہری بالکل رو نکھا ہو رہا تھا۔ "پر منو اور رتن خدا تمھارا بھلا کرے تم نے اس کی جان بچائی۔ ورنہ مرتے وقت میرے منہ میں آگ دینے کو بھی کوئی نہ ہوتا"

"آؤ۔ آؤ۔ اوپر آجاؤ"، رتن سیڑھیاں چڑھتا ہوا بولا۔ "اگر تمھاری

ہی مدد نہ کی تو پھر پہلوان کیسا۔ اگر بڑا جسم ہے تو بڑا دل بھی ہونا چاہئے ورنہ رستم ہند کون کہے گا "

منو کے دل میں رتن کی عزت بے حد بڑھ گئی۔ اب اُسے ایک نیا ہیرو مل گیا تھا۔ اب وہ رتن کی طرح بننا چاہتا تھا۔

جس چال میں رتن، منو اور ھری کو لے گیا۔ وہ ایک تین منزلہ عمارت تھی جو بغیر کسی قاعدہ کے بنائی گئی تھی۔ چاروں طرف، ایک ایک دو دو گز کے فاصلے سے اور بھی بہت سی چالیں تھیں۔ تیسری منزل پر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ایسا کہ سینکڑوں اور ویسے ہی کمروں میں پہچانا بھی نہ جاتا تھا اور لوہے کے زینے سے وہاں تک پہنچتے تھے۔ یہ کمرہ کوئی پندرہ فٹ لمبا اور کوئی دس فٹ چوڑا تھا۔ رتن ان لوگوں کو لئے گھس گیا۔ اندر سے لکڑی جلنے کا دھواں اٹھ رہا تھا اور اس دھوئیں میں منو نے دیکھا کہ ایک ہڈی کا ڈھانچہ آدمی ہے جو لنگڑا کر چلتا ہے، ایک زرد رو دبلی پتلی سی عورت اکڑوں بیٹھی ہے اور ایک چھوٹی سی بچی بھی ہے۔ سب نے ایک کھنچی ہوئی سی خاموشی کے ساتھ ان لوگوں کا استقبال کیا۔ لیکن منو کو عجیب نہیں لگا، کیونکہ وہ اس وقت تک مل کے لوگوں کی عادت سے واقف ہو چکا تھا کہ چاہے ایک دوسرے سے گز بھر دور بیٹھے کام کرتے ہوں مگر جان پہچان بڑھانے کی کوئی خاص کوشش کبھی نہ کریں گے۔ کمرے کے اتری حصے پر ایک کھڑکی تھی اور اس کے نیچے ایک ٹین کے ڈھکنے کے چراغ کی زرد لو کانپ کانپ کر پھیلے ہوئے اندھیرے کا مقابلہ کر رہی تھی جو سیاہ بادلوں کی وجہ سے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ لَو کی کانپتی روشنی سے دیوار پر بڑے بڑے سائے بن گئے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں دو اینٹیں رکھ کر چولھا بنایا گیا تھا اور دروازہ کی دو اینٹوں میں سے

کبھی کبھی ہوا کا فراٹا اندر آکر آگ کو مشتعل کر دیتا تھا۔

"ارے ہے شبو" رتن دروازہ میں کھڑا ہو گیا "تم نے کہا تھا نہ کہ اس کمرہ کا آدھا حصہ کرایہ پر دینا چاہتے ہو۔ تو میں کچھ لوگوں کو لایا ہوں۔ ان کے ساتھ ہماری طرف کا ایک لڑکا بھی ہے۔ صاحب کی گلی میں پھوس کے جھونپڑے میں رہتے تھے وہ پانی سے بہہ گیا"

"اچھا" شبو نے ناریل پیتے ہوئے کہا "آؤ۔ آؤ۔ ہماری سر آنکھوں پر آؤ" ہری کو اندر آتے دیکھ کر اس نے کہا "تم ملک میں کہاں رہتے تھے منو؟"

"ہم کانگڑا کے ہیں بھائی" منو نے ہری کی بچی کو نیچے فرش پر اتارتے ہوئے کہا۔

"اچھا کانگڑا کے ہو! کانگڑا کے۔ میں بھی کانگڑا جا چکا ہوں" شبو نے غرغرائی آواز میں کہا "اس وقت تو میں بچہ تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب پہاڑوں میں کالی مائی اپنا درشن دیا کرتی تھی"

"یہ لو پوری" شبو کی بیوی نے قصہ مختصر کر دیا۔

"تو پھر کیا ہوا بابو" شبو کی لاڈلی بیٹی بولی۔

"ارے سو بھی جا چڑیل" شبو چاہتا تھا کہ نو واردوں کی خاطر سے پہلے معاملے کی بات چیت ہو جائے اور اس نے جھک کر رتن کے کان میں کچھ کہا۔ منو فرش پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ "اس کمرے میں ہمیشہ تو گھٹن رہتی ہو گی۔ دھواں بھی ہمیشہ بھرا رہتا ہو گا کیونکہ دھواں نکلنے کی جگہ ہی کہاں ہے۔ مگر اس وقت تو یہاں بھی سردی لگ رہی ہے۔ پھر بھی یہ جگہ اس پھوس

کے جھونپڑے سے تو اچھی ہے، فرش تو پکا لگتا ہے"
"یہ گھر تمہارے پھوپس کے جھونپڑے سے تو اچھا ہے نا"
رتن نے ہری سے پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں" منو ہری سے پہلے بول اٹھا "کاش ہم لوگ شروع سے یہاں آئے ہوتے تو ہماری سب چیزیں اس جھونپڑے کے ساتھ برباد نہ ہوتیں" اُسے خوشی ہو رہی تھی کہ یہاں سب ہمسائے اپنے ہی دیس کے تھے، اور ویسے بھی شنبو اُسے اچھا لگا۔

"ہاں بھائی" ہری نے جواب دیا "مگر اب چیٹا صاحب ناراض ہوں گے۔ ان سے پورے مہینے کے لئے جھونپڑا لیا تھا"

"وہاں تم کیا کرایہ دیتے تھے" رتن نے حیرت انگیز سنجیدگی سے پوچھا۔

"تین روپے" ہری نے کہا۔

"تو یہاں تو صرف دو ہی روپے زیادہ ہوں گے" رتن نے کہا

"ہمارے اوپر دس روپے تو فرین صاحب کے قرض ہیں"

ہری نے ٹھنڈی سانس لی "اور اب برتن بھانڈے اور اناج وغیرہ کے لئے اور قرض لینا پڑے گا۔ کل جا کر جھونپڑے میں دیکھوں گا۔ شاید کچھ بچ گیا ہو ایسا لگتا ہے ہماری تقدیر ہی بگڑ گئی ہے"

"دھیرج رکھو۔ میں جو تمہارا دوست ہوں۔ میں مرد تمہارا دوست ہوں" رتن نے سینہ ٹھونک کر کہا اور ایک دم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"منو کی وجہ سے آپ نے ہم پر بڑی مہربانی کی۔ کل منو نے میرے

بچے کی جان بچائی اور آج اس کی وجہ سے آپ نے ہم سب کی جان
بچائی۔ میں آپ کا احسان مند ہوں۔ آپ کا سب دینا ادا کر دونگا"
"اچھا چلو، اب یہ باتیں چھوڑو" شبو کرائے کی طرف سے
مطمئن ہونے کے بعد مجسم فیاضی بن گیا تھا "میری بیوی پوریاں پکا رہی ہے،
وہ تو چکھو۔ تم لوگوں کے لئے چاول اُبلنے کو رکھ دیئے ہیں۔ تھکے
رات کو سو رہو تھک گئے ہوں گے۔ کل پانی رک جائے گا
تو چل کے تمھارا سامان نکالنے کی کوشش کریں گے"
"آپ کی بڑی مہربانی لیکن آپ کھانا کیوں پکوا رہے ہیں۔ آخر
آپ کے بھی تو بال بچے ہیں"
"ارے رہنے بھی دو بھائی۔ مانا کہ ہم بمبئی میں ہیں اور غریب ہیں
پر اپنے ملک کی ریت تو ابھی نہیں بھولے۔ یہ لو بوری۔ لاؤ بچھا
دوں تمھارے لئے۔ اگر سب ایک جگہ بیٹھ جاؤ تو ایک کمبل بھی
اوڑھنے کو دے سکتا ہوں"
"ہم نے آپ کو بے کار اتنی تکلیف دی" ہری نے معذرت کی
"نہیں نہیں۔ تکلیف کی اس میں کیا بات ہے" شبو کہنے لگا۔
"اگر مہمان کی خاطر نہ کی تو بھوا اپنی ماں کا جنا نہیں۔ میری عمر چالیس برس ہونے
کو آگئی اور اگر کسی کے ساتھ بھلائی نہ کی تو مرے بعد لوگ کیا یاد
کریں گے"
منوا اپنے دل میں پھولا نہ سماتا تھا۔ آخر وہی تو اس تمام رفاقت اور
دوستی کا ذمہ دار تھا۔ لیکن اس کی یہ ساری خوشی ہوا ہو گئی۔
جب رات بھر سونے کے بعد وہ صبح اٹھا تو اس کی ناک میں ایک

سخت قسم کی سڑاند آئی۔

"یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے؟"۔ اس نے رتن سے پوچھا جو ٹھ بیٹھا تھا اور حقہ پی رہا تھا۔

"کیا معلوم۔ نیچے گلی میں سے آئی ہوگی"۔ رتن نے بے پروائی سے جواب دیا۔ منو اپنی ناک سکوڑے، منہ بنائے کھڑکی کے پاس گیا، اور پنجوں کے بل کھڑا ہو کر گلی میں جھانکا۔ نیچے ایک پائپ تھا جس سے گندہ پانی بہا کرتا تھا۔ وہ پائپ بند ہو کر اُبلنے لگا تھا اور گلی میں تمام گندگی پھیلی تھی۔

"ادھے رتن"، منو نے کہا "گلی میں تو گندگی کا دریا بہہ رہا ہے"

"ہاں"، پہلوان نے اسی بے پروائی سے کہا "نیچے سات پاخانے ہیں اور دو سو آدمی ان میں جاتے ہیں۔ اور سب کو صاف کرنے کے لئے ایک ہی مہتر ہے۔ اگر تم پاخانے جانا چاہو تو مہتر کو ایک آنہ دے دینا وہ تمہیں خاص پاخانہ استعمال کرنے دے گا ...

... آؤ ... چلو ... میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ میں تمہیں دکھا دوں گا"

منو اپنے دوست کے ساتھ بالکونی سے ہوتا ہوا سیڑھی سے اُترا۔ چاروں طرف کوڑے، دھوئے ہوئے کپڑوں، چیتھڑوں، بکسوں، ٹوٹی ٹوکریوں اور بچوں کے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کا انبار لگا تھا۔ باہر گلی میں دیواروں کے درمیان ایک دبلا سا نیم برہنہ مہتر ٹوکا بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ اور سڑاند اس غضب کی پھوٹ رہی تھی کہ منو کو اپنی دھوتی سے ناک بند کرنی پڑی۔

"مہتر ہماری سنڈاس صاف ہے؟"، رتن نے اکڑ کر پوچھا۔

"ہاں پہلوان جی"، مہتر نے جواب دیا اور اور اندر کو دبک گیا۔

منو کو اس کی خوشی تو ضرور ہوئی کہ ملی جلی سنڈاس میں نہیں جانا پڑا۔ حالانکہ وہ کھیت بھی جہاں وہ جاتا تھا کچھ کم گھنے نہ تھے لیکن چاروں طرف گڑوں میں اس غضب کی بدبو تھی کہ وہ اندر گھسنے کے دو ایک منٹ بعد ہی نکل آیا۔

"کیوں ٹھیک ہے؟" پہلوان نے پوچھا

"ہوں" منو نے جواب دیا اور دھوتی کے کونے نتھنوں میں ٹھونس لئے۔

"وہ رہا نل۔ منہ ہاتھ دھولو۔ مگر یہاں ایک ہی نل ہے۔ تمہیں اپنی باری کے لئے ٹھہرنا ہوگا۔" نل پر بہت سی عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ اور چاروں طرف گزوں دور تک کیچڑ پھیلی تھی اور منو کی ہمت نہ ہوئی کہ آگے بڑھے۔ وہ سیڑھی پر چڑھنے ہی لگا تھا کہ اوپر سے ہری اُتر تا ملا، جو اپنے بہے ہوئے جھونپڑے میں سے چیزیں ڈھونڈنے جا رہا تھا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ آتا ہوں" منو نے کہا۔ "وہاں تالاب میں نہا بھی لوں گا"

اگلے دن جمی ٹامس صاحب فیکٹری کے سائبان میں کھڑے مونچھوں پر تاؤ دے رہے تھے۔ انکا چہرہ پکے گوشت کی طرح گلابی تھا جو کہیں کہیں سے وہسکی کی مہربانی سے سرخ ہو گیا تھا اور نیلی نیلی رگیں سکڑی ہوئی تھیں۔ منو نے چمٹا صاحب کو ایک نظر دیکھا اور پھر وہ اور رتن قلیوں کی بھیڑ کے پاس سے گذرتے اندر چلے۔ منو نے کوئی سو گز دور ہی سے اپنے آپ کو "سلام حضور" کہنے کے لئے تیار کرنا شروع کر دیا تھا کیونکہ نہ معلوم کیوں اُسے

ایسا کرنے میں کافی کوشش کرنی پڑتی تھی۔ ابھی وہ لوہے کے جنگلے والے دروازے کے پاس ہی پہنچا تھا کہ کیا دیکھتا ہے کہ چٹا صاحب چند قلیوں کو لاتیں مار رہے ہیں۔ اِدھر اُدھر دوڑ دوڑ کر کچھ قلیوں کو لکڑی سے بھی مار رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، گالیاں دے رہے ہیں اور آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہیں۔

منو نے ہری کو بھی اُن قلیوں میں دیکھا تو اس کے دل کی دھڑکن رکنے سی لگی۔ سب کے سب قلی ہاتھ جوڑے، سر جھکائے، دوہرے ہو ہو کر ہانپتے، کانپتے، لڑھکتے، ٹھوکریں کھاتے، انتہائی حقیر حالت میں معافی مانگ رہے تھے۔

"سؤر کا بچہ! حرام زادہ! ان جھونپڑوں سے نکلنے سے پہلے ہم کو بولا کیوں نہیں"، صاحب غرائے جا رہے تھے۔

"حضور۔ حضور۔ ارے حضور"، قلیوں کی طرف سے بس یہی سنائی دیتا تھا اور وہ خوفزدہ بچوں کی طرح پیچھے گرے پڑتے تھے۔

"حضور اس کی چھت بالکل ٹوٹ گئی تھی اور تمام سڑک پر پانی ہی پانی تھا"، مصری کہہ رہا تھا۔

"جھوٹ بولتا ہے سؤر۔ ہم خود کل وہاں گیا تھا۔ پانی نہیں تھا"،

"حضور کل وہاں پانی تھا۔ بڑی مشکلوں سے تو میں نے پانی اوپچ کر اپنے کچھ برتن نکالے"،

"شاباش۔ شاباش"، منو نے منہ ہی منہ میں کہا اور نا جانے سالگا اسے بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ ہری جواب دیئے جا رہا تھا کیونکہ وہ تو ہری کو اس قابل سمجھتا ہی نہ تھا۔

"تو ہم جھوٹ بولتا۔ کیوں سؤر" نورمین صاحب نے غصے میں بھر کر ہری کے ٹخنوں پر دو چار ٹھوکریں جڑیں۔

"یہ بات سچ ہے صاحب۔ کل وہاں پانی تھا" منو نے اپنی جگہ سے کھڑے کھڑے کہا۔ وہ ہری کی کچھ مدد تو نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اسے غصہ بہت آرہا تھا "میں بھی اپنی چیزیں لینے گیا تھا"

"تم جھوٹ بھونکتا۔ تم کیا اس کے ساتھ تھا؟" اور وہ دھمکی کے انداز میں منو کی طرف بڑھے۔ ہری کی بیوی نے ڈر کے مارے ایک چیخ ماری۔ وہ اپنے بچوں کو لئے اور قلیوں کی بیویوں کے ساتھ دروازے کے باہر کھڑی تھی۔

"یہ سچ بات ہے" منو نے پھر کہا۔

نورمین نے منو کو مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ رتن ایک دم تن کر ان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا "چھوڑ دو صاحب ان کا پیچھا" وہ بالکل تیار کھڑا تھا۔ جیسے اتنی دیر اپنی طاقت اکٹھی کر رہا تھا "سنیچر کی رات کو میں نے انھیں پانی میں بھیگتے پایا تھا اور ساری مل کا احاطہ ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جھونپڑے کی چھت ٹوٹ گئی تھی۔ مجھے جھوٹا نہ کہنا نہیں ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ جنم بھر یاد رکھو گے" ـــــ اور وہ اپنے پورے قد کو تان کر اور مضبوط جسم کو تول کر کھڑا ہو گیا، دانت پیسے اور ٹھوڑی آگے کو بڑھا دی۔

نورمین نے پہلوان کا یہ تنومند جسم اور قد دیکھا اور الگ کھسک جانے ہی میں خیریت سمجھی۔

"جاؤ ـ جاؤ۔ اپنا کام دیکھو۔ جاؤ نہیں ٹھوکر مارے گا ہم۔ یو فول" صاحب نے کہا "ہم نے جھونپڑا ان لوگوں کو کرائے پر دیا تھا تمھیں نہیں دیا تھا۔ تم سے کیا مطلب"

"بے مطلب" رتن گرجا "تم اپنے بنگلے کو جاؤ نہیں سر توڑ دونگا"

"رتن۔ رتن" سب قلی چلانے لگے "صاحب ... "

"صاحب ہو یا صاحب کا باپ!" رتن نے کہا "فورمین ہو تو تمھیں کیا حق ہے کہ بل کے نوکروں کو پیٹو"

"میں پورے مہینے کا کرایہ لوں گا" صاحب نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "چلو سب کوئی اپنے کام پہ جاؤ۔ مارچ! اٹنشن!"

"ہاں ہاں لے لینا۔ پر ان میں سے کسی کو ذرا ہاتھ لگا کر دیکھنا۔ میں تمھیں کیسا چھٹی کا دودھ یاد دلاتا ہوں"

"اچھا۔ اچھا۔ پہلوان صاحب" پٹھان دربان نادر خاں آگیا اور بیچ بچاؤ کر کے پہلوان کو علیحدہ کھینچا اور قلیوں کو الگ الگ کر دیا۔

رتن بنائی والے حصے کی طرف چلدیا اور قلی سب اپنے اپنے کاموں پر چلے گئے۔ سب کے سب گھبرائے ہوئے اور خوفزدہ تھے۔ منو رتن کو فاتحانہ اشارے کرتا اپنے کام کی طرف بڑھا۔ سب قلی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔

"تم دیکھنا صاحب بدلہ لے گا ضرور" ایک نوجوان قلی نے رتن کے پاس آکر کہا۔

"اجی ایسے بہت دیکھے" رتن نے بڑی شاندار بے پروائی سے جواب دیا "آخر ہم پہلوان کس لئے ہیں، ڈرو مت، مجھ پر بھروسہ رکھو"

"رتن بھائی۔ یہ تو بہت بڑی بات ہوئی" منو نے کام پہ جاتے ہوئے کہا۔

"ارے تم فکر نہ کرو" رتن نے اسی بے پروائی سے جواب دیا۔

"میں نے ایسے بہت دیکھے ہیں۔ جمشید پور میں میں ٹاٹا اسٹیل میں کام کرتا تھا۔ وہاں پچاس ہزار مزدور تھے۔ ہم سب نے ہڑتال کر دی کیونکہ انھوں نے ہماری تنخواہیں جو کاٹ لی تھیں۔ اور کمپنی سے مزدوروں کی مانگیں کس نے منوائیں؟ میں نے" اور اس نے بڑی شان سے اپنا سینہ ٹھونکا۔

"تو پھر آپ جمشید پور سے آگیوں گئے" منو نے ٹوٹا ہوا تاگہ جوڑتے ہوئے کہا۔

"وہ بات یوں ہوئی کہ ہم نے اس لئے ہڑتال کی تھی کہ کام کے گھنٹے گھٹائے جائیں، مکانات ٹھیک کئے جائیں اور ویسے عام حالت بھی سدھاری جائے۔ تو کمپنی نے ہمارے لیڈروں کو پھسلا کر خرید لیا۔ ان کی ترقی کر دی اور دھمکیاں بھی دیں تو وہ ڈر گئے۔ میں نے ان میں سے ایک سردار کو پکڑ کر اس کی مرمت کر دی۔ پھر میں وہاں سے چلا آیا۔ ہڑتال بھی فیل ہو گئی۔ کیونکہ ایک ہڑتال جیتنے کے بعد فوراً ہی دوسری ہڑتال کبھی نہیں شروع کرنی چاہیے۔ ویسے مجھے کام بھی وہاں کا پسند نہ تھا۔ بہت مشکل کام تھا اور گرمی بڑی ہوتی تھی"

"لوہے کی فیکٹری میں تو میں بھی جانا چاہتا ہوں"۔ منو نے اشتیاق سے کہا۔ "وہاں کیا پٹریاں بنائی جاتی ہیں؟ جیسی ریل کی ہوتی ہیں؟ یہاں تاگہ جوڑنے سے تو وہاں بھٹیوں کے آگے زیادہ مزہ آتا ہوگا؟"

"میں وہاں گیا تھا تو اٹھارہ برس کا تھا" رتن نے ایک دم سنجیدگی اختیار کر لی۔ "ویسے میں دولت پور میں بھی بھٹیوں کے آگے کام کر چکا ہوں کیونکہ میں ذات کا لوہار ہوں۔ لیکن دولت پور کی بھٹیوں کی آنچ جمشید پور

کے مقابلے میں ٹھنڈی ہوا کے برابر تھی۔ ایسی سخت آنچ برابر لگتی رہتی تھی اور اس سے بچت ذرا دیر کو بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ پورے ایک ایکڑ زمین پر آگ ہی آگ ہوا کرتی تھی۔ بعض میں سے دھواں بھی نکلتا تھا بعض میں سے نہیں لیکن آنچ سب سے برابر نکلتی رہتی تھی۔ سردی، گرمی، رات، دن برابر یہی حال رہتا تھا۔ جب کبھی گرم لوہے کو پانی چھو جاتا تھا تو شائیں شائیں کی ایسی آواز نکلتی تھی کہ بس ہی بس اور بھاپ اٹھنے لگتی تھی۔

"تمہیں وہاں کام ملا کیسے؟" منو نے جمشید پور جانے کے خواب دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے نوکری کی تلاش تھی۔ گیٹ پر گیا تو وہاں جواب ملا کہ فورمین کے پاس جاؤ۔ اصل میں اس زمانہ میں کوئی لڑائی وڑائی چل رہی تھی میل میں کام بہت تھا اور مزدور ڈھونڈے نہ ملتے تھے۔ بہت سے قلی بھرتی ہو کر چلے گئے تھے۔ کیونکہ وہ شاندار موت مرنا چاہتے تھے۔"

"تو فیکٹری میں کام کیسا تھا؟ آسان تھا؟"

"کیا کہہ رہے ہو تم نے؟ آسان؟" رتن نے طنزاً کہا۔ "صبح چھ بجے سے شام کے چھ بجے تک، ہفتے میں سات دن۔ اور ان تمام دنوں میں ایسی سلگتی اور آنچ نکلتی بھٹیوں کے آگے کام کرنا پڑتا تھا جن پر لوہا پانی کی طرح پگھلتا اور ابلتا رہتا تھا۔ ٹھیک میرے سر کے اوپر ایک آدمی زنجیر میں لٹکی ہوئی لوہے کی دہکتی پٹریاں کانٹے سے الگ الگ کرتا رہتا تھا۔ گرم لوہے کی آنچ کے آگے وہ اپنے چہرے کو ایک ہاتھ سے چھپا لیا کرتا تھا اور ہر دفعہ چلاتا تھا "سنبھالو

بچو گرم لوہا ہے،، اور وہ لوہا بھی کس غضب کا گرم ہوتا تھا۔ بارہ انچی مشینوں سے نکلا ہوا تپا ہوا سرخ لوہا، جیسے شام کے وقت ڈوبتے سورج کی سرخی، اور پھر اسے اور گرم کر کے سیاہ کرتے تھے، تب یہ اور بھی خطرناک ہوتا تھا کیونکہ دھوکہ سے اگر کہیں ہاتھ لگ گیا تو بس؛ سرخ ہوتا تھا تو معلوم بھی رہتا تھا کہ گرم ہے اور کالے ہونے کے بعد بالکل پتہ نہیں چلتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اوور ٹیم بھی کرنا پڑتا تھا بعض وقت صبح شام ملا کر چوبیس گھنٹے بھی ہو جاتے تھے اور ایک مرتبہ تو میری بدلی کا مزدور نہیں آسکا تھا تو میں نے چھتیس گھنٹے کام کیا تھا،،

"چھتیس گھنٹے! اس کے معنی ہیں کہ رات دن کام کیا۔ اور سوئے کب؟"

منو نے بھولے پن سے پوچھا

"چھتیس گھنٹے پورے تو میں نے کام نہیں کیا۔ لیکن بتیس گھنٹے ضرور کیا ہوگا۔ باقی چار گھنٹے کا کمپنی کو دھوکہ دیا اور وہ ایسے کہ بیچ بیچ میں ایک لکڑی کے تختے پر سو گئے اینٹ کا تکیہ لگا کر۔ گیس کے خزانے کے پاس ہی چوکیدار کی کوٹھری تھی جو ٹائم لگایا کرتا تھا۔ مگر وہ افیون کھاتا تھا، اور پھر اسے یہ خیال بھی نہ آیا کہ کارخانہ کے شور و غل میں بھی کوئی سو سکتا ہے۔ ویسے ان کارخانوں میں سونا خطرناک ہے۔ جاگتے رہنا ہی ٹھیک ہے۔ کیونکہ نہ معلوم کس وقت کیا چیز اوپر آن گرے۔ پھر بھی چھتیس گھنٹے جاگتے رہنا بڑا مشکل کام ہے،،

منو آنکھیں پھاڑے مرعوب انداز میں رتن کو تک رہا تھا۔ رتن نے منو کے اشتیاق کو سمجھ لیا اور کہنے لگا "تم کہیں جمشید پور جانے کا خیال بھی نہ کرنا۔ یہاں رہ کر ان کرگوں پر ہی کام کرتے رہو۔ وہاں تو ہر وقت سر پہ لاکھوں من لوہا لٹکا رہتا ہے جو مشینوں سے ادھر سے اُدھر کھسکایا جاتا ہے۔ اگر وہ لوہے کے تختے گرے ... اگر ایک بھی گر گیا ... اور کبھی

کبھی گرتا ہی تھا ... زنجیر ٹوٹ گئی یا کوئی کڑی کھل گئی ... تو بس سر پر پاؤں رکھ کے جان لے کے بھاگنا ہوتا تھا۔ بھاگنا اور چلنا پھرنا تک خطرناک تھا، کسی لوہے کے تودے سے ٹکرا کر گھٹنا ٹوٹ جانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ تم..."

"اے بک بک نہ کرو۔ کام کرو سب" فورمین کا لمبا چوڑا جسم افق پر دکھائی دیا۔

"یہ ضرور ہم لوگوں سے بدلہ لے گا" منو نے اس کے جانے کے بعد چپکے سے کہا۔

فورمین صاحب آخر بدلہ لے کر ہی رہے۔ جب مزدوروں کی مہینہ کی تنخواہ چڑھ گئی تو انھوں نے بدلہ لیا۔ سنیچر کی شام تھی۔ تپتا ہوا برسات کا سورج قلیوں کے ننگے جسموں پر اپنی آخری کرنیں برسا رہا تھا اور چمٹا صاحب کے سرخ چہرے کو اور بھی سرخ بنائے دے رہا تھا۔ وہ اپنا وہی چکنا پتلون پہنے آفس کے برآمدے کے سائے میں نادر خاں کی حفاظت میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"ہاری" جمی ٹامس نے ذرا چڑچڑا کر آواز دی۔ بات یہ تھی کہ مکھیاں اور بھنگوں کو ان کی مونچھوں پر لگی ہوئی چکنائی ذرا مزے دار معلوم ہو رہی تھی، ہری کو اس قسم کی انگریزی اور دیسی ملی جلی زبان سننے کی عادت نہ تھی۔ لہٰذا وہ کھویا ہوا سا منہ اور تن کو تکتا رہا جو اپنی باری آنے کے انتظار میں پتھروں سے گٹے کھیلنے لگے تھے۔

"ہاری" جمی ٹامس نے زور سے آواز دی اور مکھی مارنے کا لکڑی میں لگا ہوا جال زور سے میز پر پٹخا۔

کوئی جواب نہیں۔ صرف قلی گھبرا گھبرا کر ایک دوسرے کا منہ

دیکھ رہے تھے کہ کہیں سے صاحب کے مطلوب آدمی کو پیدا کریں ورنہ غصہ کہیں سب پر نہ اترے۔

"ہاری" صاحب پھر غصہ میں چیخے اور کرسی سے تقریباً اچھل پڑے،

"ہری" منو نے اپنے دوست کو کہنی ماری "جاؤ نہ۔ تمہاری پکار پڑ رہی ہے"

ہری اچھل پڑا اور اپنی سوکھی سوکھی ٹانگیں گھسیٹتا، چیتے چوڑے تلوے تھپتھپاتا آگے دوڑا۔

"جلدی چلو۔ جلدی چلو" فورمین نے ہری کو آتے دیکھ کر کہا۔ "ہم تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہے کہ دن بھر یہاں تمہارے لئے بیٹھا رہے گا۔ انگوٹھا لاؤ"

"مائی باپ" ہری نے سلام کر کے اپنے دہنے ہاتھ کا انگوٹھا روشنائی کی گدی پر رکھ دیا اور پھر اٹھا کر دیکھنے لگا کہ سیاہی بخوبی لگی کہ نہیں۔ فورمین نے اس کے کانپتے ہاتھ کو پکڑا جیسے کسی کوڑھی کو چھو لیا ہو اور کاغذ پر نشان لگوایا۔

پھر اس نے پانچ پانچ روپیہ کے دو نوٹ اور دس چاندی کے روپے ہری کے ہاتھ پر رکھے اور تیزی سے بولا "دس روپے تم نے ہم سے لیا تین جھونپڑا کا کرایہ۔ ایک عرضت کا۔ پانچ کپڑے کا اور باقی تم سب کا پگار" ہری مدتوں سے ان الفاظ اور اصطلاحات سے واقف تھا، قرضہ، سود، خراب کپڑے کے دام اسے ان الفاظ سے دشمنی اور نفرت تھی لیکن پھر بھی وہ انہیں ماننے پر مجبور تھا اس نے بیس روپے لے لئے۔ فورمین کو سلام کیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ منو کے پاس پہنچتے پہنچتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور دل بیٹھنے لگا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور مشکل اس نے تمام حال رک رک کر کہنے کی کوشش کی۔

"پر ہوا کیا" منو نے پوچھا

"کچھ نہیں بھائی" ہری کی سانس رک سی رہی تھی "پانچ روپے تو بگڑے ہوئے کپڑے کے کٹ گئے، تین روپیہ جھونپڑے کا کرایہ ایک روپیہ جھونپڑے کی مرمت، اور سود وغیرہ نکال کر پینتالیس روپے میں سے صرف یہ بیس ملے ہیں۔ لو یہ دس تمہارے حصے کے ہیں"

"نہیں ہری بھائی" منو نے جواب دیا "یہ روپے بھی تم اپنے ہی پاس رکھو۔ آخر میرا کھانا اور کرایہ بھی تو دیتے ہو"

"نہیں بھائی تم کیوں تکلیف پاؤ۔ تم اپنا حصہ لے لو" ہری نے اصرار کیا۔

"اچھا اسے پانچ روپے جیب خرچ کو دے دو" رتن نے ان کی یہ تکلف کی بحث ختم کرنے کو کہا۔

"رتن" فورمین کی آواز آئی۔

پہلوان اٹھا اور اکڑتا ہوا میز کی طرف چلا۔ اس نے پہلے سے ہی ہوا باندھ دی "خراب کپڑے کے دام مت کاٹنا صاحب اور سود بھی نہیں، میں سود پر قرض نہیں لیتا"

"بیس روپے" فورمین نے کہا "ایک روپیہ دیری سے آنے کا"

"بیس روپے" پہلوان نے اپنے مضبوط جسم کو تان کر کہا "ایک پائی کم نہیں" فورمین نے نگاہیں اٹھا کر پہلوان کی آنکھوں کی سختی کو دیکھا۔ اور گھبرا کر مونچھیں مروڑنے لگا۔ رنگت پہلے سے بھی زیادہ سرخ ہو گئی۔

"اچھا" انھوں نے اپنی عزت کی خیر مناتے ہوئے کہا "اب کے

تم کو معاف کیا۔ لاؤ انگوٹھا"

"میں لکھ سکتا ہوں" رتن نے سختی سے جواب دیا۔ فورمین نے اُسے قلم دیا، بیس روپے کے نوٹ پاس ہی میز پر رکھ دیئے اور انتظار کرنے لگا کہ کہیں جلد یہ شخص دفع ہو۔ لیکن پہلوان نے دھیرے دھیرے ایک ایک حرف کر کے اپنا نام لکھا، کھڑے ہو کر نوٹ گنے۔ اور "مہربانی صاحب" کہہ کے پیٹھ موڑ کے چلدیا حالانکہ اور قلی دوہرے ہو ہو کر پیچھے ہٹا کرتے تھے۔

رتن باہر نکلا تو اسے قلیوں کی بھیڑ میں ہری اور منو نہیں دکھائی دیئے۔ اس نے سوچا گھر چلے گئے ہوں گے اور فیکٹری کے احاطے سے نکل آیا۔ رستہ میں ایک چھوٹی سی کھائی پڑتی تھی جو کچی کھڑی سڑک اور میدان کو الگ الگ کرتی تھی۔ پہلوان نے اس کھائی کو کود کر پار کیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ ایک لمبا چوڑا پٹھان ہری کی گردن میں ہاتھ دیئے ہے اور ایک چھوٹا سا گٹھیلا مسلمان ہری کو بندوق [illegible] دے رہا ہے۔ منو کا پتہ نہ تھا۔

"ہاں تو ہم سے بچ کر جانا چاہتا تھا" چھوٹے پٹھان نے ہری پر لپک کر کہا "گدھے کا بچہ، کافر، کیا مزے سے قلیوں کی ٹانگوں میں چھپ کر بیٹھا تھا جیسے ہم دیکھ ہی نہیں سکتے تھے، چل نادر خاں کا روپیہ دے"

ہری نے اپنی دھوتی کا ایک کونہ کھول کر نوٹ نکال ہی رہا تھا کہ لمبے پٹھان نے اُسے پیچھے سے ایک لات دی اور کرتے کا گلا پکڑ کر اس زور سے کھینچا کہ اس کی آنکھیں نکل پڑیں، دانت کٹکٹانے لگے اور کرتا پھٹ گیا۔

"ارے یہ کیا دے رہا ہے۔ یہ تو صرف سود ہے" پٹھان نے کہا "چل اور نکال، تیری دھوتی میں بندھا ہے"

"خاں صاحب میری تنخواہ کٹ گئی ہے" ہری نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کے بیچ میں نوٹ دبائے ہوئے ہاتھ جوڑے، کپڑے کے دام بھی کٹ گئے ہیں۔ اس مہینے میں آپ کو نہیں دے سکتا اگلے مہینے لے لینا"

چھوٹے قد والے پٹھان نے نوٹ اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور لمبا پٹھان پھر ایک لات مارنے والا تھا کہ رتن نے پیچھے سے آ کے اس کی گردن ناپی "چھوڑ دو اسے۔ بدمعاش کہیں کے"

"پہلوان جی اس میں تمہارا کیا؟ سچ ہے" چھوٹے پٹھان نے کہا

"سب کچھ سچ ہے سور۔ تمہیں روپیہ تو دے چکا۔ وہ اب کیا چاہیئے۔ بوڑھے آدمی کے سامنے اپنی طاقت کی ہیکڑی جتاتے ہو۔ آؤ ذرا مجھ سے لڑو"

"اچھا۔ اچھا۔ پہلوان صاحب" اور پٹھان نے ہری کا کرتا چھوڑ دیا۔

"چل جا۔ باقی ہم کھاتے میں لکھ لیں گے" رتن نے پٹھان کا گلا چھوڑ دیا اور وہ دونوں جھنجھٹ مٹانے کے لئے سر اٹھائے دوسرے قلیوں کی طرف چل دیئے۔ ہری بھاگا۔ رتن بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ ہری پٹھانوں سے اتنا خوفزدہ تھا کہ بوکھلا گیا اور لڑکھڑا کے گر پڑا۔

"ہری۔ ہری۔ اتنا نہ ڈرو۔ یہ تو میں ہوں رتن" پہلوان نے اسے اٹھایا اور دونوں خاموشی سے گھر کی طرف چلنے لگے۔ چال میں پہونچ کر انھوں نے دیکھا کہ چوکیدار کرایہ لینے کھڑا ہے۔

"یہ کرایہ مانگ رہا ہے" منو نے اپنے دوستوں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "میں نے اس سے کہدیا ہے کہ شبو ہمارا کرایہ دیگا"

ہری نے اپنی دھوتی میں سے تین روپے کھولے "تم دو روپے لے
دو بھائی، ہم پھر شبو سے لے کر لیں گے"

منو نے دو روپے لے لیئے "

"یہ میرا کرایہ" رتن نے دو روپے چوکیدار کو دیئے،

ہری لشٹم پشٹم سیڑھیوں پر چڑھا اور تیسری منزل پر پہنچکر اپنی کوٹھری
کے فرش پر گر مڑ ہو کر پڑ رہا۔ لکشمی آکر اس کے ہاتھ پیر دبانے لگی۔ رتن نے بیڑی
سلگائی۔

منو ابھی تک ذہنی طور پر بیڑی سے لطف اندوز ہوا تھا۔ اس نے
سگریٹ کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن پہلا کش ہی لیتے کے ساتھ اسے کھانسی کا
ایک دھچکا لگا اور وہ خود اپنی کمزوری پر متحیر رہ گیا۔ رتن نے ایک قہقہہ لگایا۔

"ہماری تنخواہوں سے خراب کپڑے کے پانچ پانچ روپے کاٹ
لئے گئے ہیں"۔ شبو نے اندر آتے ہوئے کہا "یہ کھلکھلانے کا کون سا
موقعہ ہے"

"میری تنخواہ میں سے تو ایک پائی بھی نہیں کاٹ سکے وہ" رتن
بولا "تم میں اتنی ہمتِ مردانہ ہونی چاہیئے کہ اپنے حق کے لئے لڑو۔ اور نہیں تو
پھر میرے ساتھ آؤ۔ یونین میں شامل ہو جاؤ۔ مگر تم لوگ اتنے سست ڈھیلے
ڈھالے ہو کہ سنتے ہی نہیں"

"میں ضرور یونین میں شامل ہوں گا۔ کہاں ہے یونین؟" منو
نے کہا۔

"چلو تو پھر سب کے نام لکھوا دوں۔ وقت خراب کیوں کرتے ہو"
پہلوان بولا۔

"اچھا تو لکشمی پھر میں بھی جاتا ہوں" ہری کی تھکن اپنی بیوی کی خدمت سے بڑی حد تک دور ہو چکی تھی "یونین میں نام لکھوا آتا ہوں"

"میں بھی آتا ہوں" شنبو بولا۔

"ہاں ہاں سب آؤ" رتن نے کہا "پھر تم سب کو تاڑی کی دوکان پر لے چلوں گا"

منو اور رتن میں دوستی بڑھتی گئی۔ ایسی دوستی جیسی صرف زندہ دل اور ایمان دار پنچایوں ہی میں ہو سکتی ہے۔ کافی تیزی سے اور بہت جلد وہ دونوں پکے دوست بن گئے اور ایک دوسرے کو لنگوٹیا یار کہنے لگے۔

طبیعتوں کے علاوہ ماحول بھی ان کے درمیان محبت کے بڑھنے میں ایک بہت بڑی وجہ تھی۔ ٹیکسٹائل کے جس شعبہ کے ماحول میں وہ محنت کرتے تھے اس کے اکثر کارخانوں میں وہ زندگی بسر کرتے تھے اس میں بھائی چارے ہی سے زندگی کی تلخی کم ہو سکتی تھی۔ ورنہ بارہ گھنٹے روزانہ کی محنت تو آدمی کو کچل کر رکھ دے۔ پندرہ فٹ لمبے اور دس فٹ چوڑے کمرے میں رہنا۔ فرش پر لیٹ کر دھواں کھانا، برتنوں کی کھڑبڑاہٹ، بچوں کی چیخ پکار سنتے رہنا، ایک ہی برآمدہ، ایک ہی غسلخانہ، ایک ہی پمپ استعمال کرنا اور پھر چوبیس گھنٹے سٹرانڈ مو نگنتے رہنا۔ ان تکلیفوں کی بنا پر ان کی دوستی کی بنیادیں خوب پختہ ہو گئیں اور سب سے زیادہ تو اس جہنم سے باہر جو تھوڑا بہت وقت ایک ساتھ گذرتا تھا اس نے رتن اور منو کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا۔

منو کو صبح تڑکے اٹھنے میں بہت کوفت ہوتی تھی۔ اور پیدل جانے کے سوا فیکٹری تک پہنچنے کی کوئی اور صورت نہ تھی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ

ساڑھے چار یا پانچ بجے بستر سے اٹھ ہی جانا پڑتا تھا۔ ایک گھنٹے کے قریب فارغ ہونے تالاب میں نہانے اور رات کا بچا کھچا کھانے میں لگ جاتا تھا۔ فیکٹری پہنچتے پہنچتے چھ ضرور بج جاتے تھے۔ اور نادر خاں ہمیشہ قلیوں کے آنے کے وقت پر نظر رکھتا تھا اور ذرا بھی دیر ہونے پر تنخواہ کٹوا دیتا تھا۔

شام کو چھ کی سیٹی کے بعد پیدل گھر واپس آتے تھے۔ دن بھر کے کام سے تھکی ماندی عورتوں کو کھانا چڑھاتے چڑھاتے آٹھ نو بجتے تھے۔ اور کم از کم آٹھ گھنٹے کی نیند لینے کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ کھانا کھاتے ہی فوراً سو جایا جائے لیکن منو ایسا نوجوان لڑکا نو بجے کیسے سو سکتا تھا۔ جب سے رتن نے اسے تاڑی کی دوکان اور بمبئی کی دیگر دلچسپیوں سے آشنا کرایا تھا وہ اکثر بارہ بجے کے بعد سویا کرتا تھا۔ رتن سے دوستی کے یہ لمحات منو کے لئے بڑے قیمتی تھے۔ اسے ایسا لگتا جیسے وہ بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ جوان ہوتا جا رہا ہے اور جلد ہی پورا مرد بن جائے گا۔

چھٹیوں کے دن تو وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ اور اور سب قلیوں کے ساتھ مل کر سیر سپاٹے کے لئے اکثر شہر چلا جایا کرتا تھا۔

سنیچر کی شام کو رتن اور منو اکثر اکیلے ہی جاتے تھے۔ ریتیلی سڑک جو قلیوں کی اس دنیا کو شہر سے الگ کرتی تھی ان لوگوں کے قدموں تلے جلد ہی ختم ہو جاتی تھی اور راستہ سوکھتے ہوئے چھڑے اور مرے ہوئے کتے بلیوں کی سڑتی لاشوں کی بدبو اور گوبر کی سڑاند ختم ہو کر پام کی خوشبو آنے لگتی تھی جو سڑکوں کے اطراف لگے رہتے تھے اور جن کے آس پاس گلاب اور ولایتی سٹر کی جھاڑیاں لگی رہتی تھیں۔ سبز سبز پارکوں پر بڑے بڑے مکانات تنے کھڑے رہتے تھے جن کے پیڑوں میں سنہری گل مہر اور گیندا پھول پھول کر چاروں طرف طلائی نور برساتا رہتا تھا۔ دبلے پتلے ہڈی چمڑا قلیوں کے ٹیڑھے ٹیڑھے جسم شہر کے

خوش پوش خوش خوراک ۔ رہنے والوں کی بھیڑ میں گھل مل جاتے ۔ وکٹوریائیں موٹر ٹیکسیاں اور بڑی بڑی پرائیوٹ گاڑیاں چھا جاتیں اور یہ ملوں کے باسی شام کی چھائی ہوئی شفق کی طرح بمبئی کی فضا میں سما جاتے ۔

"آج میں تمھیں ایک تماشہ دکھاؤں گا" رتن نے منو سے کہا ۔

اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی ۔ وہ دونوں تاڑی کی دوکان میں بیٹھے تھے ۔ اس نے مری شراب کی بوتل سے شراب کا آخری قطرہ پیا اور منو کو ساتھ لئے عبدالرحمٰن اسٹریٹ کے لیمپوں کے نیچے سے ہوتا ہوا بھنڈی بازار سے نکل کر گرانٹ روڈ پر آ گیا ۔

منو نے بھی بیئر کا ایک گلاس پیا تھا اور وہ بڑے اشتیاق سے رتن کے پیچھے پیچھے اس تنگ، فرسودہ، گندی گلی میں گھس گیا جس کی گندگی تاریکی سے ڈھک گئی تھی، بدبو پکتے ہوئے پھولوں میں چھپ گئی تھی ۔ اور افلاس ان خوب پینٹ کی ہوئی، زیور سے لدی عورتوں میں پوشیدہ ہو گیا تھا جو بھڑکیلے کپڑے پہنے ادھر ادھر کھڑکیوں، بالکونیوں اور برآمدوں میں دوکانوں کے اوپر، گدے دار کرسیوں پر بیٹھی تھیں ۔ اور عجیب پراسرار طریقے سے مسکرا مسکرا کر مردوں کے اس سیلاب کو اشارہ کر رہی تھیں جو نیچے گلی میں پان کھائے، بھڑکیلے کپڑے پہنے ادھر سے اُدھر سودا کرنے کی فکر میں ٹہل رہے تھے ۔

"کیوں کیا مزے دار نظارہ ہے" رتن نے جھک کر منو کے کان میں کہا ۔ "خوش ہو نہ کہ میرے ساتھ یہاں آئے ۔ اچھا یہ بتاؤ ان میں سے کون سی عورت تمھیں پسند ہے؟"

منو اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لئے ہنس پڑا ۔ رتن کے الفاظ نے اس کے وجود میں ایک عجیب اشتیاق پیدا کر دیا ۔ اور اس کا دل زور زور

سے دھڑکنے لگا۔ اُسے بڑی خوشی اور گرمجوشی سی محسوس ہوئی اور وہ بھولے پن سے اپنے دوست کا منہ تکنے لگا جیسے کوئی بڑا ہی پُرلطف خواب دیکھ رہا ہو۔

"آؤ۔ مجھے معلوم ہے تمھیں کہاں جانا چاہئے۔ ہم لوگ پیاری جان کے وہاں چلیں گے" منو اپنے دوست کے پیچھے چلنے لگا۔ گلی میں خوش باش کھلکھلاتے لوگوں کا ایک اژدھام اِدھر سے اُدھر آجا رہا تھا۔ ایک رنگین اژدھام گورے، کالے، بھورے سب رنگ اور سب قوموں اور نسلوں کے لوگوں کا ایک سیلاب تھا کہ اُمڈا چلا آتا تھا۔ سب کے سب عیش و نشاط کے نغمہ پر ناچ رہے تھے، ایک ایسا عیش و نشاط جو خواہ وقتی اور عارضی طور پر ہی سہی، لیکن روح کی تنہائی کو کم کر دیتا ہے، زندگی کے افکار کی تلخی میں تھوڑی سی مٹھاس پیدا کر دیتا تھا۔ منو کو کیا معلوم تھا کہ انسانیت کا یہ مجمع جو ارباب نشاط کی اس گلی میں اس وقت جمع تھا اپنی اصل زندگی میں کتنا کتنا کچلا ہوا، اور کیسا بدبخت تھا۔ وہ تو صرف یہاں کی چمک دمک سے مرعوب ہو گیا اور اسے ایسا لگا جیسے کوئی بہت بڑا تھیٹر ہو رہا ہے جیسا اس کے اپنے گاؤں میں کبھی ہوا کرتا تھا۔ یہاں آنے سے منو کا خود کوئی خاص مقصد نہ تھا اور اس نے سوچا کہ یہ لوگ بھی یوں ہی تفریحاً گھوم رہے ہوں گے۔ ابھی منو سوچنے بھی نہ پایا تھا کہ کہاں ہے، کہ رتن اسے کھینچتا ہوا ایک پتلی سی تاریک گلی میں سے لے جا کر ایک بدبودار صحن میں لے گیا اور وہاں سے ایک تاریک زینے سے ہو کر وہ دونوں ایک کھلے چوبارے پر نکل آئے جس میں لمبے لمبے فانوسوں سے خوب روشنی کی گئی تھی، اور چاروں طرف رنگین کاغذ کی بیلیں اور پھول وغیرہ آراستہ کئے گئے تھے۔ اوھر ادھر کنگ ایڈورڈ اور موجودہ شہنشاہ کی تصویریں لگی تھیں،

ان کے پاس ہی ہنومان جی کی تصویر اور ذرا ہٹ کر پیاری جان کی جوان تصویر لگی تھی۔ جب اس کے بہار کے دن تھے، اس نے گرانٹ روڈ کے بہترین حصہ پر کوٹھا لے رکھا تھا اور بمبئی کے تمام امراء کو اپنے ناچ سے لبھایا کرتی تھی۔ اُس پیاری جان اور موجودہ پیاری جان میں زمین آسمان کا فرق تھا، اب تو وہ ادھیڑ تھی، کمزور اور مرجھائی ہوئی، اور صرف قیمتی کپڑے پہن کر اور زیور لاد کر کھڑکی میں بیٹھنے بھر کی رہ گئی تھی۔

"آؤ۔ آؤ۔ پہلوان جی۔ بڑے بھاگ۔ کہاں چھپے رہے اتنے دن۔ تمہارا رستہ دیکھتے دیکھتے تو میری آنکھیں بھی جواب دے گئیں"

اور وہ اپنی باتوں کی بناوٹ چھپانے کے لئے مسکرا دی۔

"میں نے ادھر بڑی محنت کی۔ کام میں لگا رہا" رتن نے کہا

"اور نورین نے آدھی تنخواہ بھی کاٹ لی تھی"

"تو اس مہینے میں تو نہیں کاٹی" پیاری جان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ نہیں۔ تم مت ڈرو۔ تمہارا حصہ کہاں جا سکتا ہے"

رتن نے پیاری کے سوال کا مبہم جواب دیا۔ اور پھر بات بدلنے کے لئے بولا "دیکھو میں تمہارے لئے کیسا گبھرو جوان لایا ہوں"

پیاری جان منو کی طرف بڑھی اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی "واہ وا۔ خوبصورتی میں تو جیسے بھگوان کا ہی بیٹا ہو۔ اور اتنا بڑا تمہارا لڑکا ہے؟"

"نہیں یہ میرا رقیب ہے۔ تمہارا عاشق" رتن نے کہا

باریک کپڑوں اور جھلملاتے زیوروں کے اس ماحول میں منو کا دل

گھبرانے لگا۔ پیاری جان کے جسم سے آئی ہوئی خوشبو کی لپٹوں سے اس کا سر چکرانے لگا لیکن پھر بھی اُسے یہ معلوم کرنے کا اشتیاق تھا کہ اس عورت کی محبت میں کیا لطف ہوگا اور وہ ہمہ تن اشتیاق بنا کھڑا رہا۔

"تو بیٹھیے نہ پہلوان جی۔ تشریف رکھیے۔ آپ تو ہمیشہ مذاق ہی کرتے رہتے ہیں۔ ہے نا"؟ پیاری جان بولی۔

"تو پھر تو میں تمہارے کوٹھے پر مجرے کا کام کیا کروں گا"، رتن اپنی ہلکی سی گھبراہٹ چھپانے کو برابر بات کرتا گیا اور مونڈھے کے ساتھ سفید چاندنی کے فرش پر بیٹھ گیا۔

"آپ تو ہمارے مہربان کرم فرما ہیں"، پیاری کہنے لگی "ہم بھلا آپ کو اپنے نچنیوں میں رکھ سکتے ہیں۔ ہم تو آپ کے نوکر ہیں"، اور پھر اس نے گاہک کو معاملے کی طرف پھیرتے کہا "تو جناب کچھ شربت وغیرہ پئیں گے، اور کچھ گانا وانا سنیں گے"؟

"ہاں۔ ہاں۔ ضرور"، رتن دل میں تو سمجھ رہا تھا کہ پیاری جان کا اصل مطلب کیا ہے "یہ دیکھو یہ شربت تمہیں پسند ہے"؟ اور اس نے اپنی جیب سے پورٹ کی ایک بوتل نکالی۔

"یہ تو آپ نے بڑا کرم کیا پہلوان جی۔ آپ نے تو رستم زماں کی قبر پر بھی لات ماردی۔ میں گلاس لاتی ہوں"، اور وہ ایک طاق کی طرف گئی جو بڑی سی چوبی مسہری کے اوپر ہی بنا تھا۔ مسہری بڑی خوبصورت خراد کے کام کی تھی جیسی صرف شمالی ہندستان ہی میں بن سکتی ہے۔ چار چھوٹے چھوٹے پیالے لاکر اس نے دوسرے کمرے میں جھانک کر جواب دیا۔

"اری جانکی، اری گلاب جان، اے بوے خان"

"تو پھر کچھ ناچ بھی ہمیں دکھاؤ گی۔ مگر تم اتنی تکلیف کیوں کر رہی ہو" رتن بولا "آؤ ذرا یہاں میرے پاس تو بیٹھو"

"قربان جاؤں" اور پیاری آکر رتن کی گود میں بیٹھ گئی "ہم تو آپ کے نوکر ہیں"

منو کو اس اظہارِ محبت سے بڑی گھبراہٹ ہوئی اور وہ بوکھلا کر ذرا سا مسکرا دیا۔ اس نے پہلے کبھی کسی مرد عورت کو ایک دوسرے سے اتنا قریب نہ دیکھا تھا۔ اس کا چچا ہمیشہ چچی سے الگ پلنگ پر سویا کرتا تھا، پربھا اور پاربتی کے پلنگ اگرچہ پاس پاس ضرور بچھتے تھے مگر اس نے کبھی ان دونوں کو ایک دوسرے کو ہاتھ لگاتے بھی نہ دیکھا تھا۔ ہری اور لکشمی کا تو پوچھنا کیا۔ وہ تو جیسے دو الگ الگ دنیاؤں کے باسی تھے۔ اُسے اپنی انتڑیوں میں ایک عجیب قسم کی تڑپ سی محسوس ہوئی جس نے اس پر رتن کی پلائی ہوئی شراب سے بھی زیادہ نشہ طاری کر دیا۔

اتنے میں دو حسین دوشیزائیں سرعت سے کمرے میں داخل ہوئیں۔ چمکدار ریشم کے چوڑی دار پاجامے۔ ابھرے جوبنوں پر گلابی رنگ کے کلف دیئے ہوئے حبابی دوپٹے، چہروں پر ایک عجیب بہادرانہ مسکراہٹ، جوان کی روحوں کی پکار کو دوبارہ بھی تھی۔ کمرے کے بیچوں بیچ رک کر انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا جیسے بودے خاں کی منتظر ہوں۔ اتنے میں بودے خاں آ ہی گئے۔ سیاہ رنگ، منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، آنکھیں مچی مچی سی سفید براق کپڑوں میں بھی ان کی دلالی چھوٹی نکلتی تھی۔

"سلام، پہلوان جی" بودے خاں نے کہا "آپ نے بڑی مدت کے بعد ہمارے غریب خانے کو نوازا۔ اب جلدی آپ کی

کچھ خاطر ہونی چاہیئے۔ اچھا تو بھئی لڑکیو پھیر رہے ہے" اور انھوں نے بیٹھ کر سامنے ہارمونیم جمایا اور اس پر انگلیاں پھیرنے لگے۔ ہارمونیم میں سے ایک طویل، دردناک آواز نکلنے لگی اور ایسا لگتا تھا کہ اس آواز میں ناچنے والیوں نے گھبراہٹ کو گم کر دیا

پیاری نے طبلے اٹھا لئے اور اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں سے تال دینے لگی۔ پھر ہارمونیم سے ایک ہجر کا نغمہ بلند ہوا طبلے نے بھی برسات کی گھنگھور گھٹاؤں کی طرح اس کا ساتھ دیا، دونوں رقاصائیں اپنے ہاتھ اٹھا اٹھا کر نزاکت دکھانے لگیں اور اپنے مہندی سے رچے پیروں پر تھرکنے لگیں جیسے ان کے سارے وجود میں آگ بھڑک اٹھی ہو۔ ہارمونیم کا نغمہ فضا میں بلند ہوا اور پھر نیچے آیا، جیسے منو کا دھڑکتا ہوا دل، پیاری نے ایک گیت کے بول شروع کئے دونوں رقاصائیں بہتے ہوئے چشمے کی سی نزاکت سے آگے بڑھیں، اور ان کے ٹخنوں میں بندھے ہوئے گھنگھرو گیت کے تال پر کھنکنے لگے، اور تمام فضا میں ایک ایسی ہم آہنگی چھا گئی جس میں سب بھلے ہوئے معلوم ہوتے تھے، پیاری کی آواز کا بار بار گیت کے لطیف ہوسناک حصہ کو دہرانا ناچنے والیوں کے وجود کے بھڑکتے ہوئے شعلے، ہارمونیم کے دھیمے سُر اور طبلہ اور طنبورہ کی تیز تال منو اور رتن کے دل پر یک دفعت چھا گئیں۔ جب نغمے کی آخری بلندی آ گئی تو ناچنے والیاں انتہائی نزاکت سے گول گول ناچنے لگیں جیسے رنج و مسرت کے چکر ہوں اور تمام فضا پر ایک مجنونانہ جوش اور کیف چھا گیا۔ رتن نے اپنی دھوتی کا اوپر کا حصہ کھول کر ایک روپیہ نکالا اور گھٹ سے ہارمونیم پر پھینکا۔

"واہ وا۔ خوش کر دیا تم نے پیاری جان! میری معشوقہ، میری جان"

پیاری طبلہ کے پاس سے ہٹ کر رتن کی گود میں آ گری اور کہنے لگی "بڑی خوشی

کی بات ہے کہ آپ مجھ سے خوش ہوئے۔ مگر آپ بھی تو مجھے خوش کیجئے"

"میں رستم ہند کچھ یوں ہی نہیں ہو گیا ہوں۔ جب تمہیں اپنی رانوں کے نیچے دباؤں گا تو دیکھ لینا"۔ بودے خاں اس مذاق پر منہ پھیر کر ہنسنے لگا۔ اس کی مچی ہوئی آنکھوں کے کونے پھیل گئے۔ دونوں رقاصائیں بھی جو ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھ گئی تھیں پہلوان کی اس بات پر کھی کھی کرنے لگیں۔ منو کا دل چاہا کہ سمندر کی لہروں کی طرح آگے بڑھ کر ان عورتوں کے جسموں کو چھو لے لیکن کنارے پر پہنچنے سے پہلے وہ لہریں واپس لوٹ گئیں۔

پیاری نے بودے خاں کو اشارہ کیا اور اپنی چوڑیاں کھنکا کر آنکھیں مٹکا کر، اور سر کی ایک دلکش نزت دکھا کر ایک گیت کے بول گانے لگی کہ رتن جھومنے لگا، ہارمونیم نے بھی گانے کا ساتھ دیا۔

پیاری رک گئی کہ اب اسے دوسرا روپیہ بھی ملے۔ طوائفوں کا تو یہ قاعدہ ہی ٹھہرا کہ جہاں گاہک اچھی طرح ہتھے چڑھا کہ ہر ہر بول پر روپیہ وصول کرنے کی تاک میں رہتی ہیں۔

"تھوڑا سا ناچ اور ہو۔ اس سے میرے نوجوان دوست کو خوشی ہو گی"، رتن نے چالاکی سے روپیہ دینے سے کنی کاٹی۔

وہ دونوں لڑکیاں پھر اٹھیں، اور ایسے آنکھیں مٹکائیں کہ چہروں پر لگی ہوئی سرخی اور آنکھوں پر لگا ہوا بھاری کاجل بخوبی نمایاں ہونے لگا۔ انھوں نے پیاری کے گیت کے بول اٹھا لئے اور نغمے کی اٹھتی ہوئی آواز پر ایسا ناچنے لگیں کہ گیت کا سارا عشق اور ہوس، آرزو اور حسرت ان کے تھرکتے ہوئے جسم اور سڈول بازوؤں کی نزاکت سے ظاہر ہونے لگی جیسے سانپ کی سبک اور تیز چال، جیسے چیتے کی خونخواری، جیسے ہرن کا معصوم اور مستانہ رم،

جیسے ساحرہ کا دھیما دھیما پھیلتا ہوا جادو۔ ان کی ملیح رنگتیں سنگار کی مدد سے چاروں طرف لگے ہوئے آئینوں کے پرتو سے جھلکنے لگا یہاں تک کہ ان کی روح کا بھی عکس نظر آنے لگا۔

گیت کے حسرت بھرے ہوسناک بول سن کر رتن تڑپ تڑپ اٹھتا "واہ واہ شاباش" ناچ کے اختتام پر اس نے ایک روپیہ اور نکالا اور کشتی میں رکھ کر نذرانے کے طور پر پیش کیا۔

رقاصائیں تھم گئیں اور دوسری طرف کو سرک گئیں۔ بوڑھے خاں بھی ان کے ساتھ ہی کھسک گیا۔ منو اس دوران میں دم بخود رہ گیا تھا اور اب اس پر گھبراہٹ سی طاری ہو رہی تھی۔ اُسے گرمی لگنے لگی اور چہرہ سرخ ہو گیا۔

"یہ لڑکا اب تھک گیا ہوگا" پیاری نے معنی خیز الفاظ میں کہا۔

"ہاں بھائی منو! اب تم گھر جاؤ۔ میں ذرا ٹھہر کر آؤں گا"

منو کو ایسا لگا کہ اُسے خود کچھ نہیں معلوم کہ وہ چاہتا کیا ہے اور اس کش مکش سے اس کی جان نکل جائے گی۔ اتنا تو ضرور اسے معلوم تھا کہ اسے کوئی خواہش تھی، کیا تھی یہ کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا، پیاری نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور باہر نکلتے نکلتے منو پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ ارباب نشاط کی اس گلی سے وہ ناکام و نامراد لوٹ کر بمبئی کی جاگتی گلیوں سے گذرنے لگا جہاں بے گھر اور بے در قلی چاروں طرف پڑے تھے۔ پسرے تھے، کراہ رہے تھے اور کہیں کہیں بیٹھے غپ شپ کر رہے تھے، بند دوکانوں کے آس پاس، گیس کی دھندلی روشنیوں میں ان کے زرد مرجھائے چہرے اور بھی زرد لگنے لگے تھے۔

شہر کے باہر اندھیاری رات میں سڑکیں نکلی ہوئی مانگ کی طرح سفید لگتی تھیں لیکن ان کے آس پاس کے گڑھے اور بھی تاریک، عمیق منہ پھاڑے ہوئے بھیانک لگتے تھے، خاص کر جب کوئی جگنو اپنے جھلملاتے پر پھیلا کر اڑتا یا دور کھجور کے کسی سنسان جھنڈ سے الو اپنی بھاری منحوس چیخیں بلند کرنے لگتا۔

منو کے روح کی بے چینی جو پیاری جان کے یہاں جانے سے پیدا ہو گئی تھی، اس کے سینے کو بھاری بوجھ بن کر دبانے لگی۔ اس کا دماغ ان غیر شعوری آرزوؤں اور حسرتوں سے چکرانے لگا۔ جو اس کے ذہن پر بھوتوں کی طرح چھائی جا رہی تھیں "یہ آخر مجھے ہو کیا گیا ہے۔ مجھے چاہیئے کیا؟" وہ اپنے تھکے ہوئے جسم کو گھسیٹنے لگا۔ لاجواب رہ جانے پر وہ بے پروائی سے بڑے بڑے قدم اٹھانے لگا۔ اور اس کے قدم کسی ایسے بھوت کے لمبے لمبے ڈگ گننے لگے جو اپنے بڑے جثے کے باوجود بھی اندھیرے میں نامعلوم روح سے ڈر رہا ہو جو تاریکی میں بال بکھیرے، کھیسیں نکالے اپنے تیز ناخونوں سے آنکھیں نکال لینے پر تیار ہو۔

اس نے اس تخیل سے بچنے کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں، لیکن ٹھوکر کھائی۔ ایک پتھر سے اس کا انگوٹھا کٹ گیا، اور پھر وہ دوڑنے لگا، تیز تیز دوڑنے لگا۔ یہاں تک کہ مزدوروں کی بستی سامنے نظر آنے لگی، تاریکی کی چڑیلیں اور ڈائنیں پیچھے چھوٹ گئیں، اور سامنے کسی جھونپڑے کے دیئے کی گرم روشنی نظر آنے لگی۔

ہری کی بیوی اس کے انتظار میں ابھی تک جاگ رہی تھی۔ دیوار سے پیٹھ لگائے، سوتے ہوئے اور لوگوں سے الگ، مٹی کے چراغ کی مدھم

روشنی میں بیٹھی وہ پرانے چیتھڑوں کو گونتھ گانتھ رہی تھی۔ منو کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک لمحہ دو بھری چمک جاگ اٹھی اور اس نے ہمت کر کے پوچھا "اتنی رات گئے تک کہاں رہے؟" منو نے اسے گھورا۔ پیاری کے سر پر ہاتھ رکھنے سے جو آنسو نکل آئے تھے وہ پھر آنکھوں میں بھر آئے۔ اس نے لکشمی سے نظر نہیں ملائی اور اس کونے میں چلا گیا جہاں وہ سویا کرتا تھا۔ جب اس نے پھر نظر اٹھائی تو لکشمی اس پر جھکی ہوئی اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی اور اس کے گال سرخ ہو رہے تھے۔ فطرت کے تقاضوں سے بچنے کے لئے منو نے اپنا سر ہلایا اور پھر منہ چھپا لیا۔ لکشمی نے اس کی ٹھوڑی میں ہاتھ دے کر اس کا منہ اوپر کر لیا۔ انتہائی مادرانہ شفقت سے اس کی ضرورت محسوس کر کے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور دھیمے الفاظ میں اسے تسلی دینے لگی "ہم غریب ہیں، ہم لوگ تکلیفیں ہی اٹھانے کو پیدا ہوئے ہیں، میرا بچہ! میری جان"۔

پھر وہ اس کے پاس ہی لیٹ گئی اور اسے اپنے کلیجے میں بھینچ لیا اور دبا دبا کر پیار کرنے لگی۔ اس کی قربت سے منو کی بیقراری اور بھی بڑھ گئی اور وہ عنفوان شباب کی تمام بے چینیوں سے تڑپ تڑپ کر کروٹ لینے لگا یہاں تک کہ صبح نزدیک آ گئی اور منو پر ایک عارضی موت چھا گئی ——— وہ لکشمی سے لپٹا لپٹا سو گیا۔

سوموار کا دن یوں تو سب کے لئے ہی مشکل ہوتا ہے مگر قلیوں کے لئے تو جیسے روزِ قیامت ہی ہوتا ہے خاص کر جب کہ وہ اس سے پہلے ڈیڑھ دن اپنے معمولی انسانی تعلقات بڑھا چکے ہوں اور روح کسی قدر تازہ ہو چکی ہو۔ سوموار کے دن ان کو پھر کام سے واسطہ ہوتا تھا، جیسے زندگی کے بعد وہ پھر موت کا سامنا کر رہے ہوں۔ فیکٹری کو جاتے ہوئے ان کے وجود بالکل ایسے لگتے تھے جیسے

مسحور ہو کر مفلوج ہو گئے ہوں گویا موت کا دیوتا غیر مرئی طور پر کہیں چھپا بیٹھا ہے اور انھیں ابھی قیمہ بنا کر رکھ دے گا۔ ان کے چہروں پر اس رنج و غم کی پرچھائیں ہمیشہ منڈلاتی رہتی تھی جسے وہ کبھی ظاہر نہ کرتے تھے۔

منو دل ہی دل میں سوچتا تھا کہ یہ سب اتنے مغموم کیوں نظر آتے ہیں کیونکہ اس کے اپنے جسم میں عنفوانِ شباب کی توانائی باقی تھی، اور وہ گھور گھور کر انھیں دیکھتا۔ کانپتے، کمزور، تھرتھراتے جسم، سکڑتے، سیاہ، بدصورت چہرے اور ان کا وہ شکستہ وجود، چلتے تو ایسے تھے جیسے خواب میں ہوں۔ ایک دوسرے سے ملتے وقت ٹھنڈی سانسیں لے کر اور لمبی آہیں کھینچ کر "رام رام" کہتے، جیسے لاشعوری طور پر خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا شکریہ ادا کر رہے ہوں۔

منو کو یاد آیا کہ اس کے مربی اور مہربان دولت پور والے پربھا کا بھی یہی حال تھا، وہ ہر بات میں خدا کی مصلحت ہی پاتا تھا۔ یہاں تک کہ گنپت کے برے برتاؤ، پولیس کی چارچوٹ کی مار اور اس بخار میں بھی جس سے وہ مرتے مرتے بچا تھا ——— اس کا خیال تھا کہ ہماری ساری مصیبتیں ہمارے گناہوں کا بدلہ ہیں جو ہم نے کبھی نہ کبھی ضرور کیے ہوں گے۔ شاید یہ سب لوگ بھی کرما کے معتقد ہوں۔ کم از کم ہری تو ضرور تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا اور اس امید میں تھا کہ کبھی نہ کبھی تقدیر ضرور پلٹے گی کیونکہ اس نے زندگی میں کچھ نیک کام تو کیے ہی تھے۔ رتن اس عقلمندی کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اور صرف وہی مالک تھا جو اپنے وجیہہ چہرے پر بہادرانہ مسکراہٹیں لیے شان سے سینہ نکال کر چلا کرتا تھا۔ باقی سب تو یونہی سر جھکائے ذلیل بنے گھوما کرتے تھے لیکن منو کو رتن کے متعلق ہمیشہ فکر ہی رہتی تھی، وہ کوشش کیا کرتا کہ رتن کو وجیہہ اور

بے فکرا نہ سمجھے کہ کہیں اس کو نظر نہ لگ جائے۔ اور چنانچہ ایک دن ایسا ہی ہوا ایک دن رتن کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

بات یوں ہوئی کہ چمٹا صاحب روز صبح ہمیشہ شیڈ کے دروازہ پر قلیوں کا سلام لینے تنے کھڑے رہا کرتے تھے۔ اور اس کے عوض میں کبھی صرف ہاتھ ہلا دیتے تھے اور کبھی کبھی گالی دے دیا کرتے تھے۔ اس حرکت سے دل میں برابر امن قائم رہتا تھا کیونکہ ان کے بڑے سے بھاری بیل ایسے جسم کا نظارہ ہی قلیوں کو دبا دینے اور ان میں خدا کا خوف پیدا کر دینے کے لئے کافی ہوتا تھا اور پھر اپنے فرائض بجا لانے کے لئے ان کا دماغ بالکل سیدھا ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ کسی قلی کو ایک آدھ لات بھی رسید کر دیتے تھے۔ لیکن ایسا صرف اسی وقت ہوتا تھا۔ جب وہ معمول سے پہلے شراب پی لیتے تھے، یا مسز چمٹا سے ان کی لڑائی ہوئی تھی، یا صبح کے اخبار میں قومی مظاہروں کا حال یا کسی کمیونسٹ حملے یا کمیونسٹ پروپیگنڈے کے متعلق پڑھتے، کیونکہ ہندستان میں راج کرنے والے انگریزی طبقے کے ایک رکن کی حیثیت سے انھیں اس سے سخت نفرت تھی۔ اور کوئی قوم جس کا حق مار لیا گیا ہو اگر اپنی آزادی کے لئے لڑتی تو اسے وہ اپنی ذاتی ہتک سمجھتے تھے۔ لنکا شائر کے وہ دن انھیں بھول چکے تھے جب ان کی اپنی گذران بڑی مشکلوں سے چلتی تھی۔

رتن ذرا آزاد منش آدمی تھا۔ وہ کبھی دوہرا ہو کر خورمین صاحب کو سلام نہیں کرتا تھا۔ اسے اپنی ذاتی طاقت پر بڑا بھروسہ تھا اور پھر اس کی پشت پر یونین کی طاقت بھی تو تھی، اسے معلوم تھا کہ وہ اپنا کام بخوبی جانتا ہے اور محنت سے کرتا ہے اور مہینے کے آخر پر اسے پوری مزدوری ضرور ملنی ہی چاہئے۔ اگر اس کی تنخواہ وقت پر نہ ملتی یا بگڑے کپڑے کا دام اس کی تنخواہ میں سے کاٹا جاتا

تو وہ مخالفت پر کمر بندھ لیتا تھا۔ لہٰذا رتن اور چمٹا صاحب میں اُنس کی کوئی صورت نہ تھی۔

"سلام صاحب" پہلوان نے اکڑ کر چمٹا صاحب کے سامنے سے گذرتے ہوئے کہا۔

"ادھر آؤ" صاحب نے تیزی سے مگر آہستہ سے کہا۔

"ہاں حضور" رتن نے ذرا تمسخرانہ انداز میں واپس لوٹتے ہوئے کہا۔

"تم کو ڈس چارج کر دیا گیا ہے" چمٹا صاحب نے کہا

"پر صاحب۔ میرا قصور؟"

"جاؤ تم ڈسچارج"

رتن نے نگاہ بھر کر صاحب کی طرف دیکھا اور ایک مرتبہ کانپا۔ جیسے کسی نے اس کے سینے میں خنجر بھونک دیا، اس کا چہرہ غیرت، صدمے اور جوش سے سکڑ گیا، پھر اس نے اپنی ٹھوڑی اٹھائی، حاضر پیسے اور اس کی آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ وہ سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا اور بے تحاشہ اس کا دل چاہا کہ صاحب کو اس غصہ کا ذرا مزہ چکھا دے جو بھوت کی طرح اس کے وجود میں مقید تھا ——— وہ بھوت جسے غریبی اور اپنے چاروں طرف کے لوگوں کی بے کسی اور صعوبتوں نے جنم دیا تھا۔ اس نے مارنے کو اپنا ہاتھ اٹھایا، لیکن چمٹا صاحب نادر خاں کے سائے میں پناہ لینے کے لئے پیٹھ موڑ چکے تھے۔ اور رتن اپنے دشمن کی پیٹھ پر حملہ کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا، اس نے اپنے ہاتھ جھٹک دیئے جیسے تمام جمع کی ہوئی طاقت پھینک دی ہو، جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور آنکھوں میں خون کے بجائے پانی کی سی نمی جھلکنے لگی۔

"وہ کہتے ہیں نا کہ گھوڑے کے پیچھے نہ جاؤ اور افسر کا سامنا نہ کرو۔ وہ کہتے ہیں نا کہ گھوڑے کا پیچھا اور افسر کا سامنا دونوں بُرے ہیں تو وہی ہوا۔" منونے رتن کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "میں جا کر اس کے آگے ہاتھ جوڑوں اور منت سماجت کرتا ہوں کہ تمہیں پھر سے رکھ لے۔"

"نہیں جی،" رتن اطمینان سے بولا۔ "میں اسے ذرا مزہ چکھاؤں گا تم دیکھتے تو جاؤ۔"

اور وہ تیزی کے ساتھ آل انڈیا ٹریڈ یونین فیڈریشن کے دفتر کی طرف چل دیا۔ جو وہاں سے کوئی آدھ میل پر تھا۔ لالہ اونکار ناتھ اس کے صدر تھے اور رتن کو یقین تھا کہ وہ ضرور اس کی بات ہمدردی سے سنیں گے کیونکہ وہ خود بھی شمالی ہندستان کے رہنے والے تھے۔ اونکار ناتھ جی کا بنگلہ ہی دفتر کا کام بھی دیتا تھا۔ رتن بنگلے پر پہنچا۔

"میں صدر صاحب کے پاس ایک شکایت لے کر آیا ہوں،" اس نے ایک کلرک سے کہا جو باہر برآمدے میں بیٹھا تھا۔ کلرک نے اُسے اوپر سے نیچے تک گھورا اور جواب دیا کہ صاحب بہت مصروف ہیں۔ رتن نے ایک چاندی کی اٹھنی اس کے ہاتھ میں کھسکا دی۔ اس نے دفتر کی چک اٹھائی، اندر گیا اور فوراً ہی واپس آ کر بولا "صاحب بہت مصروف ہیں۔ لیکن انھوں نے کہا ہے کہ آپ اگر اپنی شکایت عرضی کی صورت میں لکھ کر دے دیں تو اس پر غور کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ مجھے ایک روپیہ دیں تو میں عرضی لکھ دوں۔"

رتن غصے سے پیچ و تاب کھانے لگا۔ دل چاہا کہ ابھی کلرک کی گردن مروڑ کر رکھ دے، لیکن پھر سوچا کہ کلرک کا کیا قصور، وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور یونین کے نام عرضی لکھوانے لگا کہ اس کے ساتھ جو زیادتی کی گئی ہے اس پر

جواب طلب کیا جائے۔

اس شام رتن کے کمرے میں بہت سے لوگ آتے جاتے رہے۔ پہلوان کے ڈسچارج ہونے کی خبر چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ اور مل کی آبادی میں ہر طرف سے مزدور آن آن کر اس سے ہمدردی کرنے اور اپنی مصیبتوں پر اس سے ہمدردی حاصل کرنے لگے۔ لیکن یہ قلی سب کے سب ایک ہی جیسے تھے۔ شکستہ، مردہ دل، راضی برضا، یا تو اپنی پانی بھری بھوری آنکھوں سے ٹکٹکی باندھ دیکھا کرتے یا ٹھنڈی لمبی آہیں بھر کر بڑے زاہدانہ انداز میں کہتے "کیا کروگے بھائی! بھگوان کی مرضی یوں ہی تھی"۔ یا "بڑے رنج کی بات ہے پر اس کلجگ میں بروں کا بھلا ہے اور بھلوں کو تو سدا دکھ ہی بھوگنا پڑتا ہے۔" زندگی کی مسلسل مصیبتوں نے ان کی طاقت اور توانائی کو اس حد تک سلب کر لیا تھا کہ ان کی روحیں بھی کچل کر معدوم ہو چکی تھیں اور تکالیف کی ایک ہلکی سی پرچھائیں ان کو لپٹے رہتی تھی جیسے بیمار اور معذور کی بیچارگی، بے زبان جانور کی بے کسی اور معصوم بچے کا بھولا پن۔

ساڑھے آٹھ بجے کے قریب دو ہندستانی صاحب لوگ، سودا اور مظفر، اور ایک انگریز اسٹینلی ہیکن جسے قلیوں نے کبھی کبھی مل کے علاقہ میں تقریر کرتے سنا تھا، آئے۔

"کیوں رتن، ہم نے سنا ہے تم ڈسچارج کر دیئے گئے" سودا نے پوچھا۔

"جی ہاں" اور رتن بہادری سے مسکرا دیا۔

"فورمین نے تمہیں کوئی وجہ بھی بتائی؟" انگریز نے ٹوٹی پھوٹی ہندستانی میں پوچھا۔

"نہیں صاحب،" رتن نے کہا۔ "لیکن وہ تو بہت دن سے ایسا کرنے کا موقعہ ڈھونڈ رہے تھے۔ مجھے اس کی تو کوئی پرواہ نہیں لیکن ہمارے یونین کے صدر لالہ اونکارناتھ نے جو مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا اس کا مجھے بڑا غصہ ہے۔"

"تو تم ہمارے پاس کیوں نہیں آئے،" مظفر نے کہا۔ "ہمارے ساتھ رہنے کی وجہ سے تم پر یہ ظلم ہوا ہے، ہم تمہارا معاملہ طے کریں گے۔ مایوس کیوں ہوتے ہو۔"

"چمٹا صاحب کے پاس کیوں نہ چلیں؟" منو نے کہا۔ وہ بڑے شوق سے بیٹھا سب بات سن رہا تھا اور لال جھنڈے والوں کی آمد پر کافی جوش اور خوشی محسوس کر رہا تھا۔

"نہیں جی۔ وہاں جانے کا تو سوال ہی نہیں،" سودا نے ہاتھ چمکا کر کہا۔ "تم لوگ اتنی ذلتیں سہتے ہو پھر بھی تمہاری آنکھیں نہیں کھلتیں؟ تم اپنی مصیبت اور اپنی تحقیر پر پھٹ کیوں نہیں پڑتے؟ میں کہتا ہوں انھوں نے تمہیں پیسا ہے یا نہیں؟ تمہاری کھال کھینچی ہے کہ نہیں؟ تمہارا خون پسینہ ایک کیا ہے کہ نہیں؟ تمہاری زندگی عاجز کر دی ہے کہ نہیں؟"

"ہاں یہ سب بات تو سچ ہے۔ ایسا ہی ہے،" ہری اپنی جھکی ہوئی کمر کے بل سیدھا بیٹھا سر ہلانے لگا۔

"اس کوٹھری کو دیکھو جس میں تم رہتے ہو،" سودا نے پھر کہنا شروع کیا۔ "کیا یہ تم سب کے لئے کافی ہے، اور تمہارے جیسے ہزاروں مزدوروں ایسی ہی کوٹھریوں پر صبر کئے بیٹھے ہیں، جن کے پاس نہ سڑک ہے، نہ باغ ہے نہ کھیلنے کے لئے کوئی میدان ہے۔ ایسے کب تک چل سکتے ہو۔ بہت تو بہت

چھ مہینے۔ پھر اپنے اپنے دیس جا کر مر رہنا۔ اور یہ تمھارے بچے دن دن بھر ایک آنہ کے لئے محنت کرتے ہیں، ان کی بڑھن ماری جاتی ہے، دب کر رہ جاتے ہیں۔ کب تمھاری آنکھیں کھلیں گی؟ کب تمھیں عقل آئے گی؟"

"آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا تم لوگ بُرا نہ ماننا" مظفر نے سودا کے درشت کلمات کا زہر بجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "صاحب کو تم لوگوں سے محبت ہے۔ آپ بھی غریبی کی تکلیفیں اٹھا چکے ہیں اس لئے ایک ایسی ترکیب معلوم ہے کہ اگر تم سب سیکھ لو تو تمھاری غریبی یک قلم موقوف ہو جائے۔"

"یہ تمھارے بچوں کے لئے اسکول بنوائیں گے" انگرینے کہا۔

"اسکول ہی نہیں تمھیں روٹی کی بھی ضرورت ہے" سودا نے کہا۔ "دیس میں تمھارے ہاتھ کھیتی باڑی کرتے تھے اور یہاں تمھاری انگلیاں کپڑا بنتی ہیں، تمھارے بھائی بند تپتی دھوپ میں اناج اگاتے اور کاٹتے ہیں، سڑکیں بناتے اور کوٹتے ہیں۔ کانوں اور کھیتوں میں کام کرتے ہیں، ایسے تم تھوڑے دن کام کرتے ہو، پھر مر جاتے ہو، اور لوگ تمھاری جگہ اپنی ٹڈیاں پیلنے لگتے ہیں، ہیضہ پھیلتا ہے تو ایک دم تمھارا صفایا ہو جاتا ہے۔ اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ اپنے مالکوں کے اس برتاؤ سے تم مطمئن ہو؟"

"نہیں نہیں۔ بھگوان کی سوگند نہیں" رتن نے کہا۔

"پر صاحب ہم کر ہی کیا سکتے ہیں" ایک باہر سے آیا ہوا قلی بولا۔ "آپ پڑھے لکھے ہیں، صاحب کی برابری کے ہیں۔ آپ اور صاحب لوگوں سے لڑ سکتے ہیں پر ہم کیا کریں، کس کے پاس فریاد لے کر جائیں؟"

"تم؟ تم انسان تو ہو، کیا عزت آبرو کو گھول کے پی گئے؟"

سوُدا نے غصے میں بھر کر کہا "کوئی تمہاری پگڑی اتارے تو اتارنے دو گے؟"

"نہیں" اس قلی نے جواب دیا۔

"تو پھر تمہیں کچھ اپنی عزت کا خیال بھی ہے؟ تمہاری آبرو کہاں گئی؟ تمہاری مردانگی کو کیا ہوا؟" سوُدا نے پوچھا۔

"میں تو مرد ہوں" رتن نے سینہ ٹھونک کر کہا

"اسی لئے تو نکالے گئے" منو نے چھیڑا "بڑے پہلوانی بگھارتے پھرتے ہو"

اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ سب لوگ ہنسنے لگے اور فضا کا تناؤ کم ہو گیا۔ پھر ہری تھکے ہوئے الفاظ میں دھیرے دھیرے کہنے لگا۔

"صاحب ہم لوگوں کو کسی نہ کسی کا کام تو کرنا ہی ہے۔ چمٹا صاحب نہ سہی کوئی اور سہی"

"ہاں ہاں کام تو تمہیں کرنا ہے اور چاہیے بھی۔ محنت کرنا بہت اچھا ہے مگر آج کل تو تم گیارہ گھنٹے پسینہ بہاتے اور تنخواہ نام کی پاتے ہو۔ اگر تم میری بات مانو تو تمہاری تنخواہ بھی بڑھ سکتی اور کام کے گھنٹے بھی گھٹ سکتے ہیں"

"آپ ہی بتائیے کیا کریں" ہری نے کہا

"تم سب کے سب مل سے باہر نکل آؤ، سب کے سب" سوُدا نے کہا "اور کام کرنے سے قطعی انکار کر دو جب تک تمہاری تنخواہیں نہ بڑھائی جائیں، کام کے گھنٹے گھٹائے جائیں، تمہارے بچوں کی تعلیم کا انتظام ہو اور تمہیں رہنے کو نئے گھر دیئے جائیں"

"تم ہڑتال کر دو" انگریز نے آہستہ سے کہا

"میں تو ضرور کروں گا" رتن نے کہا۔

"تم تو ہڑتال کر ہی چکے ہو" منو نے رتن کو پھر چھیڑا۔
باقی قلی خاموش رہے۔ یہ تو ان سب کو معلوم تھا کہ ہم سے بہت محنت لی جاتی ہے اور رفتہ رفتہ کر کے ہم بھوکوں مر جاتے ہیں مگر ہڑتال کے زمانے میں کیا ہوگا، زندگی کی ضروریات، بچوں کے اور اپنے لئے کھانے پینے کی چیزیں کہاں سے آئیں گی؟ ان کے دل گھبرا رہے تھے، خوف سے انھوں نے گردنیں جھکا لیں۔

"ہم لوگوں نے جو باتیں کہی ہیں، ان پر غور کرنا" مظفر نے سمجھاتے ہوئے کہا "اور رتن بھائی تم کل صبح آکر ہم سے ملنا۔ اس معاملہ کے متعلق بات چیت کریں گے"

"سلام صاحب" قلیوں نے کہا

"سلام، سلام، سلام" تینوں کمیونسٹوں نے سلام کا جواب دیا اور سیڑھی سے اترے۔ منو جوش اور اشتیاق سے پھولا نہ سماتا تھا۔

سودا، مظفر اور جیکسن نے مل کر آل انڈیا ٹریڈ یونین کونسل کے صدر کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ رتن کی طرف سے سر جارج وہائٹ ملز کے نام عرضی بھیجے۔ چنانچہ عرضی بھیجی گئی کہ رتن کو پھر سے رکھا جائے اور وہاں سے رتن کے نام آکر آیا کہ خود حاضر ہو کر منیجر سے بات کرے۔

یہ خط بھی سینکڑوں خطوں کے ساتھ مل میں پہنچا — سینکڑوں خط — کسی خط میں مل کے گوداموں میں روئی پہنچنے کی خبر تھی، تو کسی میں ولایت سے مشینیں آنے کی خبر، کہیں مرمت کے متعلق خطوط تھے۔ تو کہیں مختلف نمونوں کے دام وغیرہ دریافت کئے گئے تھے اور پھر سر جارج وہائٹ کی ذاتی ڈاک بھی بھیجی جانے والی تھی۔ ڈاک کی بہتات سے منیجر، مسٹر لٹل کا ناک میں

دم تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں سے شروع کریں۔ کسی خط پر "ڈیر سر" لکھا نظر آتا تو کسی پر "آنرڈ سر" ــــ کسی پر ہوتا "روئی کے سوگا نٹھوں کے متعلق"، تو کسی پر ہوتا "پیشگی شکریہ"، تھکن سے چور چور کبھی ان کی نگاہیں بار بار ریلوے گوداموں کے ان کلرکوں پر جا پڑتی تھیں جو بیٹھے بیٹھے پتلے گلابی کاغذ پر کاربن کے ذریعہ رسیدیں تیار کر رہے تھے۔ کبھی جمشید جی جیجی بھائی ملز کے کھردرے خطوط پر اور کبھی سر رگمینلڈ کے سفید دودھیا خط کے کاغذوں پر!

مسٹر لٹل طبیعتاً بھی ذرا بے چین واقع ہوئے تھے۔ اور بمبئی کی گھٹی ہوئی گرمی نے جس سے انکا چہرہ ہمیشہ پسینہ میں تر بتر رہتا تھا۔ ان کے اعصاب کو کوئی خاص سکون نہیں پہنچایا تھا۔ کبھی نگاہیں اٹھا کر چھت میں لگے ہوئے برقی پنکھے کو دیکھتے، کبھی اپنی کرسی کھسکاتے، کبھی کاغذات سرکاتے، حلق سوکھ گیا تو الیاجی چاہا کہ ایک گلاس وہسکی پی لیتے لیکن "ڈیوٹی از ڈیوٹی"۔ فرض آخر فرض ہی ٹھہرا۔ انھوں نے میز پر دوہرے ہو کر وہ کشتی کھینچی جس میں سب ڈاک چھانٹ کر رکھی ہوئی تھی کہ سب سے پہلے سر رگمینلڈ کے امکانات کو نمٹا دیا جائے۔

"اسکرو والا" انھوں نے آواز دی

ایک نوجوان ہندستانی کلرک سفید سوٹ اور کشتی نما سیاہ ٹوپی پہنے اندر داخل ہوا۔ اس قسم کی ٹوپی غالباً اس لئے پہنی گئی تھی کہ یورپین سوٹ کے مقابلہ میں بھارت ماتا کی عزت کا توازن قائم رکھے۔ بچپن میں اس نے ایک مرتبہ ہارنبی روڈ کے کنارے ایک صاحب کو یوں ہی طفلانہ تعجب سے گھورا تھا اور اس قصور پر مار بھی کھائی تھی اور اس مار کا اثر اب بھی اس کے سیاہ چہرے پر خوف کے آثار کی صورت میں جھلکتا تھا۔

"خدا کے لئے بیٹھ جاؤ! وہاں کھڑے کھڑے کیا مجھے گھور رہے ہو، مجھے اس سے پریشانی ہوتی ہے" مسٹر لٹل چیخے۔

"جی۔ جی۔ جی جناب" کلرک منہ ہی منہ میں بڑبڑایا، اس کا نچلے کا ہونٹ کانپنے لگا اور بھوری آنکھوں میں غیرت اور ڈر جھلکنے لگا۔

"لکھو" مسٹر لٹل نے کسی قدر پرسکون آواز میں کہا۔

کلرک نے سوچا کہ اب صاحب کا مزاج ٹھیک ہو گیا ہے، لہٰذا وہ میز کے پاس ہی ایک لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پنکھے سے نکلتے ہوئے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے اس کے جسم کی تپش کسی قدر کم ہو گئی۔ اس نے صاحب کو گھورنے سے بچنے کے لئے اپنی نوٹ بک پر نظر جما دی اور خط لکھنے پر تیار ہو بیٹھا۔

"آنکھیں تو کھول" صاحب گرجے اور اس زور سے گرجے کہ کلرک غریب ڈر کے مارے اچھل پڑا۔

"آنکھیں کھولو" صاحب نے لہجہ کسی قدر دھیما کر دیا۔ کیونکہ انھوں نے دیکھا کہ گھبراہٹ کے مارے کلرک کے آئے حواس بھی جا رہے ہیں۔

"شروع کرو۔ اوپر لکھو "نوٹس" ۔ عین اسی وقت ایک مکھی آکر صاحب کی ناک پر بیٹھ گئی۔ انھوں نے اسے اڑایا۔ اور بولنے ہی والے تھے کہ وہ آکر منہ پر بیٹھ گئی۔

"لال کاکا!" صاحب چیخے۔

"حضور" باہر سے ایک فرمانبردار قسم کی آواز آئی۔ ساتھ ہی ساتھ چپکا اٹھی اور ایک پارسی لڑکا اندر آیا جو ادھر ادھر چپٹیاں وغیرہ لے جایا کرتا تھا۔ وہ نیکر اور قمیص پہنے اور سر میں بہت سا تیل چپڑ کر سیدھی مانگ نکالے

تھا جس سے مضحکہ خیز طور پر ستم معلوم ہو رہا تھا۔

"یہ لو مکھی مارنے کا، اور کمرے میں جہاں بھی مکھی بیٹھے مارو"

"اچھا حضور" لال کاکا نے وہ چھڑی اٹھائی جس کے سرے پر چیتڑے کا ایک پان نما ٹکڑا لگا تھا۔

"اسکرو والا۔ لکھو"

کلرک نے کاغذ پر نسل چلانی شروع کی۔

"حال ہی میں کاروبار کا بازار مندا پڑ جانے اور سارے اوقات سکوں کے سلسلہ میں بحران پیدا ہو جانے کی وجہ، ڈائرکٹروں کا یہ بورڈ انہوں کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ اخراجات کم کرنے اور مشینیں چالو رکھنے کے لئے مجبوراً فیکٹری شارٹ ٹائم پر چلے گی۔ کوئی دوسرا نوٹس نکلنے تک، ہر مہینے کے آخری ہفتے میں کام نہیں ہوگا۔ اس ہفتے کی تنخواہ نہیں دی جائے گی لیکن مزدوروں کی بہبودی کا خیال کرتے ہوئے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ کچھ الاؤنس دیا جائے گا۔ یہ تبدیلی دسویں مارچ سے عمل میں لائی جائے گی۔

(دستخط) سر رگینلڈ وہائٹ بیرسٹ ایٹ لا

پریسیڈنٹ سر جارج وہائٹ ملز

مسٹر لٹل ابھی کلرک کا لکھا ہوا سننے ہی والے تھے کہ ایک مکھی آکر ان کے ماتھے پر بیٹھ گئی۔ انھوں نے قہر آلود نگاہوں سے لال کاکا کو گھورا۔ لال کاکا نے فوراً چیتڑے کا پٹہ صاحب کے ماتھے پر دیا۔ آخر صاحب نے اُسے مکھی مارنے کا حکم جو دیا تھا چاہے کہیں بھی ہو۔

"یو ڈیم فول۔ یو بلڈی لٹل فول" صاحب فوں فوں کرتے رہے ہاتھ سے ماتھا سہلاتے اور بائیں کو یوں ہی گھماتے اپنی کرسی سے اٹھے۔ وہ تو اسے

ٹھوکر مار کر کمرے سے باہر کر دیتے مگر ابھی اتنے ہی میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"ٹن ٹن ٹن۔ بجتی ہی گئی، بجتی ہی گئی۔

"ہلو۔ ہلو" صاحب نے کلرک کے ہاتھ سے ٹیلیفون کا چونگا جھپٹ لیا۔ سر جارج وہائٹ ملز، ان کا چہرہ غصے سے گلابی ہو رہا تھا اور جہاں چھڑے کا مٹرا کا لگا تھا وہاں تو بالکل سرخ ہو گیا تھا۔ "ہاں ... ہاں ... سر رگمینلڈ؟ ہاں ہاں میں نے ابھی وہ نوٹس لکھوایا ہے ... جمی کو بلا کر دیئے دیتا ہوں .. ہاں ہاں ضرور آیئے ... کس وقت ... لنچ سے پہلے ... درست ہے سر رگمینلڈ ... ہاں گرمی تو ہے ... پر آرڈر آ رہے ہیں برابر ... تو پھر ہم آپکا انتظار کریں گے ... خدا حافظ ...

"چل جا کے فوراً میں صاحب کو بلا کے لا، سؤر! صاحب لال کاکا پر گرجے جو دروازے میں کھڑا ڈر کے مارے تھرا رہا تھا۔ لال کاکا باہر بھاگا اور پھر فوراً ہی واپس آیا۔ "حضور صاحب آ ہی رہے ہیں"

"ہلو جمی! گڈ مارننگ، کل سے مل شارٹ ٹائم پر چلے گی"

"ان کالوں پہ لعنت" جمی نے کہا۔ "ایک بیگ؟"

"وہ رہا الماری پہ! مجھے بھی دینا۔ بڑی پیاس لگی ہے۔ اُف"

"پر یہ معاملہ کیا ہے" جمی نے اپنی گنجی چندیا پہ سے پسینہ پونچھ کر وہسکی کی بوتل سنبھالی۔

"اسکردو والا نوٹس چھاپ رہا ہے" مسٹر لٹل بولے۔

"اچھا تو پھر اسی بات پہ" جمی نے خالص وہسکی کا ایک گلاس لٹل کو تھماتے ہوئے کہا۔

"رگبی یہاں کھانے کے بعد آنے والے ہیں" فیجر نے جمی کو خبردار

کیا: "اپنے حواس ذرا درست رکھنا"

"تمھارا سر" جمی نے جواب دیا: "حساب تمھیں دینا ہے کہ مجھے! مجھے کچھ مشینیں چلانی نہیں ہیں۔ وہ خود ہی چلتی رہتی ہیں"

اور اس بات کا خیال رکھنا کہ ریگی کے چلے جانے کے بعد گلیوں کو نوٹس ملے" مسٹر ٹل کہنے لگے: "ان میں بعض کو عجیب عجیب قسم کی شک ہے"

"نہیں جی۔ بس ایک ہی شکی تھا۔ اسے میں نے نکال باہر کر دیا، لال جھنڈے والوں کے ساتھ رہ رہ کر کھال ہی میں نہیں رہتا تھا۔ ویسے کام خوب کرتا تھا لیکن ہم یہاں قانون شکنی برداشت نہیں کر سکتے"

"اچھا تو آج صبح آل انڈیا ٹریڈ یونین کے دفتر سے اسی کے لئے درخواست آئی ہے کہ اسے بحال کر دیا جائے۔ میں تم سے پوچھنے ہی والا تھا۔ یہ سور، بے ایمان بڑی تیزی سے لوگوں میں بے چینی پھیلا رہے ہیں۔ تعجب ہے کہ حکومت کچھ کرتی کیوں نہیں"۔ اب اس کے دو حصے ہو گئے ہیں۔ پرانی یونین لالہ اونکار ناتھ نے قائم کی تھی اور یہ نئی لال جھنڈے والی یونین کسی انگریز جیکس نے قائم کی ہے۔ جو مانچسٹر سے آیا ہے"

"ابھی سب کو گولی ماردی جائے گی۔ دیکھتے جاؤ۔ یہ سور کہیں کے" ٹل صاحب چیخ اٹھے۔

اتنے میں باہر سے موٹر کے تیز ہارن کی آواز آئی۔ ٹل صاحب اچھل پڑے اور باہر دوڑے۔ جمی نے جلدی سے گلاس الماری میں سرکا دیئے، اور اپنے حواس درست کرتے ہوئے چیک اٹھا کر باہر برآمدے میں نکل آئے، "گڈ مارننگ ٹل۔ گڈ مارننگ جمی" "سر گلینڈ کی موٹر کی، اور دی

پہنے ہوئے انگریز شوفر نے دروازہ کھولا، اور ادھیڑ عمر کا چھوٹا موٹا بیرونٹ اس میں سے برآمد ہوا، جہاں دیدہ صورت، تنی ہوئی، کھنچی ہوئی سبز رگیں۔

"نوٹس لگا دیا گیا اور سمجھا دیا گیا جمی؟"

"جی نہیں۔ میں بس ابھی اعلان کرنے ہی والا تھا"، جمی کو اپنی گنجی کھوپڑی پر دھوپ کی تپش محسوس ہو رہی تھی کیونکہ وہ ننگے سر ہی باہر نکل آئے تھے۔

"اگر اجازت ہو تو یہ کہوں کہ آپ کی بیوی کچھ زیادہ کپڑے پہنا کریں"

سر ریگینلڈ نے فورمین کے بنگلے کی طرف مڑ کر کہا۔ وہاں مسز جمی صرف ایک ڈریسنگ گاؤن پہنے سر ریگینلڈ کی آمد کو بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں۔

جمی کا چہرہ سرخ ہو گیا، اس نے غصے سے اپنے بنگلے کی طرف دیکھا اور پھر معذرت کے ساتھ بڑے صاحب کی طرف۔

"اچھا تو لٹل"، سر ریگینلڈ کے مصنوعی دانت کٹکٹا رہے تھے، لال کاکا نے دردانے کی چک اٹھائی اور یہ عظیم الشان ہستی اور ساتھ ہی ساتھ بہت سی مکھیاں بھی اندر داخل ہوئیں۔

"اچھا تو سنو! بورڈ آف ڈائرکٹرز کے وہاں سے خبر آئی ہے کہ گھر (یعنی ولایت) پر بھی اسی قسم کی مشکل اور بحران درپیش آ رہا ہے۔ اور کمپنی کے مفاد کی خاطر صرف اسی مل میں نہیں بلکہ کلکتہ کی جوٹ ملوں اور مدراس کی کانوں کے متعلق بھی ہمیں یہی فیصلہ کرنا پڑا ہے تاکہ حصہ داروں کا فائدہ بحال رہ سکے میں کلائیو اسٹریٹ سے ایک تار کا منتظر ہوں کہ کیا صورت ہو سکتی ہے۔ اگر یہ کمبخت بحران جاری رہا تو ..."

"ڈائریکٹرز تمام حساب کی پڑتال کر رہے ہیں"، لٹل بیچ میں بولے

"اور رجسٹر گئے ہوئے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ہم لوگ کافی محفوظ ہیں۔ پچھلے ماہ کافی آرڈر آئے ہیں، لیکن باہر کے مال سے مقابلہ ذرا سخت ضرور ہے"

"میں وائسرائے کے پاس ایک وفد لے کر جا رہا ہوں کہ باہر کے آئے ہوئے مال پر بھاری محصول لگایا جائے" سر ریگنیلڈ نے جواب دیا۔ لیکن حکومت حالات سے خوف واقف ہے۔ لارڈ والور ہیمپٹن بڑے سیاستداں ہیں۔ اور وہ لیے لندن میں بھی جو ہمارا آدمی ہے وہ بڑا ہوشیار ہے، برطانیہ کو سنگاپور والا معاملہ طے کر کے ہمارے جہازوں کے لئے سمندر میں محفوظ رہنے کا انتظام کرنا چاہیے لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ ہندستانی دن بدن سر چڑھتے جا رہے ہیں اور گھر پر بھی جو سوشلسٹ ہیں ... ان گاندھی والوں سے بڑی مصیبت ہے ... تم نے سنا؟ کہ ہماری اسٹیفنس لز کو جمشید جی جیجی بھائی والوں نے خرید لیا؟ اب موتی صنعت میں ہمارے ۲۵ فیصدی نفع کے مقابلے میں ہندستانیوں کا تقریباً ۷۵ فی صدی ہو گیا۔ بہت برا ہوا۔ مگر ... ... یہ سب اس پر منحصر ہے کہ" اور انھوں نے اپنی گھڑی نکالی "مجھے دیر ہو رہی ہے ایک جگہ جانا ہے۔ مجھے حساب بھیجدینا۔

"اچھا" پھر وہ مڑے، منیجر صاحب نے چک اٹھائی اور وہ "خدا حافظ۔ گڈ بائی۔ گڈ بائی" کہتے باہر نکل آئے جیسے اس درمیان سب کچھ بھول چکے ہوں۔

شارٹ ٹائم کا اعلان سن کر قلی چاروں طرف سے جمع ہو گئے تھے اور چٹا صاحب کو گھیرے ہوئے تھے۔ انھوں نے سیاہ لمبی موٹر کو مل کھاتے ہوئے دیکھا، اور اس کے پیچھے دوڑے کیونکہ ان کو خیال تھا کہ مل کا مالک ان کی قسمت کا فیصلہ کر کے اس میں بیٹھ کر روانہ ہو رہا ہے۔ اگر کار نکل نہ گئی ہوتی

تو وہ اس کے پیروں پر گر پڑتے اور اس سے ہاتھ جوڑ کر التجائیں کرتے۔ اب وہ سب کے سب چٹا صاحب کے سامنے سر بجود ہوئے اور ان کی منت سماجت کی کہ مل کو شارٹ ٹائم پر نہ چلائیں۔ چٹا صاحب نے گالیاں دینی شروع کیں اور دھمکانے لگے کہ اگر کوئی بھی کلوٹا ان کے پاس آیا یا انھیں اپنے گندے ہاتھوں سے چھونے کی کوشش کی تو وہ پیٹ ڈالیں گے۔ قلیوں نے منت خوشامد کی، روتے پیٹے ہاتھ جوڑے اور ان کے سامنے سر کے بل ہو ہو گئے۔ کیونکہ انھیں یقین تھا کہ وہی ان کے لئے خدا کا سا اقتدار رکھتے ہیں اور انھیں بنا یا بگاڑ سکتے ہیں۔ لیکن چٹا صاحب ان سے جان چھڑا کر اپنے بنگلے میں پناہ گزیں ہو گئے۔ نادر خاں نے سب کو بھگا دیا۔ اور مجمع کو تتر بتر کر دیا۔ منو کو ڈائرکٹروں، حصہ داروں اور بحران و حرمان کا تو کچھ علم نہ تھا، اس نے سمجھا کہ رتن کے برطرف ہونے کی وجہ سے یہ سب قصہ برپا ہوا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ چٹا صاحب کے بنگلے پہ چپکے سے جائے گا اور ان سے درخواست کرے گا کہ رتن کو پھر سے رکھ لیں۔ سب سے چھپ کر وہ فیکٹری کے گودام میں گھس گیا، جو شیڈ کے پیچھے پانی کے پمپ کے پاس ہی تھا۔ گودام کے آخری کونے سے ایک دیوار کود کر چٹا صاحب کے باغ کی ٹٹی پھاندی جا سکتی تھی، دوڑتا ہوا وہ پمپ تک پہونچا اور پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کوئی اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے یا دیکھ تو نہیں رہا ہے — نہیں — اور منزل بالکل سامنے ہی نظر آ رہی تھی۔ اس نے ٹٹی کے نوکیلے بانس پہ بایاں ہاتھ رکھا اور گلاب کی خاردار جھاڑی کو پھلانگ کر اس طرف جا کودا۔ باغ کی رتیلی روش پر کھڑا وہ کچھ دیر سوچتا رہا کیونکہ برآمدہ تو نظر آ رہا تھا لیکن چٹا صاحب تک کیسے پہنچا جائے۔ یکایک چٹا صاحب کا بھاری بھرکم جسم برآمدہ میں دکھائی دیا۔ اور منو کو آگے

بڑھنے کی ترغیب ہوئی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا اور وہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر ان میم صاحب کے سامنے جا پہونچا جنھیں اس نے فورمین کی بیوی سمجھا۔ نیلی ٹامس ایک سوکھی سی پستہ قد عورت تھی، بھورے بالوں میں کہیں سفید بال چمک رہے تھے۔ اپنے دبلے پتلے ہاتھوں میں ایک سوئٹر لئے جلدی جلدی بُنے جا رہی تھیں، آرام کرسی کے تختوں پر پاؤں پھیلائے بیٹھی تھیں۔ منوان کی اس بے حجابی پر ششدر رہ گیا۔ اور ایک لحظ کے لئے اپنی جگہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پھر وہ اپنا ہاتھ ماتھے تک لے گیا اور بولا "سلام"

"سلام" میم صاحب نے دھیرے سے کہا اور پھر اُدھر مڑیں جدھر چمٹا صاحب کھڑے اپنے لئے وہسکی کا پیگ اُنڈیل رہے تھے اور کہنے لگیں "کیا پیارا لڑکا ہے! کیسا پیارا لگتا ہے۔ تم ہو کہ شراب میں دھت ہوئے جا رہے ہو اور تمھارا کوئی نوکر تم سے ملاقات کرنے آیا ہے"

جمی ٹامس نے ایک دم مڑ کر دیکھا اور ہاتھ میں جو وہسکی کی بوتل لئے تھے وہ تان کر منو کو کھینچ ماری، کیونکہ ان کو فوراً یہ شبہ ہوا کہ یہ قلی ضرور چھری یا خنجر لے کر انھیں مارڈالنے اور اس طرح دوسرے قلیوں کا بدلہ لینے کے لئے آیا ہے۔

"پولیس! پولیس، قتل۔ خون ہو گیا" نیلی ٹامس کرسی سے اچھل کر چیخنے لگیں۔ اس پر چمٹا صاحب آپے سے باہر ہو گئے اور مکا تانے اپنی بیوی کی طرف لپکے لیکن پھسل کر دھڑسے زمین پر آ رہے اور زمین ہی پر مکے مارنے لگے۔ نیلی نے اس درمیان تڑے پڑے چائے کی کیتلی اٹھالی اور اپنی حفاظت کے لئے ان کی طرف پھینکی۔ منو (رفوچکر ہو گیا) بگٹٹ وہاں سے بھاگا۔ لیکن لٹل صاحب "پولیس۔ پولیس" اور "خون۔ خون" کی آواز

سن کر دوڑ پڑے "ہوا کیا؟ بات کیا ہے" وہ پوچھنے لگے۔

نیلی اپنی جگہ سے تیزی سے اٹھیں اور اوسان قائم کر کے کہنے لگیں "بات یہ ہوئی جناب کہ میں بیٹھی بن رہی تھی اور یہ شراب کے نشے میں دھت اندر آ گئے اور کہنے لگے کہ مجھے کچھ اور کپڑے پہننے چاہئیں تھے اور زیادہ ستر پوشی کے ساتھ بیٹھنا چاہئے تھا اور پھر بوتل میں سے اور شراب انڈیلنے لگے۔ اتنے میں ایک لڑکا ان سے ملنے آ گیا۔ شاید فیکٹری کا کوئی قلی ہوگا تو یہ آپے سے باہر ہو گئے۔ اور اس پر بوتل کھینچ ماری۔ وہ بچارا کلوٹا مرہی گیا ہوتا وہ تو میں ایک دم "پولیس۔ پولیس۔ خون۔ خون" چلا اٹھی۔ تو یہ مجھ پر مسکرا کر لپکے اور پھسل گئے ... "

مسٹر لٹل نے بھویں سکیڑیں اور نیلی نے سانس لے کر اپنی باقی ماندہ داستان کہنی شروع کی "میں نے ان سے کتنی دفعہ کہا کہ لوگوں کو لاتوں اور ٹھوکروں سے نہ مارا کرو اگر اس لڑکے کے لگ جاتی تو؟ خیر جو ہوا سو ہوا"

مسٹر لٹل ابھی تک ذرا احترام کے ساتھ خاموش بیٹھے تھے لیکن اب ان کے چہرے پر کچھ کھوئے کھوئے سے آثار پیدا ہونے لگے۔ اور وہ ان دونوں کے سامنے مجسم سوالیہ نشان بنے کھڑے رہ گئے۔

"پھر میں نے اپنا بچاؤ کرنے کے لئے ان کو مارا۔ ان کے ساتھ رہنے میں میری زندگی خطرے میں ہے۔ میں ان کو چھوڑ دوں گی۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا۔ اور پھر وہ دل خراش سسکیاں لے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

اس دن دوپہر بھر، سرجارج وہائٹ ملز کے سارے قلی بھوتوں کی طرح مل کے چاروں طرف کے میدانوں میں ادھر اُدھر مارے پھرتے رہے

وہ اپنا واحد حق، کام کرنے کا حق چھن جانے پر سناٹے میں آ گئے تھے ۔۔۔ کام جس کے معنی روٹی تھے، کام کا چھن جانا جس کے معنی فاقہ کشی تھے۔ انھوں نے کام کرنے سے کب انکار کیا تھا؟ وہ تو محنت کرنے کے لئے سر کے بل جا سکتے تھے، ہر قسم کی محنت ——— گوداموں کی روئی صاف کرنا۔ مشینیں چلانا، فیکٹری کا فرش جھاڑنا، روئی کو کپڑے کی شکل میں تبدیل کرنا۔ اگر تنخواہ ملتی جاتی تو وہ ہر طرح کی محنت پر تیار تھے، فورمین کی گالیاں دینے پر تیار تھے، خراب کپڑے کے دام اور سود کا روپیہ دینے پر راضی تھے اگر ان کے دوزخ بھرنے کو دال چاول اور مکان دار کو دینے کو کرایہ ملتا رہتا۔ لیکن شارٹ ٹائم کے حکم نے تو غضب کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اچانک موت نے آ دبوچا۔ زندگی کی وہ تھوڑی سی حرارت جس کے بل پر وہ چل پھر بھی سکتے تھے، وہ بھی سرد پڑ گئی۔ اب تو صرف سوکھے، چپٹے، ہڈی چمڑا انسانوں کا ایک گروہ رہ گئے جو ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا۔ آنکھوں میں گڑھے، گال اندر کو دھنسے ہوئے، سینے دبکے ہوئے۔ ان کی بدبختی نے اب درد کے احساس کو بھی مٹا دیا تھا اور وہ اپنی قسمت پر شاکر بے پروائی سے ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے،

"میں آج چمٹا صاحب کے یہاں گیا تھا کہ تمہیں بحال کر دیا جائے" منو نے رتن سے کہا "لیکن وہ اس قدر ناراض تھے کہ مجھ پر ایک بوتل ہی کھینچ ماری۔ معلوم ہوتا ہے وہ تم سے بہت ہی خفا ہیں، جبھی تو ہم سب کو شارٹ ٹائم کا حکم دیا گیا ہے"

"اے احمق! مجھ پر وہ کیا خفا ہوں گے۔ یہ تو دراصل صاحب کی لاپرواہی ہے جس سبب سے یہ حکم نافذ کیا گیا" رتن نے جواب دیا "تم میرے ساتھ میٹنگ میں چلنا پھر تم سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔ تمام فیکٹریوں کے قلی وہاں جمع ہونے والے

ہیں اور ہڑتال کا اعلان کیا جانے والا ہے "

"اچھا!" منو نے کہا "تو پھر میں نے چمٹا صاحب کو ناحق ہی قصوروار سمجھا"

"نہیں ناحق کیوں" رتن غصہ میں بھر کر چیخا "وہ بے ایمان تو بدمعاش ہے ہی۔ تم دیکھتے جاؤ کیسا اس کا سر توڑتا ہوں۔ اور وہ بڑے صاحب جو موٹر میں بیٹھ کر آتے اور ہم سب کی تنخواہ کاٹتے ہیں۔ ان کا بھی سر توڑ دوں گا"

ہری کمر جھکائے اپنی ٹیڑھی ٹانگیں گھسیٹتا ان لوگوں کے پیچھے ہی پیچھے چلا آرہا تھا، اس کے دل میں بھرا ہوا غصہ رتن کے الفاظ سن کر ابھر آتا تھا مگر اپنی مصیبتوں کے بوجھ سے پھر دب جاتا تھا۔ اور قلی بھی ہری کی طرح خاموش بنے ہوئے مٹی میں پاؤں تھپتھپاتے چلے جارہے تھے، کبھی سر ہلا کر ایک دوسرے کو کچھ کہتے اور کبھی ہاتھ ہلا ہلا کر مایوسی اور پریشانی کا اظہار کرتے جب یہ جم غفیر آل انڈیا ٹریڈ یونین کے احاطے میں پہنچا تو سورج بلوں کی چمنیوں پر اپنی تیز قہر آلود کرنیں برسا رہا تھا۔ اور دھوپ میں کھڑے ہوئے، مقرروں کا انتظار کرتے ہوئے قلیوں کے سائے زمین پر پڑ رہے تھے۔ بہت سے لوگوں کی امید بھری اور ڈری ہوئی کانا پھوسی کی آوازوں کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ مجمع کے بیچوں بیچ سے کسی افسر کی آواز ایسی گونج رہی تھی۔ جیسے کھلے آسمان پر پتنگ یا کوئی گوّا اڑ رہا ہو۔ کہیں سے ایک نعرہ بلند ہوا۔

"تنخواہ کٹائی مردہ باد" اور تھرتھراتی ہوئی فضا میں گونجتا ہوا کسی اڑتے پرندے کی مانند افق میں گم ہوگیا۔ تمام انسانوں کے نعروں کی ہم آہنگی سے ان کی غریبی اور بے کسی پھوٹنے لگی، گندی چالوں کے اِن

باسیوں کی درد بھری آواز ——— جن میں کمزور نوزائیدہ بچے، ننگے پیٹ نکلے ہوئے بچے، ماتا کے داغوں، پھوڑے پھنسیوں سے لدے ہوئے نوجوان بوڑھے مرد جن پر جوانی کبھی آئی ہی نہ تھی۔ عورتیں جن کے پیٹ ہمیشہ پیدا ہونے والے بچوں کے بوجھ سے جھولتے رہتے تھے، ضعیف پوپلے بڈھے جن کے دھنسے ہوئے چہرے اور لٹکے ہوئے بدبودار جبڑے خود اپنے ہی بال بچوں کے تمسخر کا شکار بنے رہتے تھے ——— یہ سب شامل تھے۔

"یونین جیک مردہ باد۔ لال جھنڈا زندہ باد" کے نعرے لگنے لگے۔ اور یکایک سارے مجمع پر خاموشی چھا گئی جیسے ایشیا کی راتوں کا سناٹا کسی بھینگر کے بولنے سے اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ ان نعروں نے لوگوں کے دلوں کی اس نفرت کو اور بھی ابھار دیا جو دبی ہوئی تھی۔ ان کے چہرے دمکنے لگے اور آنکھوں اور لبوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

"یہ کل جگ ہے بھائی!" کسی بڈھے مزدور نے گویا یہ الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکال کر کہے۔

"بے شک" ایک ادھیڑ آدمی بولا "اس زمانے میں بھلا ہم لوگ کیسے جی سکتے ہیں"

"تنخواہ کم ہونے کی مخالفت کر کے جی سکتے ہیں"۔ ایک نوجوان بولا۔

"اے"۔ ایک بڈھا بولا "آج کل کے چھوکروں کو ذرا کسی کا لحاظ نہیں رہ گیا ہے"

"دادا! تمہیں تو میں روز صبح ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتا ہوں۔ ہے نا" نوجوان نے جواب دیا "لیکن موٹر والے بڑے صاحب کے سامنے میں کیوں

جھکوں؟ وہ تو مزے سے موٹر پر لدا پھرتا ہے اور ہم ریت بھری سڑک پر ننگے پاؤں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اوپر سے اس نے بل کو بھی شارٹ ٹائم کر دیا۔

"ہاں یہ تو سچ ہے۔ وہ بڑا بُرا مالک ہے۔ میرے بچوں کے پاؤں میں جوتا تک نہیں۔ ابھی اس دن چھوٹی لڑکی کے پاؤں میں شیشہ چبھ گیا، اور اب ڈاکٹر کہتا ہے کہ پاؤں کاٹا جائے گا" بڈھے نے نوجوان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"یہ انگریز سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ تو کوڑیوں پر اپنی گندگی کر سکتے ہیں، اور خود اپنی لیڈیوں کے ساتھ مزے میں گپ شپ کرتے موج اڑاتے رہتے ہیں"۔ نوجوان نے ذرا تمسخر سے کہا۔ اور پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا "مگر ہم سب تو یونین کے ممبر ہیں۔ دیکھا چاہیئے یونین اس کے متعلق کیا کرتی ہے"

سب طرف سے یہی نعرہ بلند ہونے لگا "یونین کیا کرے گی؟

"یونین کا کیا فیصلہ ہے۔ یونین کیا کرے گی" مجمع میں سے جوشیلے لوگ چلانے لگے۔

"خاموش" رتن نے کھڑے ہو کر کہا "یونین کے صدر لالہ اوتکا ناتھ تقریر کریں گے۔ پھر سیوا صاحب لال جھنڈے والے، مسٹر مظفر اور جیکسن صاحب بات کریں گے۔ آیئے صدر صاحب، آیئے لیڈر صاحب، آیئے صدر صاحب" اور رتن کا چہرہ جوش و خروش سے سرخ ہو گیا۔

"آیئے صدر صاحب" سنو نے اپنے ہیرو رتن کی آواز دُہرائی، "آیئے صدر صاحب" باقی تمام لوگوں نے بھی وہی نعرہ اُٹھا لیا۔

لالہ اوتکار ایک پستہ قد صاف ستھرے سے آدمی تھے، کھدر سلک کی دھوتی اور کرتا پہنے اسٹیج پر تشریف لائے۔ ان کی عمر تو کوئی چالیس برس کی ہوگی لیکن بال قبل از وقت سفید ہونے شروع ہو گئے تھے اور قیمتی عینک کے نیچے سے ان کی آنکھوں کی جھریاں صاف نظر آتی تھیں۔ ان کا نچلا ہونٹ ایک تمسخر آمیز مسکراہٹ سے ہمیشہ سکڑا رہتا تھا، اور ہونٹ کے اس طرح سکڑنے سے اُن کے پورے، پتلے دبلے، صفا چٹ چہرے پر ایک عجیب مغرورانہ فضا چھائی رہتی تھی جو ان کے آکسفورڈ کے زمانے کے حالات عیاں کرتی رہتی تھی۔ بات یوں تھی کہ وہاں انھوں نے اس امید پر سوشلسٹ پروگرام اختیار کیا تھا کہ غالباً گورنمنٹ یا گاندھی جی انھیں کافی دے دلا کر بجھانے بجھانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن امید بر نہ آئی۔ چنانچہ اب وہ بھارت ماتا کی آغوش میں واپس آ گئے تھے اور انگلستان سے جو کچھ جدت حاصل کر کے آئے تھے وہ بھی منقطع کر دی تھی، اگرچہ وہ کہتے یہی تھے کہ سرمایہ و محنت کے متعلق ہندستان کے قدیم روایات کو بیان کر کے وہ مغرب و مشرق کے پیغامات کا امتزاج کر رہے ہیں۔

"بھائیو"، انھوں نے بڑی شان سے کہا۔ لیکن شان کچھ زیادہ نہ چلی۔

"ہڑتال کے متعلق کیا رائے ہے صدر صاحب"، رتن نے اسٹیج کے پاس سے کہا۔

"کیا یہی وہ صاحب ہیں جنھوں نے اُس دن تم سے ملنے سے انکار کر دیا تھا جب تم نکالے گئے تھے؟"، منو نے رتن کا کرتا پکڑ کر ہلایا۔

"ہاں"، رتن نے منو کے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دیا "ہاں تو صدر صاحب کیا بات ہے؟"

"رتن بھائی، بیٹھ جاؤ" مظفر نے اسٹیج کے پیچھے سے کھڑے ہو کر کہا: "سب لوگ صدر صاحب کی بات سنو"

"اچھا" اور رتن بیٹھ گیا۔

"بھائیو" اونکار ناتھ نے پھر کہنا شروع کیا: "ہر زمانہ میں صنعتی اور غیر صنعتی، منظم یا غیر منظم محنت، دولت کی پیداوار کے لئے ایک ضروری ذریعہ رہی ہے۔ قدیم ہندستان میں ملکی اقتصادیات اور مالک و مزدور کے تعلقات کے مرحلوں اور منزلوں کو بہت اہمیت دی جاتی تھی اور ان کو تسلیم کیا جاتا تھا اور وہ جو قدیم مثل ہے کہ مزدور کو قدرداں مالک اور مالک کو وفادار اور ذہین مزدور نصیب ہونا ناممکنات سے ہے۔ تو اس مثل میں بڑی حد تک سچائی پائی جاتی ہے۔۔۔ مسٹر رادھا کمد مکرجی ... "

"تنخواہ گھٹنے کے متعلق یونین کیا کرے گی" رتن اس دن جو دلیت اٹھا چکا تھا اس سے وہ اور بھی بپھرا جا رہا تھا۔

"صرف بُرے مالک ہی اپنے مزدوروں سے حد سے زیادہ کام لیتے ہیں، اور ان کو ایسی امیدیں دلاتے رہتے ہیں جو کبھی پوری ہی ہونے میں نہیں آتیں۔ ان کی تنخواہیں دبا لیتے ہیں یا اٹکائے رکھتے ہیں" صدر صاحب نے اپنے اسلاف کے فلسفیانہ طریقے پر اپنی تقریر جاری رکھی "اور صرف بُرے ہی مزدور ہیں جو کام کے دوران میں تنخواہ بڑھوانا چاہتے ہیں اور وہ مالک بھی بُرے ہیں جو مزدوروں کو ان کی محنت کا پورا معاوضہ نہیں دیتے"

"بڑے مزدور!" رتن نے بڑبڑا کر دوہرایا۔

"لیکن ہڑتال کا کیا ہوگا؟" کوئی چلایا "یہ جو شارٹ ٹائم کا نوٹس نکلا ہے اس کے متعلق یونین کیا کرنے والی ہے؟"

صدر صاحب نے اپنا سکڑا ہوا نچلا ہونٹ ذرا نفرت سے اور سکیٹرا ۔ "آل انڈیا ٹریڈ یونین فیڈریشن، مل مالکوں سے بات چیت شروع کرے گی"

"آپ نے پچھلے سال ٹاٹا کے یہاں بھی یہی کیا تھا اور اس سے خاک بھی کچھ نہ ہوا" رتن گردن بڑھا کر چیخا۔

"بیٹھ جاؤ" صدر صاحب نے حکم دیا "بات نہ کاٹو۔ بمبئی کے مل مالکوں کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ جلدی کرنے سے یہ بدتر حالت اور بھی بدتر ہو جائیگی میں گفت و شنید شروع کرنے کے موافق ہوں۔ آج ہزاروں بے روزگار مزدور بمبئی کی سڑکوں پر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اور ویسے بھی کانگریس کی اجازت اور ورکنگ کمیٹی کی صلاح کے بغیر ہمیں ہڑتال نہ کرنی چاہئے"

"کانگریس وانگریس ہم نہیں جانتے۔ لیکن شارٹ ٹائم پر ہم کبھی کام نہ کریں گے" کئی آوازیں بیک وقت بلند ہوئیں۔

"خاموش" صدر صاحب چیخے "میں نے ولایت میں بھی مزدوروں کا طریقہ دیکھا ہے۔ آخر انگریز مزدوروں کی طاقت کس بات سے بڑھی؟ — سنگھٹن سے۔ میرے آنے سے پہلے ہندستان میں ایک بھی ٹریڈ یونین نہیں تھی۔ کسی نے مزدور سبھا کا نام بھی نہ سنا تھا۔ میں نے تم لوگوں کے لئے اتنی محنت کی ہے اور تمہیں میری بات (رائے) ماننی چاہئے۔ اور صحیح طریقے پر عمل کرنا چاہئے۔ مل مالک تمہیں کام دیتے ہیں۔ وہ تمہارے دشمن نہیں ہیں، اگر انھوں نے شارٹ ٹائم کا نوٹس دیا ہے تو تم کو عقلمندی اور تنظیم سے کام لینا چاہئے۔ یونین تمہارے فائدے کا کام کرتی ہے، اور حاکم و محکوم دونوں کی بہتری کے لئے سوچتی ہے، تمہیں یونین پر بھروسہ رکھنا چاہئے کہ وہ محنت

و سرمایہ کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم رکھے گی۔ تمھیں مجھ پر اور یونین کی کمیٹی پر اعتبار ہونا چاہیئے "

" بھائیو" سوداپیک کر بس پر چڑھ گیا اور صدر صاحب کو ایک طرف ہٹا کر کہنے لگا " ٹریڈ یونین کمیٹی کے ممبر سب یہاں موجود ہیں۔ میں بھی ان ہی میں سے ایک ہوں۔ اب ہم اس مسئلہ کا فیصلہ کریں گے۔ لالہ اوٹکار ناتھ کو مل مالکوں پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ ہے۔ وہ کہتے ہیں مل مالک تمھارے دشمن نہیں ہیں، لیکن یہ تمھارا ہی دل خوب جانتا ہے کہ مل مالک تمھارے کتنے دوست ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مزدوروں اور مل مالکوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ تم محنت کرتے ہو اور وہ تمھاری محنت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں "

" یہ بات ہے! بہت ٹھیک کہا " کئی آوازیں سنائی دیں " وہ چور ہیں، ڈاکو ہیں، لٹیرے ہیں جو مالا بار ہل پر بڑے بڑے بنگلوں میں رہتے ہیں اس روپیہ کے زور سے جو تمھاری محنت سے حاصل ہوتا ہے وہ دن میں پانچ دفعہ کھاتے ہیں اور شام کو لمبی لمبی موٹروں میں بیٹھ کر ہوا کھانے نکلتے ہیں۔ تمھارے رہنے کا ٹھکانہ نہیں، مٹھی بھر چاول تمھیں کھانے کو نہیں ملتے، تانگا تانتے ہو، کپڑا بنتے ہو۔ خاک دھول جھاڑتے ہو۔ تم مزدور ہو مزدور، لاکھوں محنت کش جو روزانہ فیکٹریوں سے گھسٹتے ہوئے باہر نکلتے ہو، تم قلی ہو، کالے آدمی، زمین کے گھنے والے، ایک ایک کمرہ میں بیس بیس کی تعداد میں رہنے والے، پھوس کے جھونپڑوں میں سڑنے والے انسان تمھاری ہڈیوں پر گوشت کا نام نہیں، بدن پر چیتھڑے، جسم میں دم نہیں۔ اور پھر بھی ہمارے دوست اوٹکار ناتھ صاحب کہتے ہیں تمھاری اور مل مالکوں

کی بات ایک ہی ہے،

"شاباش شاباش سودا صاحب"، رتن کی آواز گونجنے لگی۔ سودا صاحب کی جوشیلی تقریر سن کر سنو کا خون کھولنے لگا۔

"لالہ اور نکار ناتھ بہت امیر آدمی ہیں"، سودا نے پھر کہنا شروع کیا "وہ کیا جانیں کہ مفلسی کا بھوت تمہیں کیسی گندگی میں گھسیٹ کر لے جاتا ہے جہاں بھوک کے بچھو تمہیں ڈستے ہیں، جونکیں تمہارا خون چوستی ہیں اور مگرمچھ تمہیں ثابت نگل جاتے ہیں۔ تم میں سے کتنے ہیں جو اپنے یہاں کے فورمین کے چنگل میں نہیں پھنسے ہیں؟۔ تم میں سے کتنے ہیں جن پر سرمایہ دار اپنا غصہ نہیں اتارتے اب بھائی رتن ہی کو لو۔ یہ اپنے کام میں ہوشیار ہیں لیکن یہ اور ان کے ایسے کتنے ہی صرف اس قصد پر برطرف کر دیئے گئے کہ وہ فورمین کو کمیشن دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ تم سے کتنے ہیں جو تنخواہ والے دن باہر نکلتے ہی پٹھان مہاجن اور دوسرے سود خوروں کے پنجے میں نہیں پھنس جاتے؟۔ سود خور کبھی اصل روپیہ نہیں لیتے یہ بڑی مہربانی کرتے ہیں لیکن سود تو وہ برابر وصول کرتے رہتے ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی رقم بھی چند مہینوں میں بڑھ کر اتنا بڑا بوجھ بن جاتی ہے کہ تمہیں اپنی پوری پوری تنخواہ ان کے حوالے کر دینی پڑتی ہے، یہاں تک کہ تمہارے پیٹ بھرنے کو بھی کچھ نہیں بچتا۔ اور جب یہ نوبت پہونچ جاتی ہے کہ تم نہ سود دے سکتے ہو نہ اصل تو تم منہ چھپا کر اپنے دیسوں کو بھاگ جاتے ہو اور وہاں بھوکوں مرجاتے ہو۔ ارے تم کو کب عقل آئے گی؟ تم کب سمجھو گے کہ سینکڑوں برس سے تمہیں لوٹا جا رہا ہے، تم سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے"

سنو نے غور سے سودا کو دیکھا اور کان لگا کر ایک ایک لفظ سننے لگا۔

"دنیا میں صرف دو ہی طرح کے لوگ بستے ہیں۔ امیر اور غریب"
سودا نے تقریر پھر جاری کی "اور ان دونوں میں قطعی کوئی تعلق نہیں۔ امیر اور طاقتور، شان اور آن بان والے لوگ جن کی ساری ثنا فی کی بنیاد لوٹ، چوری اور جنگ پر منحصر ہے دنیا میں عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں اور آپ سے باہر ہوئے جاتے ہیں، تم غریب اور ذلیل و حقیر سیدھے بھولے بھالے اور دبو انسان ہو جن کا جسم و روح برباد کر دی جاتی ہے، حقوق چھین لئے جاتے ہیں، نہ تم خود اپنی عزت کرتے ہو نہ کوئی تمہیں پوچھتا ہے"

منو کو ایسا لگا کہ صدیاں گذر گئیں جب شام نگر میں، امیر و غریب کے تعلقات کے متعلق اس کے دل میں بھی اسی قسم کے خیالات پیدا ہوئے تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ ان خیالات کو سودا صاحب کی سی خوبی کے ساتھ اظہار نہ کر سکتا تھا۔

"اٹھ کھڑے ہو، اے بے نواؤ! اٹھو اور انصاف کی آواز بلند کرو خوفزدہ بدنصیبو، اٹھو اور اپنے حق کے لئے لڑو۔ آدمی ہو کر تم انسان پیدا ہوئے ہو، کیڑے مکوڑوں کی طرح فیکٹریوں میں ہرگز نہ گھسو! اٹھو اور زندگی کے لئے جد و جہد کرو ورنہ کچل دیئے جاؤ گے، مٹا دیئے جاؤ گے! اٹھو اور میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ کل سے ہڑتال کر دو۔ اور ہم تمہیں مل مالکوں سے یہ جنگ لڑنے میں سہارا دیں گے۔ آؤ اب میرے ساتھ اپنی مانگوں کو دہراؤ۔ نعرے بلند کرو"
ایک لحظہ کے لئے وہ رک گئے۔ سارا مجمع اٹھ کھڑا ہوا، جوش میں بھرا، بپھرا ہوا۔ اور سودا نے کہنا شروع کیا "ہم انسان ہیں بے جان مشین نہیں"
سب نے دہرایا۔

"ہمیں رشوت دیئے بغیر کام کرنے کا حق ملے"

"ہمیں رہنے کے لئے صاف ستھرے مکانات چاہئیں"

"ہمیں اپنے بڑے بچوں کے لئے اسکول اور چھوٹے بچوں کے لئے بچہ گھر چاہئیں"

"ہمیں کام بخوبی سکھایا جائے"

"ہمیں سود خوروں سے بچایا جائے"

"اگر شارٹ ٹائم ہو تو تنخواہ بڑھائی جائے یا الاؤنس دیا جائے"

"کام کے گھنٹے گھٹنے چاہئیں"

"ہمیں مستقل رکھا جائے تاکہ کوئی فورمین ہمیں نکال نہ سکے"

"ہماری یونین کو قانونی تسلیم کیا جائے"

مانگوں کے الفاظ گونج کر اینٹ پر کھپریلتے چلے گئے۔ پھر پہلے تو لوگوں کی زبانوں سے الفاظ اور جملے ٹوٹ ٹوٹ کر بہ مشکل نکلے جیسے نو سکھئے بچے کلاس روم میں اپنا سبق دوہرا رہے ہوں۔ پھر مجمع کے بھاری گلوں سے سودا کے نعروں کے سر پھوٹنے لگے۔ انجان الفاظ جوشیلے نعروں میں تبدیل ہو کر آسمان اور آفتاب تک بلند ہونے لگے۔ لوگ ادھر اُدھر آنے جانے لگے۔ سیاہ دہانے کھل کھل کر سانس لینے لگے۔ قلیوں کی آنکھوں میں جوش اور خوشی کے آنسو جھلکنے لگے اور سناٹے کے عالم میں سمندر کی سرسراتی ہوئی ہوا گھاس کے ٹہنیوں کو ہلاتی سنائی دینے لگی۔

یکایک مجمع کے کسی گوشے سے ایک زور کی چیخ سنائی دی اور ایک دبی ہوئی آواز بلند ہوئی "اٹھا لے گیا۔ اٹھا لے گیا۔ ارے میرے بیٹے کو کوئی اٹھا لے گیا۔ ہائے اب میں کیا کروں"

"ارے! اٹھا لے گیا" ساری بھیڑ میں ایک بھنبھناہٹ

ہونے لگی۔

"پٹھان اٹھالے گئے ہوں گے اور کون" کسی نے آہستہ سے کہا۔

"ارے یہ بے ایمان ظالم مسلمان ہندو بچوں کو چرائے جا رہے ہیں"

ایک لمحہ کو سکوت ہوا۔

"یہ ہے کیا؟" سوداگر نے چیخ کر کہا "بات کیا ہے"

صرف ایک قلی کے رونے اور کراہنے کی دبی دبی آواز آ رہی تھی۔ ایک عجیب سا ٹوٹا پھوٹا نالہ بلند ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی بھیڑیئے کی مادہ رو رہی ہو۔

"صاحب کوئی بچے کو اٹھالے گیا۔ ایک ہندو بچے کو کوئی مسلمان چرا لے گیا" کچھ قلی کہنے لگے۔ اور پھر مجمع پر خوف و نفرت کی فضا چھا گئی۔

"جاؤ اپنے گھر اپنے اپنے گھر جاؤ۔ یہ افواہ ہمارے دشمنوں نے پھیلائی ہے" سعودا نے زور سے کہا "اور کل سے کام پر مت جانا۔ ٹریڈ یونین کی طرف سے تم کو الاؤنس ملے گا۔ اور کل سب کے سب پھر یہاں جمع ہونا۔ جلوس نکالا جائے گا"

"لیکن صاحب ایک ہندو بچے کو چرا جو لیا گیا ہے" ایک آواز سنائی دی۔

"ایک ہی نہیں کئی ہندو بچے اسی طرح چرا لئے گئے ہیں" ایک اور آواز آئی۔

"بچے چرا لئے گئے۔ بچے چرا لئے گئے۔ یہ بے ایمان مسلمان ہیں

سر چڑھ گئے ہیں۔ یہ ہمارے دھرم کی ہتک ہے۔ سور کے بچے! حرامی کہیں کے! ہم انھیں ایسا مزہ چکھائیں گے کہ یاد کریں گے۔" افواہ اب کافی جم چکی تھی

"ارے جاؤ بھی بیوقوفو!" سودا نے چیخ کر "ہم سب معاملہ معلوم کرلیں گے۔"

"نہیں جی ہم ان لوگوں سے بدلہ لے کر رہیں گے۔ روپیہ لیتے لیتے اب ہمارے بچے بھی چھیننے لگے۔ واہ! ہم ضرور بدلہ لیں گے۔"

"ارے چپ بھی رہو بے وقوفو، کچھ سمجھتے بھی ہو۔" رتن لپک کر ڈائس پر آگیا "اگر تمھارے بچوں کو کوئی لے گیا ہے تو میں تمھاری طرف سے لڑوں گا۔ مگر پہلے گھر جاکر دیکھو تو سہی کہ سچ بات ہے کہ جھوٹ!"

"تم پتلی دال کے کھانے والے! کافر ہندو! ہم تمھیں بتائیں گے کہ ہمارے مذہب کی ہتک کرنا کیسا ہوتا ہے۔" ڈائس سے دور کچھ گھبن مجمع میں سے مسلمانوں نے طرح طرح کی صدائیں بلند کرنی شروع کیں، اور بہت سے ہاتھ ایک دوسرے سے الجھ گئے، پگڑیاں گھسیٹی جانے لگیں، لکڑیاں نکل آئیں۔

منو نے دوڑ کر رتن کا دامن پکڑا اور خوف سے تھر تھر کانپنے لگا، پیچھے مڑکر دیکھتا کیا ہے کہ سارا مجمع تتر بتر ہوگیا ہے اور طوفانی سمندر کی طرح لہروں پر لہریں اٹھ رہی ہیں اور کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ وہ خونزدہ ہوکر تھم گیا سینکڑوں جسم آپس میں ٹکرا رہے تھے، چاروں طرف سے ہجوم بڑھتا جارہا تھا تمھیں کھانے اور گالی بکنے کی آوازیں تیز تر ہوتی جارہی تھیں بس ایک ہی آواز صاف سنائی دیتی تھی "اٹھالے لئے۔ چرالے گئے"۔ اس چادر کے جو شیلے الفاظ منو کے دماغ سے ہوا ہوگئے اور اب وہ صرف ایک لوٹ

ایک ہنگامہ میں کھو گیا جہاں آنکھوں میں غیض چمک رہا تھا، ہتھیار جھلملا رہے تھے اور مختلف آوازیں دیوانہ وار چیخے جا رہی تھیں، اس کی روح سودا کی پرجوش اور دلکش تقریر کے سحر سے نکل کر خوف و ہراس کے اس سیاہ جادو میں پھنس گئی جو "اٹھالے گئے، چرالے گئے، کی بھیانک آوازوں سے چاروں طرف چھا گیا تھا۔ اس کے دماغ میں اور آنکھوں تلے یکایک وہ تصویر پھر گئی جب پربھا کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی، اور نیلی وردی والے پولیس کے سپاہیوں کو اپنے ڈنڈے گھماتے دیکھ کر تو اور بھی یہ دونوں واقعات بالکل ایک دوسرے سے ملتے جلتے معلوم ہونے لگے۔

"چرالے گئے! اٹھالے گئے۔ ہائے ہائے۔ سور کا بچہ کا فریبے یہ لے" کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

"تم گھر جاؤ" رتن نے منو سے کہا اور اس کے ہاتھ سے اپنا کرتا چھڑا کر فوراً بیچوں بیچ لڑائی میں کود پڑا۔

"رتن، ارے رتن۔ رتن" منو چیخا۔ لیکن نقار خانہ میں طوطی کی آواز بھلا کیا سنائی دیتی۔ وہ اسٹیج پر کھڑا ہو کر رتن کو پکارنے لگا اور پھر رات کے اندھیرے میں پتے ہوئے تانبہ رنگ میں اور چمکتے دانتوں والے چہروں میں ڈھونڈنے لگا کہ شاید کہیں ہری کی صورت دکھائی دے جائے۔

"کون ہو تم؟ ہندو کہ مسلمان؟" ایک لحیم شحیم پہلوان نے منو کے سر پر سوار ہو کر ڈنڈا گھماتے ہوئے پوچھا۔

ایک لحظہ کے لئے منو پر سکتہ سا طاری ہو گیا کہ اب موت آئی اس نے چیخنا چاہا، منہ کھل کر رہ گیا مگر آواز کو جیسے تالا سا لگ گیا۔ آنکھ بند ہوئی اور پھر کھل گئی۔ ایک لحظہ ٹھٹک کر وہ اسٹیج کے داہنی طرف کو دگر زناٹے

سے بھاگا۔ پیچھے پٹھان کی لکڑی زور سے اسٹیج پر لگتی ہوئی سنائی دی۔ سیوم کو بیچ میں سے چیرتا ہوا وہ بھاگا اور قلیوں کے اس مجمع میں جا ملا جو میدان سے واپس آرہا تھا۔

"یہ پٹھان لوگ مدتوں سے غریبوں کے بچے اٹھا اٹھا کر لے جا رہے ہیں" سنو نے جلدی جلدی چلتے ہوئے ایک قلی کو دوسرے سے کہتے سنا۔

"یہ مل مالک ان کو شکار کرتے ہیں، اور سرکار بھی ان ہی سے ملی ہوئی ہے" ایک تیسرا قلی بولا۔

"ہاں۔ ہاں۔ اور کیا" ایک دوسرا بولا "یہ پٹھان بچوں کو چرا چرا کر موٹروں میں ڈال کر لے جاتے ہیں اور سرکار ان کو روکنے کے لئے کچھ بھی نہیں کرتی۔ اب بھلا کیسے ہم اپنے بچوں کو ادھر اُدھر چھوڑ سکتے ہیں"

"لیکن پٹھان تو تمہارے دشمن ہیں ہی" ایک ٹریڈ یونین والا کہنے لگا "پچھلے سال جب تیل کی مل میں ہڑتال ہوئی تھی تو مل مالکوں نے دو سو پٹھان بلوا کر ہڑتال توڑوائی تھی۔ یہ سب کے سب ہڑتالی مزدوروں کے جانی دشمن ہیں، ان کو ذرا مزہ چکھانا چاہئے"

"چلو اس ساوی خاں کے یہاں چلیں جو سود پر روپیہ دیتا ہے۔ ذرا اس کا مزاج پوچھیں۔ بڑا اکڑتا پھرتا ہے" ایک نوجوان قلی نے کہا۔

سنو کا دل تو چاہا کہ اس قلی کے ساتھ جائے مگر پھر اُسے وہ وقت یاد آیا جب اس نے ہری کو پٹھان سود خوروں کے ہاتھوں پٹتے دیکھا تھا۔ وہ ان لوگوں کی بھیڑ میں سے گذرتا آگے بڑھا جو آپس میں بچوں کے چرائے جانے کی باتیں کر رہے تھے۔

اپنی گلی کے نکڑ پر اس نے کچھ لڑکوں کو آپس میں گتھم گتھا ہو کر لڑنے بازی کرتے دیکھا۔

وہ شہر کی رنگیلی سڑک پر ہو لیا اور جو چیز بھی سامنے آئی اس کی آڑ پکڑ تا گیا۔ رات صاف شفاف تھی، جیسے آسمان سے کوئی حور اتر کر اپنا چاند تاروں بھرے لاجوردی دوپٹے کا دامن اس تمام ظالم ابلتی ہوئی زمین کو اڑھائے ہو۔ اچھوتوں کے ایک محلہ سے جو سنتہ دھوبی تلاؤ پر نکلتا تھا منو کو معلوم تھا۔ وہ کیچڑ میں پھسلتا، گٹر میں بار بار لڑھکتا، تھکا ماندہ ایکہ دتہا سڑک کے آثار پر چلنے لگا اور اندھیرے میں ٹٹولنے لگا کہ شاید لیٹنے بھر کو کہیں جگہ مل جائے۔

جب منو نے شہر میں قدم رکھا تو اندھیرے آسمان پر مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ لیکن بمبئی کی زمین اسی طرح بھری پڑی نظر آ رہی تھی۔ پیچیدہ گلیاں اور راستے، اونچے اونچے دفاتر، ٹیڑھے میڑھے مکانات اور مندر، منارے اور یادگاریں ـــــ بمبئی جو تضاد اور افتراق کا ایک روح فرسا مجموعہ تھا، جہاں امیروں کی شان و شوکت کے ساتھ ہاتھیوں کی چنگھاڑ سنائی دیا کرتی تھی ـــــ بمبئی جو عیش و عشرت کا دیار تھا جہاں اخلاق کی تمام آہنی قدریں خاک میں مل جاتی تھیں اور بیماریوں کی شکل میں تبدیل ہو کر کوڑے کے ڈھیروں اور گھوروں پر نظر آتی تھیں ـــــ جہاں مہربان امیروں کا دھوکہ اور افتراء غریبوں کے مٹتے ہوئے جسموں اور پھوٹتے ہوئے زخموں میں جھلکتا تھا ـــــ ہاں وہی بمبئی ـــــ اس شام سرزمین بمبئی پر ایک عجیب و غریب ہلچل مچی تھی۔

یہ کیا ہوا؟ منو کو کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ ہوا کیا۔ وہ فیکٹری کے

اس میدان سے نکل بھاگا تھا جہاں دنگا شروع ہو گیا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ وہ تمام شور و شراب پیچھے چھوڑ گیا لیکن یہاں بھی وہی شور پکار مچی تھی بلکہ بڑی بڑی دیواروں سے گونج کر اس کی شدت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ مختلف گلیوں میں سے گذر کر، جہاں دو دو چار چار آدمی اپنے اپنے دروازوں پر اکٹھے ہو کر کھسر پھسر کر رہے تھے، بھنڈی بازار میں نکل آیا۔ یہاں لوگوں کے جوق کے جوق نکل کر بازار کے چوک میں جمع ہو رہے تھے۔ وہ بھیڑ میں شامل ہو گیا مگر ذرا الگ ہی الگ رہا۔ اس پر لوگوں کے انتشار کا اثر قطعی نہیں ہو رہا تھا البتہ اس کو یہ کرید ضرور لگی تھی کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ اور اسے جلد ہی معلوم بھی ہو گیا

ایک پستہ قد، فربہ اندام آدمی ایک اسٹیج پر چڑھ گیا، اور زور زور سے چیخنے لگا "ہندو بھائیو! جاگ اٹھو! اگر اپنی ماؤں بہنوں کی لاج ہے تو غافل نہ رہو! گورنمنٹ تو کچھ کرنے سے رہی لہٰذا تم خود ہی لاٹھیوں سے مسلح ہو کر اپنے اپنے گھروں سے نکل آؤ۔ ہمارے بھائی بند اور عورتیں بچے مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو رہے ہیں، بے عزت ہو رہے ہیں، اور تو اور حکومت نے تو یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ اگر پانچ سے زیادہ آدمی کہیں جمع ہوں تو ان پر گولی چلا دی جائے۔ لہٰذا ہمیں اپنی حفاظت خود ہی کرنی پڑے گی۔ حکومت بس ہماری لاٹھیاں تو چھین لیتی ہے۔ مگر ان کی لاٹھیاں اور چھریاں نہیں ضبط کرتی اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ان مسلمان بچوں کو اپنی مردہ قوت کا ذرا مزہ چکھا دیں! مسلمان مردہ باد! مسلمان برباد! مسلمان مردہ باد!"

منو ایک بند دکان کے تختے پر چڑھ گیا کہ وہاں سے اس آدمی کو بخوبی دیکھ سکے۔ اس نے دیکھا کہ ایک بھاری سا ڈنڈا ہوا میں گھوما اور اس آدمی پر پڑنے لگا۔ بھاری آواز رک گئی۔ چاروں طرف "ہائے مار ڈالا۔ ہائے

ہائے۔ جان سے مار ڈالا،، کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ایک لمحہ کے لئے تمام مجمع نے دانت پیسے اور پھر ملی جلی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ مسلمانوں کو مار ڈالو! بدلہ لو! لوٹو! جلا دو! ختم کر دو!،، ـــــ مجمع دھیرے دھیرے کھسکنے لگا اور چوک سے ہوتا ہوا عبدالرحمٰن اسٹریٹ کی طرف بڑھا۔

ایک نوجوان انگریز پولیس کا افسر خاکی لباس پہنے، دس ہندستانی پولیس کے سپاہیوں کو لئے، لاٹھی چارج کرنے پر پل پڑا۔ منو افسر کو دیکھ کر اس خالی دکان سے اٹھا اور اندھیرے میں چھپنے کے خیال سے تیزی سے جو اٹھا تو پھسل گیا۔ اس نے سوچا کہ مجمع کے مخالف سمت میں چلنے میں غالباً بچت ہو جائے گی۔ اس کا دماغ انتشار سے چکرا رہا تھا۔ کنپٹیاں دھمک رہی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے وہی ڈنڈا ہوا میں گھومتا ہوا لگتا تھا اور موت نگاہوں کے سامنے ناچنے لگی اور وہ بے ہوشی کے سے عالم میں خود ہی کچھ بڑبڑاتا ہوا چل پڑا۔ "یہ ہوا کیا؟ یہ ہو کیا گیا،، وہ بار بار اپنے آپ سے پوچھتا تھا اس نے گلی میں جھانکا کہ شاید وہاں سے کوئی جواب مل جائے مگر گلی کے اونچے اونچے مکانات پتلی سڑک کے دونوں طرف چٹانوں کی طرح کھڑے اس کا منہ چڑھا رہے تھے۔ کھڑکیاں جنانوں کے دیدوں کی طرح سایہ دار برآمدوں میں سے جھانک رہی تھیں۔ اسے دگنا کی پہاڑیاں یاد آ گئیں جہاں آگے کو نکلی ہوئی چٹانوں نے ایک مرتبہ اسی طرح اس کا منہ چڑھایا جب وہ اپنی کھوئی ہوئی بکری ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ یہاں کی بند دکانوں اور عجیب ستونوں کے سائے میں بھی وہی پہاڑ کی چٹانوں کی سی سیاہ پرچھائیاں چھائی ہوئی تھیں ـــ ہاں ان کا سناٹا مختلف آوازوں کی گونج کی وجہ سے اور بھی بھیانک ہو گیا تھا جو دور سے تھوڑے تھوڑے وقفہ پر سنائی دے رہی تھی۔ تمام

کائنات پر موت چھائی ہوئی لگتی تھی، مدھم اندھیرے میں ہجوم کی پرچھائیاں کبھی آہستہ، کبھی تیز، کبھی یکایک سرپٹ دوڑتے ہانپتے ہوئے غول زمان و مکان کو سرعت سے طے کر رہے ہوں، جیسے سینکڑوں چیختے چلاتے شیطان انسانوں کو موت کے غار کی طرف دوڑا رہے ہوں۔

اس نے اپنی رفتار دھیمی کر دی کہ ان خوفناک خیالی تصویروں کے چنگل میں پھنس کر کہیں ڈوبنے لگے "میں تو بڑا بہادر پہاڑی ہوں۔ سینکڑوں مرتبہ تنہا چلا ہوں۔ مسانوں اور قبرستانوں سے اکیلا گذرا ہوں" وہ اپنے دل ہی دل میں کہنے لگا "یہ مجھے ڈر آخر کیوں لگ رہا ہے؟ معلوم نہیں رتن کہاں ہے۔ کیا کر رہا ہے۔ اور ہری؟ لکشمی اور بچے تو شاید گھر پر سوتے ہوں گے۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ پل کے احاطے سے نکل آنے کے بعد اب وہاں جانے کو دل کیوں نہیں چاہتا۔ اندھیرے کا سینہ چیرتی ہوئی ایک چیخ سنائی دی، اور لاش کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر گئی "اللہ اکبر" کے نعرے گونجنے لگے۔ اس نے دوڑنا شروع کیا۔ پاس کی ایک گلی میں اس نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ ایک آدمی جس کے پاؤں لکڑی کے تھے، پنجے چیرے لگائے، دوڑا جا رہا ہے اور ایک بھاری بھرکم پٹھان اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ منو دور ہی سے گھٹنا خوف اور حیرت سے جما دیکھتا رہا۔ وہ اور پٹھان لاٹھی لئے سامنے سے آ رہے تھے۔ وہ بھی اس بوڑھے پر پل پڑے۔ اب تو وہ دہشت کے مارے لڑکھڑا کر زمین پر آ رہا جیسے کوئی پرندہ جال میں پھنس کر تڑپے "رام رے رام! اب پران گئے" پیچھے والے پٹھان نے اس کے چھرا بھونک دیا "کافر ابلیس کا بچہ"۔ بوڑھے نے ایک چیخ ماری اور کراہ کر زمین پر لمبا ہو گیا۔ اس المناک منظر کے بعد پھر سناٹا چھا گیا، اور منو وہاں سے سر

پہ پاؤں رکھ کر بھاگا۔ ایک ایک ہوا کا جھونکا بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دن کے پیاسے مسلمان ہی آپس میں کانا پھوسی کر رہے ہیں لیکن کسی نے اس کو چھوا بھی نہیں اور وہ بھاگتا رہا یہاں تک کہ پھرتی اور احتیاط سے بھاگتے بھاگتے ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں شور و غل ہو رہا تھا اور ایک بڑے سے مکان میں آگ لگی ہوئی تھی، شعلے آسمان سے بات کر رہے تھے اور سرخ نارنجی اور گہرے نیلے رنگوں سے تمام ماحول کو چمکا رہے تھے۔

"یہ مول جی مادھو جی کی مٹھائی کی دکان ہے جسے پٹھانوں نے جلا ڈالا ہے۔ جانا مت نہیں تمہیں بھی مار ڈالیں گے" ایک گجراتی بنیا اپنے دروازہ پر کھڑا ایک ہاتھ دروازے پر رکھے تھا اور دوسرے سے اپنے کسی دوست کو روک رہا تھا جو آگے جانا چاہتا تھا۔ منو نے بھی یہ بات سن لی اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کہیں کسی بند دوکان کے تختے یا کسی مکان کی سیڑھیوں تلے کوئی جگہ ایسی مل جائے جہاں وہ رات بھر آرام سے محفوظ رہ سکے۔ ابھی وہ دیکھ بھی نہ چکا تھا کہ آگ کے درمیان سے مسلمانوں کی "اللہ اکبر" کی صدائیں پھر گونجنے لگیں، اور وہ پاؤں پٹکتے شور مچاتے اسی طرف آنے لگے جدھر وہ کھڑا تھا۔ منو گھبرا کر بھاگا اور ایک گلی میں گھس گیا جو دیپرا ہاؤس کی طرف جاتی تھی، لیکن یہاں اس کی مٹھ بھیڑ ایک عورت سے ہو گئی جو اپنے گھر کے برآمدے میں کھڑی اپنی چھاتی پیٹ پیٹ کر اور بال نوچ نوچ کر بین کر رہی تھی "ارے میرا لال تو کہاں گیا، ارے بیٹا تو کہاں ہے۔ ارے تو کہاں چلا گیا"۔ منو اس ڈر سے اس کے نزدیک نہیں گیا کہ کہیں وہ اُسے بھی حملہ آور ہی نہ سمجھ بیٹھے اس نے مڑ کر دیکھا کہ الٹے پاؤں جا سکتا ہے۔ نہیں۔ گلی میں پٹھان تمام بکھرے تھے، دروازوں کو اپنی بندوقوں کے دستوں سے توڑ رہے تھے،

چھرے چمکا رہے تھے اور وہ اللہ اکبر، کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ منو خوف کے مارے جم سا گیا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اس مرتبہ وہ موت کی وادی میں گھس آیا ہے۔ لیکن پولیس کے سپاہیوں کے کچھ دستے اُسی طرف سے دبے پاؤں بھاگتے ہوئے آتے دکھائی دیئے جدھر منو جا رہا تھا۔ اور منو نے سوچا کہ ضرور یہ لوگ ان بلوائیوں کو اچانک آ لینا چاہتے ہیں۔ وہ چپکے سے ایک دوکان میں گھس گیا اور ڈر کے مارے کانپنے لگا کہ اب کسی کانسٹبل نے سنگین چبھوئی۔ اور اسے موت کا یقین ہونے لگا جیسے پہلے ہو رہا تھا۔ لیکن سپاہی نیلی وردیاں پہنے پاس سے گذر گئے اور وہ عورت بھی کہیں غائب ہو گئی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک گہری سانس لی۔ پھر وہ دیوار کے سہارے آگے پیچھے دیکھتا رینگنے لگا کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ گلی کے نکڑ پر پہونچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پٹھانوں اور پولیس کے سپاہی آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے وہ یہ دیکھتا ہوا کہ اب کون گرتا ہے آگے بڑھتا گیا اور کھلے چوک میں نکل آیا جہاں بلوائیوں کے دو جتھے آپس میں بھڑ گئے تھے "کالی ماتا کی جے"، "شیواجی کی جے"، "اللہ اکبر" کے نعروں کے درمیان ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے آپس میں گتھے ہوئے تھے "مار۔ مار۔ مار کے دیکھ" ایک طرف سے کسی نے کہا۔ دوسرے لمحے میں پھری چمکی اور پیٹھ میں دھنس گئی "ہائے مار ڈالا"۔ اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا "سؤر کا بچہ۔ کافر"۔ قاتل کی آواز گونجی۔

"اب تو ضرور موت آئی"، منو نے سوچا اور زقند بھر کر ایک رکی ہوئی ٹرام کے نیچے گھسنے لگا، یکایک اُسے اپنی گردن پر سخت انگلیوں کا دباؤ محسوس ہوا، اور ریڑھ کی ہڈی پر لاٹھی کی چوٹ لگی اور وہ نیوا کر گر پڑا۔ اپنی جگہ سے

پڑے پڑے ذرا آنکھ کھول کر اس نے دیکھا کہ ایک مسلمان کا سایہ ٹرام کے نزدیک ہی کھڑا ہے۔ اس نے فوراً اپنی آنکھ بند کر لی اور ہاتھ پاؤں مُردے کی طرح ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ پٹھان نے اُسے نفرت سے ٹھکرایا: ہندو کتا، اور جا کر اپنے ساتھیوں میں مل گیا۔ چوک جلد ہی خالی ہو گیا، کیونکہ سب کے سب پٹھان غصہ میں سب کو چیختے، چلاتے، پیر پٹکتے چلدیئے تھے اور کچھ عرصہ کے لئے سناٹا ہو گیا۔ پھر اُدھ موئے لوگوں کے کراہنے کی آوازیں چوپائی سے آتے ہوئے ہوا کے جھونکوں میں مل کر فضا میں گونجنے لگیں، اِدھر اُدھر سے دبکے ہوئے لوگ نکل نکل کر اپنی جانیں لے لے کر بھاگنے لگے۔ اس نے اپنا سر کہنیوں پر ٹیکا کر اٹھایا، اور کسی کے تڑپ تڑپ کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی کے زمین پر ٹانگ مارنے کی بھی آہٹ لگی۔ اب تو اس سمت نکل بھاگنا ناممکن تھا۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے اپنی سانس روک لی اور چپکا پڑا رہا۔ یہاں تک کہ اس مرتے ہوئے آدمی کی آخری چیخ سنائی دی۔ منو کا دل چاہا کہ دوڑ کر اس آدمی تک پہنچ جائے لیکن مایوس سر ڈال کر رہ گیا۔ اندھیرے میں دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں اوب کر بند ہوئی جا رہی تھیں اور وہ پھر پڑ رہا۔

یکایک اُسے اپنے بالکل ہی نزدیک جلدی جلدی بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ کیا میرا آخری وقت آ پہونچا؟ اس نے اپنے دل سے پوچھا۔ اس کی زبان بند سی ہو گئی اور وہ آخری سانس نکل جانے کا انتظار کرنے لگا۔

ماضی کی تمام یادیں مٹ چکی تھیں اور امید کی روشنی اور گرمی اس کے وجود سے غائب ہو چکی تھی لیکن یہ اس کا آخر وقت نہ تھا کیونکہ سوشل

سوشل سروس لیگ کے دو آدمیوں نے مل کر اُسے اٹھایا اور سو گز دور ایک اسکول کے برآمدے میں لے جا کر لٹا دیا۔ منو نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں تاکہ اسے مدد کا مستحق سمجھا جائے۔ لیکن جو کچھ اس کے ساتھ کیا جا رہا تھا وہ سب اُسے بخوبی معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی طرح اسے ہوش نہ ہوتا کاش کہ اُسے سچ مچ چوٹ لگ گئی ہوتی اور وہ مر گیا ہوتا یا کم از کم بے ہوش ہی ہو گیا ہوتا، کیونکہ اس کے دماغ میں جو آگ سی لگی ہوئی تھی وہ ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی، اور اس کی بڑھتی ہوئی آنچ تمام احساس کو جیسے جلا کر اس رہی سہی اعصابی طاقت کو بھی ختم کیے دیتی تھی۔ جو مہینوں فیکٹری میں کام کرنے کے بعد کسی صورت سے بچ رہی تھی۔ اس وقت تو اس کی حالت ایک ایسے جلتے ہوئے انگارے کی مانند تھی جو اس بیہودہ ذہنی حالت میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہا ہو۔

سوشل سروس لیگ کے رضاکاروں نے اُسے اسکول کے برآمدے میں ایک چٹائی پر لٹا دیا۔ چاروں طرف لالٹینوں کی روشنی میں فقیروں، نکڑ گدوں اور قلیوں کے جسم بکھرے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ جنہیں مختلف گلیوں اور سڑکوں سے بٹور کر لایا گیا تھا۔ جہاں وہ ہمیشہ سویا کرتے تھے۔

ایک ڈاکٹر، جو منو کے دیکھنے میں شام نگر والے چھوٹے بابو سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا کیونکہ اسی طرح کا سوٹ بوٹ پہنے تھا منو کے پاس آ کر اس سے پوچھنے لگا کہ اُسے کہاں چوٹ آئی ہے۔ منو نے صرف انگار میں سر ہلا دیا اور پھر غوطہ میں چلا گیا۔ ڈاکٹر نے اس کے جسم کو دیکھا بھالا اور ایک پرچے پر کچھ لکھ کر آگے بڑھ گیا۔

ایک رضاکار نے گرم دودھ کا ایک پیالہ اس کے لبوں سے لگا دیا اور منو بڑی لجاجت سے اُسے پینے اُٹھ بیٹھا۔ میٹھا گرم دودھ پینے سے اس کے چہرے پر خون دوڑنے لگا اور اگر وہ اس وقت سو جاتا تو یقیناً دوسرے دن صبح ہشاش بشاش چاق چوبند اٹھ بیٹھتا لیکن اس نے آنکھیں کھول کر اپنے ماحول کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ برآمدے میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اور فضا میں گوبر اور پیشاب کی بو پھیلی تھی۔ شور، ہچکیوں اور زخمیوں کی آہیں گھٹی ہوئی ہوا میں دھنکی روئی کی طرح بکھر کر دم توڑ رہی تھیں۔ منو نے کوشش کی کہ اس نظارے کو غور سے نہ دیکھے لیکن اس کی آنکھیں نظروں ہی نظروں میں اس تمام ماحول کو کھا جانا چاہتی تھیں، چاروں طرف بیمار، معذور، مجروح لوگ پڑے تھے، بعض اپنا پچکا ہوا پیٹ پکڑے سکڑے ہوئے تھے بعض اپنا دھنسا سینہ دبائے تھے۔ بعض لکڑی کے ٹھوں کی طرح دیوار سے ٹکے خراٹے لے رہے تھے۔ بعض اپنے زخموں کو اپنی دھنسی کمزور آنکھوں سے دیکھ رہے تھے بعض تھے کہ لگاتار کھانسے ہی جا رہے تھے۔ منو نے اپنے آپ سے باتیں کرنے کی کوشش میں ذرا سا منہ کھولا ہی تھا کہ مرچوں کی دھانس اور پاخانہ کی بدبو بلا جلا ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اس نے منہ بند کر لیا اور صرف ناک کے ذریعہ سانس لینے لگا۔ اس کے نتھنے پھیل گئے اور پھر بدبودار ہوا اندر گھسنے لگی۔ اس کا دل چاہا کہ اس جگہ سے نکل بھاگے۔ کیسی ناقابل برداشت تھی یہ جگہ، کیوں نہ جا کر سمندر کے کنارے سویا جائے۔ وہاں پر تو دوکانیں بھی ساری رات خالی ہی پڑی رہتی ہیں، اس نے خود دیکھا تھا۔ اگر ایسا ہو کہ کسی کو بھی اس بات کا خیال نہ آیا ہو اور وہاں سناٹا ہو تو کیسا اچھا ہو۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چلنے لگا۔ کسی نے اس کو دیکھا تک نہیں، دروازہ بالکل سامنے ہی کھلا تھا، اور لوگ برابر آ جا رہے تھے۔ وہ پھاٹک کے

باہر نکل آیا۔ اس نے محسوس کیا کہ چوپاٹی تک پہنچنے کے لئے کوئی تین سو گز کے قریب دوڑنا ہوگا۔ اس کے دل نے پوچھا کہ کیا میں محفوظ رہ سکوں گا لیکن پھر اس نے جھنجھلا کر سوچا کہ جو ہو سو ہو کم از کم یہاں سے تو نکلو خاصی ہوگی اس کے دماغ پر وہاں لیٹے ہوئے ان لوگوں کی تصویر جھلملانے لگی، جنھیں چھوڑ کر وہ جا رہا تھا، طرح طرح کے خیالات دماغ میں چکر کاٹ رہے تھے، شام نگر جاتے ہوئے گرم ریت پر وہ ننگے پاؤں چلنا، دولت پور کی سول لائن اور بمبئی کی گلیوں میں بے مقصد مارے مارے پھرنا — اب وہ بھاگنے لگا اور جسم کی تیز حرکت نے زمان و مکان کے احساس کو بھی گم سا کر دیا۔ شام بھر جو کٹے پھٹے جسم، ظالم ہاتھوں کی مار اور آہ و فریاد کے مناظر اس نے دیکھے تھے ان کی یاد اب ایک نامعلوم طویل لمحہ بن کر رہ گئی۔ وہ ایسا ڈوڑا گویا وہ آگ کا ایک بگولہ تھا یا کوئی آتشبازی کی چنگاری تھی جو سمندر میں غرق ہو کر بجھ جانا چاہتی تھی اسے اپنے جسم کا بھی احساس باقی نہ رہ گیا تھا، چوپاٹی کے پل پر کی عمارتوں کے پاس سے تو وہ ایسا گذرا جیسے کوئی آندھی آ رہی ہو۔ سامنے ہی اسے ایک گاڑی نظر آئی جس پر پھپوس کا چھپر تھا۔ دن کو یہی گاڑی ناریل کی دوکان کا کام دیتی تھی ہانپتے ہوئے اس نے اپنی رفتار مدھم کر دی اور اس کی طرف بڑھا۔ ملک کا سنگب موسیٰ کا مجسمہ پانی کی اس وسیع چادر کے آگے بالکل ہیچ معلوم ہو رہا تھا۔ جو بار بار ناگن کی طرح بل کھا کھا کر اپنا زہریلا سفید جھاگ ہندستان کے ساحل پر دے دے پٹکتی تھی۔ منو اس گاڑی میں چڑھ گیا اور چاروں طرف ٹٹولنے لگا، جگہ کافی تھی وہ آرام سے لیٹ گیا اور سمندر کے بے چین شور کی لوریوں نے اسے جلد ہی نیند میں غرق کر دیا۔

دوسرے دن کافی دن چڑھے جب وہ اٹھا تو اس کی سمجھ میں نہیں

آتا تھا کہ کہاں جائے کیا کرے۔ اور یہ کہ اس کا دل آخر چاہتا کیا تھا۔ ناریل کی دو کانیں تیسرے پہر سے پہلے نہیں کھلتی تھیں لہذا کوئی اس کے آرام میں مخل انداز نہیں ہوا۔ چپ چاپ بیٹھا ہوا وہ گاڑی میں آتی ہوئی دھوپ کو دیکھتا رہا اور بیچ بیچ میں کھڑکی کی آڑ سے سمندر کی لامتناہی گرج سنتا رہا۔

رات کو خنکی کافی تھی اور پچھلے پہر کو تو وہ سردی سے تھرتھرانے لگا تھا لیکن اب کسی قدر بلکہ کافی گرمی ہو گئی تھی اور دیے جگہ بھی بڑی پرسکون تھی، ہاں روح میں ایک خلا اور پیٹ میں بھوک ضرور محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے دل کو یہ سمجھا کر تسلی دینی چاہی کہ مہینوں ناک میں جانے کے لئے صبح منہ اندھیرے اٹھنے کے بعد تو یہ آرام نصیب ہوا ہے۔ آج تو بالکل گاؤں کا سا مزہ آ رہا تھا جب وہ دوپہر میں جانوروں کو چرتا چھوڑ کر مزے مزے کی نیند لیا کرتا تھا۔ سبزی مائل سمندر کے پھیلاؤ میں بھی کچھ دیہات کے سبز سبز کھیتوں کی سی آزادی نظر آ رہی تھی۔

لیکن مل میں جانے کے واسطے جو صبح اٹھنا پڑتا تھا اس نے منو کو کام کا عادی بنا دیا تھا اور اس وقت اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا۔ اُسے ایسا لگا کہ اب اٹھ کر کسی کام میں لگنا ہی چاہیئے۔ لیکن کیا کرے، کہاں جائے؟ ان سوالوں کا کوئی جواب اس کے پاس نہ تھا۔ جب کبھی وہ فالتو بیٹھا کرتا تھا یا اپنے چاروں طرف لوگوں کو مشغول دیکھتا تھا تو اُسے اسی طرح کی ملامت محسوس ہوتی تھی۔ اور جب وہ دن بھر کام کر کے شام کو کھانا کھانے بیٹھتا تو اگرچہ تھکن سے چور ہوتا اور طرح طرح کی اور تکلیفیں بھی سہنی پڑتیں لیکن پھر بھی اُسے یہ بیزاری اور تنہائی کبھی محسوس نہ ہوتی تھی۔ وہ اپنی کہتا، دوسروں کی سنتا لوگوں سے ہنسی دل لگی کرتا اور سو جاتا، پھر دوسرے دن صبح منہ اندھیرے اُٹھنے کے

لئے۔ اسی کا نام زندگی تھا۔

اور اب روح کی وہ تنہائی جسے اس نے کام کے شوق، دوسروں کی زندگیوں میں دلچسپی، اپنے پرائے کی محبت کے ذریعہ دبایا تھا وہ اُبھر آئی اور ساتھ ہی ساتھ اس کا پورا وجود بے روزگاری، بھوک اور زندگی کی مقصدی کے بوجھ سے کچلنے لگا۔ پھر اسے ایک یہ خیال آیا کہ زندگی میں جب کبھی اس نے ہاتھ پاؤں مارے تو اُسے کوئی نہ کوئی سہارا ضرور مل گیا۔ مثلاً شام نگر سے بھاگنے کے بعد وہ پربھا سے ملا تھا، پھر اس جماعت سے ملاقات ہو گئی تھی جو اسے بمبئی لے آیا تھا، پھر ہری سے ملنا ہو گیا تھا۔ اور اگر بمبئی نہ آتا تو رتن سے تو یقیناً ملاقات نہ ہوتی "لیکن" وہ اپنے دل میں سوچنے لگا۔ ایسے بھی کتنے ہی دن کتنے ہی مہینے اور کتنے ہی سال گزر گئے جب میں تنہا مارا مارا پھرا یا کام کرتا رہا خیر چلو دیکھیں تو مل میں کیا ہو رہا ہے۔

وہ رتن کر اٹھ بیٹھا، انگڑائی لے کر جمائی لی۔ اور کھڑا ہو کر گاڑی کے باہر کو دیکھا۔ ساحل پر بالکل سناٹا طاری تھا، صرف چند مچھیرے اپنا جال پانی میں ڈال رہے تھے۔ منوچہ پاٹی کے پل کی طرف چل دیا اور مالابار ہل کے سبز سفید اور سُرخ مکانوں کو دیکھنے لگا جو یہاں سے وہاں تک صف بستہ کھڑے تھے، سڑک پر زندگی کے معمولی آثار نمایاں تھے اور کل رات کے واقعات کا کچھ اثر نہ معلوم ہوتا تھا۔ دکھوڑیاؤں اور سائیکلوں کے بیچ بیچ سے موٹریں زناٹے سے نکلی چلی جا رہی تھیں۔ دوکانوں کے سائن بورڈوں نے منو کی نظر اپنی طرف متوجہ کر لی۔ ایک پر لکھا تھا "آٹو ڈی لکس"، دوسرے پر "بھارت واچ ورکس"، ایک اور پر "امریکن آٹو پارٹ کمپنی"، ایک چوتھے پر "ڈاکٹر این جے مودی ایم بی بی ایس۔ ایم آر سی پی (لندن) کا دواخانہ۔ اور کسی پر لکھا تھا "بھارت

سودیشی اسٹورز"

پارلیمنٹ کے قریب پہنچ کر اس نے کچھ قلیوں کو دیکھا جن میں عورتیں اور مرد دونوں تھے۔ یہ لوگ ایک دوکان سے مٹی کی ٹوکریاں بھر بھر کر ایک بیل گاڑی میں ڈال رہے تھے جس میں بیل جتے کھڑے تھے، چوراہے پر پولیس کا ایک کانسٹیبل کھڑا تھا۔ منو کھڑا ہو گیا اور کھوئی کھوئی سی نظروں سے بیلوں کو تکنے لگا۔ ان کے سینگ اوپر کو مڑے ہوئے تھے اور وہ بڑے صبر کے ساتھ منتظر کھڑے دھیرے دھیرے گھاس کھا رہے تھے۔ گردن پر جوے کی جگہ لکڑی کی رگڑ سے چھل کر زخم ہو گئے تھے اور مکھیاں ان پر بیٹھ رہی تھیں لیکن بیل اس کی طرف سے قطعی لاپرواہ تھے۔ دوکانیں ابھی کھلی نہ تھیں لیکن لوگ اِدھر سے اُدھر فٹ پاتھوں پر، چھتریاں سنبھالے، دھوتیاں ہاتھوں میں پکڑے، اپنی ننگی ننگی ٹانگیں دکھاتے، تیزی سے آجا رہے تھے۔ منو ان راہگیروں کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ اُسے ایسا لگا جیسے کائنات میں چاروں طرف ٹانگیں ہی ٹانگیں ہیں۔

"یہ بات کیا ہے؟ کیا کل رات کا جھگڑا ختم ہو گیا"، اس وقت تو سب معاملہ ٹھیک نظر آ رہا تھا۔ "لیکن ایسا ہو نہیں سکتا"، اس نے اپنے دل میں سوچا اور ایسا محسوس کیا جیسے آس پاس سے گذرنے والے تمام لوگ اُسے دھوکہ دینے پر تلے ہیں اور جان بوجھ کر اس سے یہ راز چھپایا جا رہا ہے۔

کسی سے بات کرنے اور حالات پوچھنے کے لئے اس کی بیقراری بڑھتی گئی۔ صرف ایک کوا اڑتا ہوا آیا اور سامنے کی ایک کھڑکی پر بیٹھ کر چونچ مکانے لگا گھر کھانے کے لئے کچھ مل جائے۔ منو نے اپنا منہ پھیر لیا اور اس کا ذہن بالکل خالی سا ہو چلا تھا کہ اس نے دیکھا کہ چوراہے والا کانسٹیبل کسی امیر پارسی سے کچھ باتیں کر رہا ہے۔ منو ذرا پاس کھسک آیا اور فقیروں کی طرح بیل گاڑی کے پاس

درختوں کے گرے ہوئے سوکھے پتے بیننے لگا۔

"جہاں تک پولیس کا تعلق ہے"، کانسٹبل پارسی سے کہہ رہا تھا "یہ بچے چرانے اور اٹھائے جانے کی افواہ بالکل بے بنیاد تھی۔ اور پولیس نے لوگوں کو اطمینان دلانے کے لئے پراڈ کاسٹ بھی کیا تھا۔ لیکن ہل کے علاقہ اور شہر میں مار پیٹ شروع ہو گئی تھی اور تمام پولیس، مع مسلح پولیس کے، فسادی لوگوں کو دبانے میں لگی ہوئی تھی۔ لیکن اتنا فساد اور خون خرابہ ہوتے ہوئے بھی سرکار نے ملٹری نہیں بلائی۔ اب تو پولیس فتح پا چکی ہے اور آج صبح سے شہر کی حالت بہتر ہے بلوں اور ریلوے کے قلی بھی اپنے اپنے کاموں پر چلے گئے ہیں۔ اور یہ تو آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ لوگ معمولی طور پر چل پھر رہے ہیں"۔

منو کو فوراً یہ احساس ہوا کہ کام پر جانا چاہئے۔ ملیں کھل گئی تھیں، تو پھر ہڑتال نہیں ہوئی تھی! ہری تو ضرور فیکٹری گیا ہوگا۔ مجھے بھی جانا چاہئے اور وہ جلدی جلدی چلا۔ ابھی کوئی سو گز گیا ہوگا کہ اس نے دو کانگریس کے والنٹیروں کو ایک سوٹ بوٹ پہنے آدمی سے بات کرتے دیکھا جو ایک نوٹ بک میں بار بار کچھ لکھتا جاتا تھا۔ منو لنگڑانے لگا، گویا پاؤں میں چوٹ ہو اور ان کے قریب ہی جا کر مٹی اٹھا کر پاؤں پر ڈالنے لگا جیسے زخم پر ڈال رہا ہو۔

"آج صبح ساڑھے، نجے مزدور لیڈر آلوے اور کھسلے ایک مسلمان ٹھیکیدار مسمی بہ رحیم کو لے کر ساری بھنگ روڈ کے ناکے کے ایک چائے خانہ میں آئے تاکہ پٹھانوں سے سمجھوتے کی کچھ بات چیت کی جائے۔ ایک نامعلوم پٹھان نے آلوے کے منہ پر تھوک دیا۔ آدھ گھنٹہ کے اندر اندر مل کے تین چار ہزار مزدور یہ خبر سن کر لاٹھیاں لے کر پٹھانوں کے کیمپ پر اتر آئے کہ آلوے کی اس ہتک کا بدلہ لیا جائے۔ مسلح پولیس کے ایک دستہ نے بڑی ظرفداری کے

ساتھ پٹھانوں کا بچاؤ کیا۔ مزدوروں کی زیادہ تعداد تو واپس چلی گئی، مگر کچھ لوگ یونین کے دفتر میں ٹھہر گئے۔ جو دامودر ٹھاکر کے ہال میں ہے۔ ڈپٹی کمشنر پولیس نے فوج سے بھی مدد لی تھی۔ داردک شائر رجمنٹ کے کئی دستے تمام شہر میں مشین گنیں لئے گشت کر رہے ہیں اور ہوم سکریٹری نے پونا بریگیڈ کو لکھا ہے کہ اور فوجی امداد بھیجی جائے۔ ہم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک میٹنگ یہاں سرلا ہاؤس میں طلب کی ہے۔"

اسی دم ایک بڑی سی موٹر کار فٹ پاتھ کے قریب آکر رکی اور ان کانگریسیوں کی توجہ ایک لمبے چوڑے بھاری بھرکم آدمی کی طرف ہو گئی جو نہایت شاہی قسم کے کپڑے پہنے صافہ پر چاند ستارہ لگائے موٹر میں سے اترا۔

"یہ تمہارے لیڈر کیا کر رہے ہیں" انھوں نے اترتے ہی پوچھا

"پولیس اور حکومت کیا کر رہی ہے، کارپوریشن کے یہ نئے ممبر کیا کر رہے ہیں، اور یہ نوجوان سبھا کے ممبر کیا کر رہے ہیں۔ آج تمام رات ہندوؤں نے پٹھانوں کا خون کیا ہے اور کانگریس نے کچھ نہیں کیا۔ اگر مسیو ہندستان میں آئے اور یہ لکھے کہ یہاں بچوں کو اٹھا اٹھا کر لے جاتے ہیں اور ان کی قربانی کرتے ہیں تو کیا آپ لوگ اس بات سے انکار نہ کریں گے اور اسے بے ایمانی اور شرارت نہ کہیں گے"

کانگریسی خاموش رہے۔ البتہ نوٹ بک والا جرنلسٹ فوراً آگے بڑھ آیا اور پوچھنے لگا "تو کیوں مولانا حسرت علی، کیا یہ ممکن ہے کہ یہ صورت حال سارے ہندستان میں پیش آئے"

"یقیناً آئے گی" مولانا نے جواب دیا "ہم اب مسلمانوں کو تیار کریں گے کہ وہ اپنا بچاؤ خود کرنے پر مستعد ہو جائیں"

"لیکن کانگریس تو ایک امن کمیٹی بنا رہی ہے" ایک کانگریسی نے کہا۔

"جی ہاں آپ لوگ ہمیشہ امن کی باتیں کرتے رہتے ہیں لیکن جب آپ امن کا ذکر کرتے ہیں تو دراصل آپ کا مطلب لڑائی سے ہوتا ہے۔ آج ہی صبح کالبادیوی کے ہندو گنڈوں نے تین مسلمانوں کو مار ڈالا اور ملوں کے بھی پچاس مسلمانوں پر حملہ کیا گیا۔ مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ زخمی ہوئے ہیں۔"

"اچھا تو مولانا پھر آداب عرض ہے۔ میں چلا" جرنلسٹ نے کہا اور کھسک گیا۔

"سنو تو۔ اس بیان کو چھاپنا مت" مولانا پیچھے سے چیختے ہی رہے اور وہ بائسکل پر بیٹھ کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ ایک دوسری کار آئی اور منو نے دیکھا کہ ایک اور کوئی معزز صاحب وارد ہوئے انھوں نے مسلمان لیڈر اور کانگریس کے والنٹیروں سے "بندے ماترم" کہا لیکن مسلمان لیڈر نے ان کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا اور ایک بڑی سی عظیم الشان محل نما عمارت میں چلے گئے۔ نو وارد پنڈت مدن موہن مالاباری، سفید دودھ جیسا کھدر پہنے ان کے پیچھے پیچھے داخل ہوئے کانگریس کے کچھ والنٹیروں نے شوفروں کو اشارہ کیا کہ موٹر آگے لے آئیں۔

منو کو بڑی کریدلگی کہ ان کے پیچھے چلا جائے اور آس پاس والنٹیروں کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر وہ اندر جھانکنے لگا۔ لیکن اُسے صرف ایک اونچا پالش کیا ہوا چمک دار زینہ نظر آیا جو عمارت کی چھت تک مسلسل چلا گیا تھا۔

"کون ہے بے؟ بھاگ یہاں سے" کانگریس کے ایک والنٹیر نے دروازہ پر اپنی جگہ آتے ہوئے کہا۔ منو چونک پڑا اور شرمندہ ہو کر بگٹٹ بھاگا لیکن دو چار ہی قدم گیا تھا کہ گولیوں کی آواز سے اسی جگہ جم گیا۔ آواز بھنڈی بازار کی طرف سے آرہی تھی۔ سامنے دیکھا تو کوئی نظر نہ آرہا تھا۔ پھر یکایک بہت سے

آدمی، زخمی، چیختے چلاتے، ایک دوسرے پر گرتے پڑتے آتے دکھائی دیئے۔ لیکن منو کو ان سے کسی طرح کی ہمدردی پیدا نہ ہوئی، نہ اپنا کچھ خیال آیا۔ کیونکہ اس نے کبھی مشین گن سے لوگوں کو بھونے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ گولیوں کی ایک بوچھار پھر ہوئی۔ منو الٹے پاؤں بھاگا اور ایک اونچی سپاٹ سی پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ اسے نہ معلوم کیوں پہاڑ کے دامن میں ہمیشہ محفوظ رہنے کا احساس ہوتا تھا اور یہاں تو ننگلے بھی تھے، اب گولیوں کی آواز تو بند ہو گئی تھی مگر لوگوں کے مجمع کی آواز برابر جاری تھی۔ سڑک کے آخری کنارے سے چڑھائی شروع ہوتی تھی اور یہی اس کے نزدیک محفوظ مقام تھا کیونکہ گولیوں کی آواز یہاں پہنچتے پہنچتے ختم ہو جاتی تھی۔ سورج پورے جلال پر تھا، دھوپ خوب نکلی ہوئی تھی اور رستہ میں سایہ خال خال کہیں تھا۔ منو پسینہ میں تربتر ہو گیا۔ بھوک اور تھکن سے اس پر غشی سی طاری ہونے لگی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کا جسم اپنا نہیں ہے، کیونکہ چلنے کی خواہش کے باوجود وہ پیچھے ہی گھسٹتا جاتا تھا۔

"یہ مجھے ہو کیا گیا ہے، میری طاقت کہاں گئی"۔ لیکن کچھ جواب نہ پا کر وہ ذرا احمق سا محسوس کرنے لگا۔ پھر اسے ان لوگوں کا دھیان آیا جو اس کے پیچھے ہی مرمر کے گرے تھے، ضرور پولیس اور سوجروں نے مل کر ان کی جانیں لی ہوں گی۔ ان کے بال بچے اور دوست احباب ان کے لئے کیا کچھ نہ روئیں پیٹیں گے اور اس کا دل ان کے لئے رحم اور ہمدردی سے بھر گیا۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ نزع کی تکلیف سے واقف ہے۔ کم از کم اسے ہر مرتبہ جب وہ کوئی تکلیف اٹھاتا تھا تو یہی محسوس ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ایک بکری کا تڑپنا دیکھا تھا جو اس نے بقرعید میں اپنے گاؤں کے مسلمانوں کو قربان کرتے دیکھی تھی اور اس وقت وہی نقشہ اس کے ذہن میں پھر گیا۔ لیکن

کسی موقعہ پر بھی موت اپنے اتنے ننگے روپ میں ظاہر نہ ہوئی تھی جتنی اس وقت۔ پہلے تو اُسے صرف دُکھ کا احساس ہی ہوا تھا اور اس وقت تو ہر چیز دُکھ میں رنگی ہوئی نظر آتی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اُسے حیات کی کلفت کا احساس ہوا۔

لیکن اس نے اپنے مقدر کو نہیں کوسا۔ محنت کش طبقہ میں پیدا ہونے کی وجہ سے اب تک وہ اپنی جفاکشی سے تمام مصیبتیں جھیل گیا تھا۔ اور اگر کھانے کو پیٹ بھر مل جاتا تھا تو اسے کافی اطمینان ہو جاتا تھا۔ اُسے زندگی سے محبت تھی اور اس کے تمام جذبات اور احساسات کی تحریک سے لطف اندوز بھی ہوتا تھا۔ اور اب تک تہذیب و تمدن کے جال، سیاہ چمک دار جوتے گھڑیاں، تنکوں کی ٹوپیاں اور عمدہ کپڑے، اس کے معصومانہ دماغ سے خراج تحسین حاصل کرتے تھے۔

سڑک پر چلتے چلتے وہ چاروں طرف دیکھتا جاتا تھا کہ شاید کہیں بھنے چنے یا معمولی مٹھائی کی چھوٹی موٹی دکانیں ہوں جیسی صاحب لوگوں کے نوکروں کے لئے عموماً لگی رہتی ہیں، لیکن کوئی دکان یا چھابڑی نہ دکھائی دی اور وہ تھکا ہوا پام کے ان درختوں کی قطاروں سے دھیرے دھیرے گزرتا گیا جن کے پتے ہوا کے بوجھ سے پھیل کر چپٹے ہو گئے تھے۔ بائیں ہاتھ کو سمندر تھا اور دہنی طرف امیروں کے بڑے بڑے بنگلے قلعوں کی طرح سر اٹھائے کھڑے تھے جیسے کوئی ان پر فتح نہیں پا سکتا۔ اوپر "ہینگنگ گارڈن" تھا اور نیچے پورا بمبئی کا جزیرہ! سامنے ایک بڑا سا مکان تھا جس کے آگے چوکھونٹا برآمدہ تھا باغ کے چاروں طرف ہندی کے درختوں کی ٹٹی تھی جو نہایت گھنی تھی اور بڑی باریکی سے کاٹی گئی تھی باہر کی طرف درختوں کی دو قطاریں تھیں۔ منو کا غریب دماغ بھلا اس مکان کی اس شانِ امارت کی کیا تاب لاتا۔ اس نے اپنی نظریں ادھر سے

ہٹالیں اور بیچ سڑک میں کھڑا ہو کر نیچے جزیرے کی طرف دیکھنے لگا۔ نیچے کی طرف دیکھ کر تو وہ اس کی خوبصورتی پر دنگ رہ گیا۔ دور افق کے پردوں کو چیر کر سفید بادبانوں کے جنگل کے جنگل سمندر کے لاجوردی پانی پر تیرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، جن میں غیر مرئی ہوا بھری ہوئی تھی اور نزدیک شہر کے اونچے نیچے مکانات ناریل اور پام کے درختوں میں گھسے پسے کھڑے تھے اور سبز گھاس سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں بندرگاہ کو گھیرے ایسی لگتی تھیں جیسے سیپ میں موتی جھلک رہا ہو۔ شہر، سمندر کا ساحل، سب اس کے قدموں تلے کس قدر حسین لگ رہے تھے

موٹر کا تیز ہارن سنائی دیا اور قبل اس کے کہ بچ سکتا وہ گر پڑا۔ بچنے کی قدرتی خواہش کے تحت وہ پہاڑ سے لڑھک گیا لیکن رکتے رکتے بھی موٹر کا اگلا پہیہ اس کے سینے پر چڑھ ہی گیا۔

"افوہ! کیا بدبختی ہے" سمنر میں دنگ چیخیں "آج ہی تو گھر سے آئے۔ پہلے تو وہ بلوہ شروع ہوا اور اب یہ حادثہ، خدا کرے مرا نہ ہو۔ دیکھو تو" انھوں نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا اور پھر سر پر ہاتھ پھیرا۔ ان کے ہاتھ پھیرنے کے طریقہ سے پتہ چلتا تھا کہ فرسٹ ایڈ (فوری امداد) سے واقف ہیں "نہیں نبض تو بالکل ٹھیک ہے۔ البتہ صدمہ کافی پہنچا ہے"

"ہائے ممی اب ہم لوگ کیا کریں گے" ننھی تمری الگ چیخے جا رہی تھی۔

"اسے موٹر ہی میں لئے چلتے ہیں" سمنر میں دنگ بولی "کیونکہ اگر کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو پتھراؤ کر کے مار ڈالیں گے۔ یہ بلوائی بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ شوفر اسے موٹر میں لٹاؤ۔ ہم اسے اپنے ساتھ شملے لے جائیں گے ہمیں ایک نوکر کی ضرورت بھی تھی" شوفر مسلمان تھا۔ اور اس نے پہچان بھی لیا کہ منوہر ہندو ہے

مذہبی اعتقاد کے اختلاف کی بنا پر تو اسے کیا پڑی تھی کہ منہ مرے یا جیئے بلکہ اگر کہیں اکیلا مل جاتا تو شاید خود ہی مار ڈالتا یہ تو صرف حادثہ ہی تھا۔ وہ تو اسے وہیں چھوڑ کر چل دیتا مگر میم صاحب کا ڈر بھی تو تھا چنانچہ اس نے اس کا فرکو اٹھا کر موٹر پر لاد دیا۔

"چلو تاج سے سامان لے لو"، مسز مین ورنگ نے حکم دیا "اور پھر جتنی جلدی بن پڑے چلو۔ شہر سے نہ چلنا۔ کولابا روڈ سے ہو کر چلو تاکہ رات کا کھانا بڑودہ پہونچ کر کھائیں۔

پانچواں باب (۵)

ابھی مسز مینورنگ کی موٹر بمبئی کے مضافات ہی طے کر پائی تھی کہ منو کو ہوش آگیا۔ اور جب بڑودہ کے ڈاک بنگلے میں پہنچ کر موٹر نے اپنا انجن بجایا تو منو اٹھ کر چل پھر بھی کرنے لگا۔ کالکا کا سفر اگرچہ دو دن کا تھا مگر کافی آرام کا تھا اور اس سفر میں منو کی صحت کسی قدر بہتر ہوگئی۔ اگرچہ ابھی بھی وہ ذہنی اور جسمانی طور پر شکستہ تھا۔ جب کبھی اُسے ان حالات اور اس ماحول کا خیال آتا جس میں رہ کر اس نے زندگی کے پچھلے دن گذارے تھے، پریشانی اور جدوجہد، بغاوت کی لہروں کا سر پٹخنا اور اس کی طاقت سے بے سود ٹکریں لینا، رتن، ہری اور لکشمی کی زندگی۔ اور پھر وہ فساد، تو اس کا دل ڈوبنے لگتا، اور تلخی اور شکست کا ایسا احساس ہوتا کہ اس پر بوڑھوں کی سی مایوسی اور قنوطیت طاری ہو جاتی تھی۔

لیکن مسز مینورنگ کو اس کا وہ مایوس اور ضعیف وجود کب نظر آتا تھا ایسا ہوتا تو وہ اُسے وہیں پھینک آتی جہاں پایا تھا۔ ساتھ کیوں لاوے پھرتی! مسز مینورنگ کے لئے تو وہ نہ بوڑھا تھا نہ ادھیڑ اور نہ ہی کڑیل جوان

بلکہ ایک چست درست جسم والا نوعمر لڑکا جس کا ناک چھوٹا سا چہرہ تھا اور شاعرانہ قسم کی حساس آنکھیں تھیں۔

"کیوں بوائے تمھارا عمر کتنا" اس نے منو سے پوچھا تھا۔

"پندرہ میم صاحب" منو نے جواب دیا تھا۔

میم صاحب ایک لحظہ نگاہ بھر کر اپنی گہری بادامی آنکھوں سے اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں دیکھتی رہیں، اپنے لمبے پتلے ہاتھوں سے اس کے بازوؤں میں شرارت سے ایک چٹکی لی۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور اپنا زیتونی چہرہ ذرا تان کر پتلے پتلے لبوں کو شہوت انگیز طریقہ سے دبایا، مسکرائیں اور پھر کبھی کبھی کر کے ہنس دیں۔ اسی عمر کا لڑکا انھیں چاہیے بھی تھا۔ منو اپنے آپ کو چاہے کتنا بھی معمر محسوس کرتا لیکن نہ وہ جان سکتی تھیں نہ انھیں جاننے کی پروا ہی تھی، بس انھیں ایسے ہی بوائے، ایسے ہی نوکر کی ضرورت تھی، اور انھوں نے ارادہ کر لیا کہ منو کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گی اور اس میں کوئی مشکل بھی نہ تھی کیونکہ ویسے وہ دل کی اچھی تھیں۔

مسز مینورنگ، ایک اینگلو انڈین خاندان کی نسل سے تھیں۔ اس خاندان میں چار بھائی تھے اور ان سب نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں سپاہیوں کی حیثیت سے اس وقت کام کیا تھا جب انگریزوں اور ہندستانیوں میں جنگ جاری تھی۔ اس کا دادا اندرسن کے زمانے میں جان نکلسن کے پہلو بہ پہلو لڑا تھا اور اس نے ایک مسلمان دھوبن رکھ لی تھی جس کے پیٹ سے مسز مینورنگ کا باپ ولیم اسمتھ پیدا ہوا تھا۔ ولیم اسمتھ بڑا ہو کر پورشیوں کی ایک رجمنٹ، مانزد انفنٹری، میں سارجنٹ ہو گیا۔ انیسویں صدی میں جب انگریزی حکومت نے ہندستان کی فوجوں کی نئے سرے سے تنظیم کی تو ان اسمتھ صاحب نے اپنی خدمات کا صلہ

ایک ریاست میں نوکری کی صورت میں وصول کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ اب میرا تبادلہ نیم ہندستانی فوج میں ہونے والا ہے اور دیسی ریاست میں بہرحال وہاں سے اچھا رتبہ ملے گا چاہے تنخواہ کم ہی کیوں نہ ہو لہٰذا وہ نواب ظالم پور کی فوج میں کرنل ہو کر چلے گئے۔ انھوں نے ایک انگریز بخن ڈوانیور کی لڑکی سے شادی کی تھی اور ہی اس کی اکلوتی بیٹی تھی کیونکہ شادی کے ایک سال بعد کرنل کی بیوی کرنل کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اُسے کسی اور مرد کا بچہ پیدا ہونے والا تھا۔

بچپن میں تمے کی پرورش ایک کیتھولک مشنیری کی بیوی کے ہاتھوں ہوئی۔ اور پھر وہ سیکرڈ ہارٹ کانونٹ میں شملے بھیجی گئی۔ چونکہ اس طرح اس کی پرورش انگریز بچوں کے درمیان ہوئی جو برابر "گھر" کا ہی ذکر کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اسے میں اپنے متعلق سخت احساس کمتری پیدا ہو گیا۔ اس کو کچھ کچھ علم اس بات کا تھا کہ وہ اپنی چوتھی پشت میں انگریز تھی اور یہ کہ اب اپنی دادی کی طرف سے اس میں ہندستانی خون بھی شامل ہو چکا ہے۔ لیکن اور بچوں کی برابری کرنے کے لئے وہ برابر یہ ظاہر کرنا چاہتی رہتی تھی کہ وہ پکی انگریز ہے۔ کبھی جھوٹ موٹ قصے گھڑتی کہ ہمارے خاندان کی جائداد نو مغربی آئرلینڈ میں ہے اور ہم کیلٹک نسل کے ہیں وغیرہ وغیرہ اور اپنی گندمی رنگت کو پاؤڈر کی تہوں سے دبانے کی کوشش کرتی۔ لیکن چونکہ ان سب باتوں سے خالص سفید نسل کی اور لڑکیاں اس کی نسل کے متعلق مطمئن نہ ہوتی تھیں لہٰذا وہ اسکول کی زندگی سے عاجز آ گئی اور آخر کار ظالم پور بھاگ آئی۔ اب اس کے دماغ میں یہ سمائی تھی کہ کسی طرح انگلستان جا کر اپنی اس رنگت پر سفیدی پوتائے۔ باپ کے پاس اتنا تھا نہیں کہ اسے چلینہم کے زنانے کالج میں بھیج سکتا جہاں وہ جانا چاہتی تھی، چنانچہ دونوں میں خوب لڑائی ہوئی۔ لیکن بے کی جو سفید فام بن جانے

کی خواہش تھی اس کے پورے ہونے کا ایک اور آسان تر ذریعہ نکل آیا۔ ایک نوجوان جرمن آرٹسٹ ہینرچ اوکمر جو دلیسی ریاستوں میں راجاؤں وغیرہ کی قد آدم تصویریں بنا بنا کر اور ان کی چاپلوسی کر کر کے اپنا اُلو سیدھا کیا کرتا تھا، مے کے اسی گندمی رنگ پر عاشق ہو گیا جس کی بدولت یہ سب مصیبت تھی۔ مے نے بھی اپنے دل کو سمجھا بجھا کر قائل کر لیا کہ ایک خالص جرمن سے شادی ہونا اپنی نسلی پختگی کو ثابت کرنے کے لئے زیادہ آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ جلٹنم جایا جائے اور اگرچہ بچپن میں پادری کی بیوی کی تربیت اور پھر سیکرڈ ہارٹ کانونٹ کی تعلیم نے اس کے دل میں جنس کی طرف سے ایک قسم کی نفرت سی اور خوف سا پیدا کر دیا تھا پھر بھی اس نے ہینرچ اوکمر سے شادی کر لی۔

بدقسمتی سے مے کی شادی کے دو ہی سال بعد جنگ چھڑ گئی اور اس جرمن کو نظر بند کر دیا گیا۔ اب تک مے کے ایک لڑکی اس جرمن سے پیدا ہو چکی تھی، جس کا نام نہایت ہی رومانوی قسم کا یعنی پنیلوپ، رکھا گیا تھا اور جنگ چھڑنے کے کچھ ہی دن بعد ایک بیٹا اور پیدا ہوا۔

کچھ عرصہ تک تو وہ اپنے شوہر کی جدائی کا غم کھاتی رہی لیکن واقعہ یہ تھا کہ وہ اصل ذہنی اور جسمانی دونوں طرح وہ کبھی اپنے شوہر کی نہ ہوئی تھی۔ ویسے تو جب اس کا شوہر جسمانی طور پر اس کے کنوارے پن کو توڑ چکا تو وہ برابر اظہار شہوانیت میں اس سے نمبر لے جانے کی کوشش کرتی رہی لیکن باطنی طور پر وہ ابھی تک کنواری تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی بچپنے کی عیسائی تربیت برابر اُسے پیچھے کھینچے لئے جاتی تھی۔ اس کے وجود میں جو گرمی، نفسانیت اور شہوانیت کی اہلیت تھی اس کی وجہ ضرور وہ خون رہا ہوگا جو اس کی ہندستانی دادی سے اُسے ورثہ میں ملا تھا، اور اس کے مزاج کی ایک عجیب سی ٹھنڈک، ایک

جمود، جس کی بدولت، وہ ایک مرتبہ اپنے جسم کی آگ بجھانے برف سے ٹھنڈے پانی کے ٹب میں کود پڑی تھی، یہ سب ان یورپین اور عیسائی اصولوں کا نتیجہ تھے جو گناہ کے متعلق اس کے ذہن نشین کئے گئے تھے۔ اس کے وجود میں یہ دو متضاد چیزیں جو پائی جاتی تھیں ان کی وجہ سے وہ عجیب پستی میں مبتلا تھی۔ اکثر وہ جذبات کے معمولی ابھار سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو لوگوں کے حوالے کر دیتی تھی اور بعد میں پچھتایا کرتی۔ چنانچہ ظالم پوپ اسٹیٹ کے وزیر تعلیم پر اپنا جادو ڈال کر اس نے ایک بچوں کے اسکول میں ٹیچر کی جگہ حاصل کر لی۔ نوکری کی خاطر اور بھی کتنے ہی لوگوں کی اس نے خوشامد کی۔ عورت خوبصورت تھی اور ایسی فضا میں جہاں عورتوں کو مردوں سے چھپا کر پردے میں بند رکھا جاتا ہے، اس پر تمام ہندستانی اور انگریز امیروں، بڑے بڑے افسروں، ججوں وغیرہ کی نگاہیں پڑنے لگیں۔ اگر اس کا ذہن جنس کو گناہ سمجھنے کے اصول کے خلاف بغاوت نہ کرتا ہوتا، تو بے شک اس کا کیریکٹر اتنا مضبوط بن سکتا تھا کہ مردوں کے اس ریلے کو روک لیتا لیکن اس کی تو یہ حالت تھی کہ ایک طرف تو وہ اس اصول کو غلط سمجھتی تھی، دوسری طرف نفسانی خواہشات تھیں کہ بڑھتی ہی جاتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی کیفیت ایک کتیا کی سی ہو کر رہ گئی جو اپنے جنگلے کے آس پاس بھونکنے والے سب کتوں کے لئے موجود ہو۔

نواب گی فوج میں ایک ایرانی کپتان آغا رضا علی شاہ تھا۔ شاعرانہ مزاج پایا تھا۔ چنانچہ اس کی سیاہ زلفوں کے جال میں پھنس گیا۔ اس نے تے سے آدھر کو طلاق دلوائی اور خود اس سے شادی کر لی۔ اسے دراصل تے سے محبت تھی اور اس کو کافی خوش بھی رکھتا کیونکہ اب تک سے کو جتنے عشاق ملے تھے وہ ان سب سے اچھا تھا، ہنر مند اور دربار عام کے خوشامدیوں اور مفرور

احمقوں سے زیادہ متمدن اور مہذب، لمبے قد کا مضبوط اور تنومند جوان، لیکن اب پھر مے کو انگریزی نسل سے رشتہ ملانے کا شوق بے قرار کرنے لگا۔ اس نے ظالم پور کے کینٹونمنٹ اور انگریزی رجمنٹوں میں گھومنا پھرنا شروع کیا، اور اپنے شوہر کے جذبات کو اتنا صدمہ پہنچایا کہ اس نے ایک دن حد کے مارے، اُسے خوب پیٹا اور لات مار کر بنگلے کے باہر کر دیا۔

مے کو اس بات سے کوئی خاص رنج نہیں پہنچا کیونکہ اس درمیان میں وہ رائل فزیلیرز کے ایک کیپٹن: گائی ہینورنگ سے، جو خالص انگریز تھا، معاشقہ کر رہی تھی۔ گائی اس سے عمر میں کہیں چھوٹا تھا، لہٰذا کسی معمر مرد کے مقابلہ میں اس کو پھنسا لینا زیادہ آسان تھا۔ چنانچہ اس نے اس سے کہدیا کہ میرے تو بھتار اچھے ہونے والا ہے۔ اور اس کے بعد گائی کی انگریزی شرافت اور بہادری بھلا کب اُسے پھنسنے سے باز رکھ سکتی تھی۔ مسلمانوں میں چونکہ طلاق آسانی سے مل جاتا ہے لہٰذا مے نے رضا علی سے طلاق لے لی، گائی سے شادی کر لی اور یہ طے ہوا کہ ہنی مون کا زمانہ "گھر" پر یعنی انگلستان میں گذارا جائے۔ گائی نے چھ مہینے کی چھٹی لی اور اُسے اور اس کے بچوں کو لے کر لندن گیا۔ یہاں مے کے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا رنگ کافی سانولا تھا۔ گائی کو یہ وہم ہو گیا کہ لڑکی اس کی شکل سے کم ملتی تھی اور کیپٹن رضا علی سے زیادہ۔ اور پھر ایک دن یہ وہم ثابت بھی ہو گیا۔ مے نے ایک دن ہوش کے عالم میں اپنا گناہ قبول کر لیا، گائی کے والدین جو اپنے خالص خون اور انگریزی حسب نسب پر نہایت فخر کیا کرتے تھے، پہلے ہی اپنے لڑکے کی اس حماقت کا حال سن چکے تھے اور انھوں نے اس سے کسی قسم کا واسطہ رکھنے سے قطعی انکار کر دیا۔ اب گائی نہایت پریشان اور بالکل تنہا ہو گیا۔ بے چارگی کے اس احساس کو

مٹانے کے لئے وہ مے کے آغوش کی پناہ ڈھونڈنے لگا جیسے کوئی بچہ ماں کی گود میں چھپ جانا چاہتا ہو۔ تمام انگریزی قوم کی طرح اس کے بھی خون میں یہ ودیعت تھا کہ حقیقت سے بھاگنا چاہیئے لہذا اس نے شتر مرغ کی طرح اپنا سر مٹی میں دے دیا اور اپنے سرکاری کاموں میں اپنی زندگی کو بھلا دینا چاہا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس معاملے کو نباہ دے گا اور چاہے دوسرے معاملات میں وہ کتنا ہی صاف کیوں نہ رہا ہو لیکن اس کی اتنی ہمت نہ پڑتی تھی کہ مے سے ان معاملات کو صاف کرلے۔

جب گائی کی چھٹی ختم ہوگئی اور وہ پشاور جانے لگا کہ اپنی رجمنٹ میں شامل ہو تو مے نے "گھر" ہی رہنے پر اصرار کرنا شروع کیا۔ آخر یہ بہت اُسے برسوں کے انتظار کے بعد ملی تھی۔ اس نے یہ بہانہ بنایا کہ وہ پولیٹیکنیک میں پڑھانے کی کوئی ڈگری حاصل کرنا چاہتی ہے اور بچوں کو اسکول میں داخل کرنے سے پہلے ان کا سب انتظام کر دینا چاہتی ہے۔ کم عمر احمق گائی پھر اس کی باتوں میں آگیا۔ مے کی آغوش میں اُسے جو لذتیں نصیب ہوئی تھیں ان کی یاد نے اُسے بالکل مے کا غلام بنا دیا تھا اور وہ اس کے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح ناچتا تھا اور اس کی جائز اور ناجائز ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس نے نہایت خوشی سے اپنی آدھی تنخواہ اس کو دینی منظور کرلی اور اپنی ماں، جو یکایک اس صدمے کی تاب نہ لاکر ختم ہوگئی تھی، کی جو کچھ جائداد ملی تھی اس میں سے بھی آدھا اس کے نام لکھ دیا پشاور میں جب وہ مسلمان قبیلوں سے لڑتا اور سلطنتِ انگلشیہ کے حدود کی حفاظت کرتا رہتا تو مے کو نہایت محبت بھرے خطوط لکھا کرتا۔

ادھر تمے نے اتنا کافی روپیہ پاکر، سینماؤں، تھیٹروں، شراب کی محفلوں اور رات کے کلبوں کی رونق بن بن کر، اپنی قوم کے رومانی اوقات کو پورا کرنا شروع کر دیا۔ وہ بے وائر میں رہتی تھی اور ان تمام اینگلو انڈین لوگوں سے ملتی جلتی تھی جو ہندستان سے واپس آکر اب اس علاقہ کے بورڈنگ ہاؤسوں میں پڑے سڑ رہے تھے، نہ تو انھیں ہندستان سے اب کچھ مطلب تھا، نہ ان کی اپنی قوم انھیں منہ لگاتی تھی۔ اس طرح وہ اپنے نسلی امتیاز کو اپنے زعم میں خوب پکا کرتی رہی۔ جب اُسے اپنے پکے ہونے کا کافی یقین ہو چکا، اور اپنے دل کو نسلی لحاظ سے مطمئن کر لیا تب اُسے اصلی تہذیب اور تمدن کی تلاش ہوئی کیونکہ یہ اینگلو انڈین لوگ تو بالکل کھوکھلی زندگی بسر کرتے تھے، تمام دنیا کو جیت چکے تھے لیکن اس کے عوض میں اپنی روح کو کھو چکے تھے۔ اس نے ایک نوعمر شاعر کے ذریعہ بوہیمیا جانے کا دعوت نامہ حاصل کیا۔ اس نے اس شاعر کی بڑی چاپلوسی کی تھی۔ ایک مرتبہ جب وہ لیکچر دے رہا تھا تو اپنی آٹو گراف بک لے کر اس کے پاس پہونچ گئی اور اُسے ایسا بنایا کہ اس کی معشوقہ بن گئی۔ ایک ایک مصرعہ کو معرکتہ الآرا سمجھتی تھی اور ہر تصویر کو آرٹ کا ایک بڑا مرقع۔ اور جو آرٹسٹ یا شاعر اس کا ذرا بھی نوٹس لیتا اس کے ساتھ سونے میں ذرا نہ ہچکچاتی۔ لیکن چونکہ اسے سستے قسم کے ہالی وڈ کے فلموں کے متعلق ٹرٹر کئے جانے اور خود کو بڑا دولت مند اور متمدن سمجھنے کے سوا اور کچھ نہ آتا تھا لہٰذا لوگ اس سے بہت جلد بیزار ہو جاتے تھے اور ایک فضول سی عورت سمجھ کر کترانے لگتے تھے۔

گاڈی اس درمیان برابر، پابندی کے ساتھ، اسے خط لکھتا رہتا تھا، اور ہندستان آنے کے لئے منتیں کرتا رہتا تھا، پہلے تو وہ رالف مینلوپ

اور چھوٹی بچی کی دیکھ بھال کا بہانہ کر کے ٹالتی رہی۔ لیکن یہ بہانہ کب تک چلتا اور پھر ایک دن اُسے یکایک یہ خیال آ گیا کہ گائی نے اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے، چنانچہ اس نے یہاں تک مان لیا کہ ایک سال کے لئے چھوٹی بچی کو لے کر ہندستان آئے گی، دونوں بڑے بچے بورڈنگ اسکول میں رہیں گے۔ لیکن گرمی کا موسم تھا اور اس نے کہا کہ وہ پشاور میں رہ کر وہاں کی گرمی برداشت نہ کر سکے گی لہٰذا گائی نے موسم بھر کے لئے اس کے واسطے شملے میں ایک مکان کرائے پر لے دیا۔ اور چنانچہ اس وقت، جب کہ وہ نیچے گرمی میں بھن رہا تھا، مے اور اس کی بچی، منو کو ساتھ لئے، حکومت ہند کے دارالسلطنت میں رہنے جا رہے تھے۔ گائی نے کہا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح پندرہ دن کی رخصت لے کر آ جائے گا، مگر تے کو اس کی کیا پرواہ تھی۔

منو اُسے دبے دبے تعجب اور حیرت سے دیکھ رہا تھا، اُسے کافی خوشی ہو رہی تھی۔ ابھی تک کسی گوری چمڑی والی عورت نے کیا کسی بھی عورت نے اس کی طرف اس طرح نہ دیکھا تھا۔ شام نگر میں شیلا کے متعلق اس کے دل میں جو جوش پیدا ہوا تھا اس پر وہ خود متعجب تھا اور سمجھ نہیں سکا تھا، پربھا کی بیوی کے گلے لگنا اُسے بہت اچھا لگتا تھا اور لکشمی سے تو اسے اچھی خاصی محبت ہی تھی۔ مگر ان میم صاحب کی مسکراہٹوں، ان کی چٹکیاں بھرنے اور تھپکنے سے اس کے دل میں جو جوش اور تحریک ہوتی تھی وہ تو بالکل ایک الگ ہی احساس تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی دبی ہوئی مگر طبیعت میں کسی ایسے ویسے خیال کو تو آنے بھی نہ دے سکتا تھا۔ مسرت کے حدود پر وہ نیم خوفزدہ کھڑا دل ہی دل میں اپنی خوش قسمتی کو سراہ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میم صاحب جو اتنی مانوس ہو گئی ہیں تو کیا اس میں مہربانی اور خدا ترسی کے علاوہ اور بھی کوئی

بات ہے۔

اب وہ ہمالیہ کے دامن میں کالکا تک پہنچ چکے تھے، میم صاحبہ اسٹیشن کے ریفریشمنٹ روم میں کھانا کھانے چلی گئیں پہاڑوں کی بلندی کی جو محبت منو کے خون میں ودیعت تھی وہ عود کر آئی اور وہ مسلمان شوفر کے ساتھ برآمدے میں بیٹھا بیٹھا پہاڑوں کو تکتا رہا۔ شوفر اب پہلے کے مقابلے میں کسی قدر نرم پڑ گیا تھا۔ سیدھے سیدھے پہاڑ ایک دم اوپر کو اٹھے ہوئے تھے، اور ان پر ٹھنڈی سبز گھاس اُگی ہوئی تھی، جگہ جگہ سے چھوٹے چھوٹے آبشار گر رہے تھے۔ موسم بہار کی خنک ہوا چل رہی تھی اور سورج بالکل اسی طرح پہاڑوں کے پیچھے سے نکلا ہوا تھا جیسے کانگڑا کی پہاڑیوں پر نکلتا تھا، البتہ بادل کے کچھ ہلکے ہلکے ٹکڑے تیزی سے آسمان پر بہتے ہوئے ہمالیہ کی چوٹیوں پر آکر ٹھہر جاتے تھے۔

میم صاحب جلدی جلدی لپ سٹک کرتی آ ہی گئیں، اور اپنی سنگار پٹار کی چیزوں کا جائزہ لینے لگیں، کہیں بیگ کھویا اور ڈھونڈا، کہیں پن گرا دی تو ملی ہی نہیں۔ کبھی ننھی سرسی کو ڈانٹا کہ ڈھنگ سے رہے، ادھر ادھر پھسل مٹھائی نہ خریدتی پھرے۔ پلیٹ فارم پر پہنچ کر منو کو بہت سے احکامات ایک ساتھ دیدیئے، پلیٹ فارم پر کئی انگریز سوجھوں نے اُسے دیکھ کر سیٹیاں بجائیں اور خوب پریشان کیا۔ پھر اسٹیشن ماسٹر سے جسے پہلے سے جانتی تھی، باتیں کر کے ذرا اپنی شان جتانے لگی، چھوٹی لائن کی گاڑی کے پاس ادھر سے ادھر ٹہلنے لگیں۔ گاڑی میں ہر جگہ انگریز عورتیں، مرد اور بچے بھرے تھے۔ ہندستانی کلرک، پہاڑی لوگ دوکاندار بھی اپنا سامان وغیرہ سنبھالے بیٹھے تھے۔ موٹر اب چلنے ہی والی تھی، جلدی جلدی ڈرائیور کو احکامات دیئے جا رہے تھے کہ

پچاس میل لمبے سفر کے لئے سب سامان ٹھیک کرلے۔ آخر کار موٹر روانہ ہوئی اور سڑک کے پر پیچ موڑوں پر ہوتی ہوئی چل پڑی۔ سڑک کے گھما و اور پیچ دیکھ کر تو منو بھی دنگ رہ گیا۔

اُسے اب زندگی کی طرف سے کافی اطمینان تھا خاص کر اس لئے بھی کہ میم صاحب نے اُسے خود اپنے ہاتھوں سے سیب، کیلے اور مٹھائیاں دی تھیں، اور وہ اب اپنی بے چین، ہمیشہ نئے نئے تجربات کی تلاش میں رہنے والی، بھوری آنکھیں گھما گھما کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ چھوٹی سی ریل دیکھ کر تو حیرت میں رہ گیا جو اس نے کالکا کے اسٹیشن پر کھڑی دیکھی تھی۔ اب وہ دھوئیں کے بادل اڑاتی اونچی بلندیوں پر چڑھتی چلی جا رہی تھی جیسے کوئی بچہ پہلے پہل پاؤں چلنا سیکھے۔ لمبے لمبے بوگدوں میں سے گھستی وہ برابر موٹر کے ساتھ ہی ساتھ چلی آ رہی تھی حالانکہ دیکھنے میں اس کی رفتار بہت سست معلوم ہوتی تھی۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ کاش اس ریل ہی سے سفر کرتے اور ترسی جو اس ریل میں بیٹھی لے رہی تھی اس سے تو اس کا جوش اور بھی بڑھ گیا۔

پہاڑ کے دامن میں اِدھر اُدھر کہیں کہیں جو مکانات بنے ہوئے نظر آ رہے تھے ان کو دیکھ کر منو کو اپنا گھر یاد آ گیا اور گاؤں چھوڑنا کل کی سی بات معلوم ہونے لگا۔ دور ایک چوٹی پر ایک پرانا قلعہ تھا جس کی موجودگی نے ان خیالات کو اور بھی بڑھایا کیونکہ وہ حمیر پور والے درگا کے ٹوٹے پھوٹے مندر سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ اور پانی کے وہ تیز بہتے ہوئے نالے تو اور بھی تمنا پیدا کئے دیتے تھے۔ اپنے دل ہی دل میں اپنے آپ کو ان ڈھلوان سیدھی چٹانوں پر چڑھتا تصور کرنے لگا۔ جیسے اناج بوئے جانے سے پہلے ہل چلے ہوئے کھیتوں میں دوڑ رہا ہو۔ وہ بالکل اپنے اصل روپ میں آ چکا تھا۔

لیکن جیسے جیسے موٹر اوپر چڑھتی گئی ہوا کی خنکی اور تیزی بڑھتی گئی، اور پہاڑ کے دامنوں میں اوپر نیچے لگے ہوئے دیودار اور شیشم کے بڑے بڑے درخت اس کے تصور کو جھٹلانے لگے۔ یہاں تک کہ سولن آگیا، مسز مینورنگ چائے پینے کے لئے ٹھہریں اور منو کو سولن کے ماڈرن قسم کے بازار، کپڑے کی دوکانیں ہوٹل وغیرہ دیکھ کر غور کرنے کے لئے ایک نئی بات ہاتھ آگئی۔ کاش اس کے اپنے گاؤں میں بھی ایسا بازار ہوتا تو پھر وہ کیوں ان بڑے بڑے شہروں کو دیکھنے کی خواہش کرتا۔

لیکن وہ خدا کا مذاق اڑانا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ اس کی نگاہوں کے سامنے کچھ قلی اور پہاڑی لوگ پیٹھ پر بوروں کے بوجھ دبے، پیدل اوپر چڑھ رہے تھے اور اُسے خیال ہوا کہ یہ خدا ہی کی تو مہربانی تھی کہ وہ موٹر کار میں بیٹھا جا رہا تھا۔ درختوں، مکانوں، ٹٹوؤں اور انسانوں کے پاس سے تیزی سے گذرتے ہوئے اوپر چڑھنا، بلند تر ہوتے جانا، بادلوں سے بھی اوپر چڑھ جانا کیسا پر لطف تھا۔ اور جب موٹر اس بڑے سے محل کے پاس سے گذرا جسے مسز مینورنگ نے اپنی لڑکی کو وائسرائے کا محل بتایا، بڑے بڑے دفتروں، بنگلوں اور جھونپڑوں کی گنجان آبادی سے گذرنے لگا جو پہاڑ کے اس سطح حصے پر بنے تھے، تو منو اپنی جگہ پر نہایت محفوظ، شان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اور قلی تو مسافروں کا سامان اٹھانے کے لئے آپس میں لڑ رہے تھے اور منو رکشا میں بیٹھا انڈیل کی طرف جا رہا تھا۔ رکشا جسے اور قلی کھینچ رہے تھے ——— اور وہ بہت ہی خوش تھا۔

میم صاحب کے نوکر کی حیثیت سے منو کو ایک نئی ہی قسم کی زندگی کا عادی ہونا پڑا۔ اس کے سپرد کوئی خاص کام نہ کیا گیا تھا۔ صرف اُسے میم صاحب

کے بلانے پر حاضر ہونا پڑتا تھا۔ جب کبھی بھی، جو کچھ بھی وہ حکم دیتیں وہ کر دیتا لیکن باوجودیکہ وہ کسی خاص کام پر مامور نہ تھا پھوپھی ہاؤس میں اس کی زندگی ایک خاص ڈھرے پر چلنے لگی۔

روز صبح خانساماں الہ داد خاں اس کو ٹہکے ہی اٹھا دیا کرتا تھا۔ شاگرد پیشہ کی تاریک کوٹھریاں بنگلے سے کوئی بیس گز نیچے تھیں اور وہیں ایک کوٹھری کے کونے میں منو سویا کرتا تھا۔ اسی کوٹھری میں کھانا وغیرہ بھی پکتا تھا۔ منو کو اٹھ کر آگ جلانی ہوتی تھی، اور میم صاحب کی چائے کا پانی چڑھانا ہوتا تھا۔ اس عرصہ میں الہ داد بیٹھا داڑھی پر ہاتھ پھیرا کرتا اور پاخانہ جانے سے پہلے حقہ پیا کرتا۔ منو نے جلدی جلدی چائے بنائی، کشتی الہ داد کو دکھائی کہ سب چیزیں ٹھیک ہیں اور پھر اوپر میم صاحب کے بیڈ روم میں لے گیا۔ اتنے میں ننھی سرسی اٹھ بیٹھی۔ رات کے کپڑوں میں ادھر ادھر اچھل کود شروع کر دی اور چائے مانگنے لگی۔ مسز مینورنگ جو رات کو دو تین بجے سوئی تھیں بچی کو ان کی نیند خراب کرنے پر آسے کوسنے لگیں اور اسے ڈانٹنے لگیں کہ جب تک دانت صاف نہ کرو گی اور منہ نہ دھوؤ گی چھوٹی حاضری نہ ملے گی۔ لیکن وہ بچی بھی بڑی ہی ضدی، خود سر اور بے کہی تھی اور ہمیشہ اپنی خوشامد کروانا چاہتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسز مینورنگ نے اُسے دو چار تھپڑ لگا کر نیچے شاگرد پیشہ میں بھیجدیا۔

خود وہ اپنے رات کے پاجامہ پر ایک ملا دلا میلا اسکرٹ اور نائٹ گون پر ایک سرخ پولو سویٹر پہن کر اور مائیکل ارلن کی ناول، سبز ٹوپی، ہاتھ میں لئے، چسکی لے لے کر چائے پینے لگیں۔

منو اس درمیان بیٹھنے کے کمرہ اور برآمدے وغیرہ میں جھاڑ پونچھ اور صفائی کرنی شروع کر دی۔ اپنے پاؤں تلے اخنڈیل کا سرسبز بارش میں بھیگا

ہوا ماحول دیکھ کر اُسے بڑی مسرت ہوتی اور دیودار کی گہری لطیف خوشبو سے اُسے سرور سا ہونے لگتا۔

مسز مینورنگ نے دیکھا کہ وہ کتنی توجہ اور تندہی سے، نہایت اطمینان اور یکسوئی سے قالین پر برش کر رہا ہے، فرنیچر پونچھ رہا ہے، فرش پر جھاڑو دے رہا ہے اور وہ سوچنے لگیں کہ بھلا یہ کیا سوچ رہا ہے، سوچ سکتا بھی ہے یا نہیں کاش وہ اسے اپنے پاس بلا کر اس سے باتیں کر سکتیں۔ لیکن وہ تو ایک معمولی نوکر تھا۔ وہ ایسا سوچ بھی کیسے سکتی تھیں۔

"دنیا آخر سمجھتی کیوں نہیں"۔ وہ اپنے دل میں سوچنے لگیں، کہ عورت کس کس طرح اپنے آپ کو حوالے کر سکتی ہے! محبت سے، نفرت سے رحم سے، پیار سے، کھیل سے، اور سینکڑوں اور جذبات کی رَو میں آخر لوگوں کو کیا حق ہے کہ کسی کے متعلق فیصلہ کر دیں۔ آخر میں اپنے آپ کو اس لڑکے کے حوالے کیوں نہیں کر سکتی"۔

منو کے نوجوان جسم کی گولائیاں، اس کی تیزی اور پھرتی، مسز مینورنگ کے تمام وجود میں ایک عجیب قسم کی بے چینی پیدا کر رہی تھی۔ لیکن وہ ان تمام نفسانی اور شہوانی خواہشات کے وجود کا الزام شعلے کی ہوا کے سر لگا رہی تھیں۔ چنانچہ وہ اٹھیں اور بیڈ روم میں ادھر ادھر گھومنے لگیں، اور اپنے سیاہ لانبے بالوں میں، جن میں قبل از وقت کہیں کہیں سفیدی آچلی تھی، کنگھی کرنے لگیں اور منھ پر پاؤڈر اور سرخی ملنے لگیں۔

منو جس کو ان کے ان پُراسرار سنگاروں سے قدرتی طور پر دلچسپی تھی، بیڈ روم میں دبے پاؤں اِدھر اُدھر چیزیں ٹھیک کرتا پھرنے لگا، لیکن میم صاحب سے کافی فاصلے ہی پر رہا۔

مسز مینورنگ جس خواہش کو دبانے کے لئے ڈریسنگ ٹیبل کے قریب آکر سنگار میں مصروف ہوئی تھیں وہ پھر ابھر آئی۔ ایک عجیب سی بے چینی پیدا ہو کر ان کا دل دھڑکنے لگا۔

"ہوائے! ذرا مجھے گول کمرے سے قینچی لا دو،، انھوں نے اپنے جذبات کو دباتے ہوئے حکم دیا۔

"بہت اچھا میم صاحب،، منو نے جواب دیا اور ان کے حکم کی تعمیل کو دوڑا۔

جب وہ قینچی لے کر آیا تو انھوں نے قینچی لیتے ہوئے اس کا ہاتھ جان بوجھ کر پکڑ لیا، حالانکہ انھیں معلوم تھا کہ جھاڑ پونچھ کرنے سے اس کے ہاتھ بالکل میلے ہو رہے ہیں اور کہنے لگیں:

"اے گندہ لڑکا، دیکھو تمھارے ہاتھ کتنے میلے ہو رہے ہیں، اور ناخن تو دیکھو اپنے، معلوم ہوتا ہے مدتوں سے نہیں کٹے۔ جا ہاتھ دھو کر آ، ہم تیرے ناخن کاٹ دیں گے،،

منو خوشی خوشی ان کا حکم بجا لایا، کیونکہ گذشتہ شب اس نے انھیں عجیب عجیب قسم کے اوزاروں سے ناخن کاٹتے اور بناتے دیکھا تھا۔ ان اوزاروں کو وہ ایک مخملی بکس میں رکھا کرتی تھیں۔

مسز مینورنگ نے منو کے ہاتھوں کو نہایت ہی پیار سے دبایا اور ٹھیک ٹھاک کیا، اس کی طرف دیکھ کر مسکرائیں بھی اور تجاہل عارفانہ کے ساتھ اپنی باہیں اس کے سامنے پھیلا کر کے ایک ریشمی بوڑی کھون میں ڈوبا ہوا رومال، اس کے منہ پر مارا۔ پھر انھوں نے بڑی ہی جوشیلی اور جذباتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے ناخن وغیرہ کاٹ کر کہنے لگیں۔

"خوبصورت لڑکا! پیارا لڑکا۔ بس اب تم بیوی مانگتا"

مسز مینورنگ کے ہاتھوں کے لمس سے منو کے بدن میں تھرتھری پیدا ہو گئی اور وہ کانپتے لبوں سے مسکرا دیا۔ مسز مینورنگ کے نخرے بھرے انداز اور حرکتوں سے اس کو ایک عجیب نشیلا سرور محسوس ہونے لگا۔ اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لئے اس نے سر جھکا لیا لیکن اپنے دل کی بھڑکتی ہوئی آگ پہ قابو نہ رکھ سکا اور آنسوؤں اور بوسوں کا ایک سیلاب لئے اُن کے پاؤں پر گر پڑا۔ یکایک انھوں نے اُسے دھکا دے دیا اور چیخنے لگیں۔

"کیا گستاخی ہے! اتنی ہمت! جا اپنا کام کر۔ چل کام سب پڑا ہے۔ ناشتہ لا"۔

منو نہایت ہی شرمندہ اور پشیمان، شاگرد پیشہ کی طرف بھاگا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میم صاحب کے سامنے کس منہ سے جائے گا۔ لیکن اُسے ان کے سامنے آنا ہی پڑا کیونکہ ناشتہ میز پر لگانے کے لئے تیار رکھا تھا۔ لیکن جب وہ میز لگانے آیا تو مسز مینورنگ اور بھی مصیبت کر دی۔ بار بار پوچھنے لگی۔

"روکیوں رہے ہو؟ میں نے تمھیں مارا؟"

پھر بھی ناشتے کے دوران میں وہ اپنی تکلیف کو قطعی بھول گیا۔ مسز مینورنگ کے گھر گذشتہ تین سال سے جہاں کہیں بھی ان کا گھر رہا تھا ناشتہ بڑے اہتمام سے ہوا کرتا تھا۔ آٹھ بجے صبح سے ہو شروع ہوتا تو بارہ ساڑھے بارہ بج جاتے۔ اور یہ سب قصہ ڈاکٹر گی ہدایت کے مطابق ہوتا تھا کیونکہ مسز مینورنگ ایک زمانے میں بیمار رہ چکی تھیں، بہت ہی بیمار، ان کے مثانے میں پتھری ہو گئی تھی۔ لندن کے تین ہسپتالوں میں مختلف سرجنوں نے انہیں

رائے دی تھی کہ آپریشن کروا کے پتھری نکلوا ڈالیں۔ لیکن وہ خود نہیں چاہتی تھیں کہ جسم کا کوئی بھی حصہ کاٹا جائے۔ حالانکہ ان کے خیال میں اگر کمر کے نیچے کا حصہ تراش دیا جا سکتا تو انھیں کوئی اعتراض نہ ہوتا کیونکہ خدا نے اس حصہ جسم کو جس گندے استعمال کے لئے بنایا تھا اس سے انھیں نفرت تھی۔ بہر حال آپریشن سے انکار کر کے لیکن اپنے آپ کو بیمار سمجھتے ہوئے وہ ڈاکٹر ہسٹنیفسن کے پاس گئیں جو غذا کے ذریعہ علاج کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہسپتال کی یہ تمام گولیاں اور مکسچر کھانا حماقت ہے اور وہ ایک دن میں اپنے علاج کے ذریعہ بیماری دور کر دیں گے۔

"آپ پھل زیادہ کھائیے"، انھوں نے کہا "سیب، ناشپاتیاں آڑو، انگور اور آٹھ چھلے ہوئے بادام روز کھایا کیجئے۔ نارنگی ہرگز نہ چوسئے میری ہدایت پر عمل کیجئے اور دیکھئے آپ بالکل صحت یاب ہو جائیں گی"

مسز ہینورنگ عادتاً بہت جلدی باتوں کا اثر قبول کر لیتی تھیں اور پھر جو بات ان کی سمجھ میں آجاتی ان کے لئے وہ پتھر کی لکیر بن کر رہ جاتی تھی۔ غذا کے متعلق یہ ہدایتیں ان کو کچ کچ گئیں کیونکہ کئی مہینوں سے لگاتار وہ غذا میں بے احتیاطی برت رہی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے سیب، ناشپاتیاں آڑو، انگور اور بادام اپنے صبح کے ناشتے میں شامل کر لئے۔ پھلوں کے لطیف مزے کا اثر یہ ہوا کہ وہ اپنے آپ کو صحت یاب سمجھنے لگیں۔ حالانکہ واقعہ دراصل یہ تھا کہ بیمار وہ کبھی بھی نہیں تھیں۔ صرف دوستوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے وہ ننھی منی نازک بیمار بنی رہتی تھیں۔

لیکن اب ایسے تر و تازہ ناشتے سے انھیں بے حد لطف آتا تھا۔ خاص کر اس وجہ سے اور بھی کہ پھلوں کے ناشتہ میں کافی دیر لگتی

جا سکتی تھی اور یہ وقت بتانے کا ایک آسان طریقہ تھا۔ دھیرے دھیرے وہ ناشپاتیوں، سیبوں، آڑوؤں حتیٰ کہ انگوروں کو بھی چھیلتیں، بڑی احتیاط سے، ایک ایک کر کے چھلکے تشتریوں، پلیٹوں، اور تمام میز پر پھیلاتی جاتیں یہاں تک کہ میز بالکل گھناؤنی لگنے لگتی۔ اور وہ رات کے کپڑوں پر وہی ملگجا سرخ جمپر اور سیاہ اسکرٹ پہنے مجسم پریشان حالی بنی بیٹھی رہتیں۔ ناشتہ ختم کرتے کرتے ان کا دل الماری میں رکھی ہوئی برانڈی اور جن کی بوتلوں پر للچنے لگتا، اور جب بھوک کھلنے کا یہ نسخہ بھی آزمایا جا چکتا تو لنچ کا اعلان ہو جاتا کیونکہ خاں ساماں الہ داد خاں اور جو کچھ بھی ہو لیکن وقت کا تو ایک ایک منٹ سے پابند تھا۔ ظاہر تو وہ یہی کرتا تھا کہ یہ وقت کی پابندی میم صاحب کے حق میں اچھی ہے لیکن دراصل وہ چالاک بڈھا جانتا تھا کہ اگر لنچ ٹھیک وقت پر نہ ملا تو پھر شام اور دوپہر کے درمیان میم صاحب خریداری کرنے نکل جائیں گی، انھیں اور بازار کے تمام بھاؤ معلوم ہو جائیں گے اور پھر اُسے وہ کمیشن بھی نہ مل سکے گی جو وہ تمام دوکانداروں سے لیا کرتا تھا۔ مثلاً میم صاحب جو تمیں روپے اُسے دیتی تھیں، وہ اس کی بیوی، بیٹی کے کھانے اور لڑکے کی پڑھائی کے واسطے بالکل ناکافی تھا۔ لہٰذا اگر وہ اس طرح کمیشن نہ لیتا تو پھر اپنے بڑھاپے کے لئے چار پیسے کس طرح جوڑتا! اور ویسے بھی امیروں کو لوٹنے میں آخر حرج ہی کیا تھا؟ صاحب لوگ کے پاس کافی پیسہ ہوتا تھا صرف ہندستانی ہی غریب تھے۔

میم صاحب حضور کو ڈنر پر کیا مانگتا؟ الہ داد بڑی سنجیدگی سے سفید کوٹ پہنے سفید صافہ باندھے اور کمر میں سرخ پیٹی لگائے میز کے کنارے آکر کھڑا ہو گیا۔ ٹم ٹم (ٹماٹر) سوپ، مچھی (مچھلی)، اسکانیہ (پیاز اور گوشت)

پلم پڈ (پلم پڈنگ) اور رائٹ ؟"

"نہیں الہ داد" مسز مینورنگ بولیں "رات کا کھانا اسٹوارٹ میم صاحب کے یہاں نیچے۔ پر تم سرو کرنے کو آنا"

اور رائٹ میم صاحب" الہ داد پر جیسے اوس سی پڑ گئی اور وہ چڑھ سا گیا۔ یہ اسٹوارٹ میم صاحب بڑی کائیاں تھیں سب کچھ جانتی تھیں کالی میم صاحب جوتھی نیٹو کہیں کی۔ اصلی صاب لوگ بھلا بانار کے بھاؤ کیا جانیں۔ اگر الہ داد کو معلوم ہوتا کہ مینگ صاحب کے بھی کالی میم تھی تو وہ یہ نوکری تھوڑا ہی کرتا۔ خیر جب تک ہو سکے گا اٹھائے گا۔ دیکھیں تو یہ کالی میم کتنا جان سکتی ہے کیونکہ یہ تو اُسے یقین تھا کہ بڑے بڑے جاننے والے بھی اس کے خود کے برابر نہیں جان سکتے تھے۔

"بوائے سے بولو" مسز مینورنگ نے حکم دیا کہ "اڈے پر جا کر رکشا بلا لائے۔ بس تین قلی مانگتا، چوتھا بوائے ہوگا"

"جی حضور" اور الہ داد جھک گیا

جب سے مسز مینورنگ نے کپڑے پہنے منو اور وہ تینوں اور قلی جنہیں وہ بلا کر لایا تھا باہر منتظر رہے۔ منو کا دل چاہتا تھا کہ کاش رکشا میں کوئی انجن لگا ہوتا کیونکہ مال کی اونچائی پر رکشا کو چڑھانے کے خیال سے اُسے وحشت ہو رہی تھی۔

لیکن شملہ میں پہیوں دار گاڑیوں میں صرف رکشا ہی کی اجازت ہے۔ صرف وائسرائے، کمانڈر انچیف اور گورنر پنجاب یہی تین عظیم ہستیاں موٹر یا گھوڑا گاڑی میں بیٹھ سکتی ہیں، ان کے علاوہ چاہے مہاراجے ہوں یا پارلیمنٹ کے ممبر سب ہی رکشا میں بیٹھتے ہیں۔ جنہیں آدمی کھینچتے ہیں

رکشا سے پہلے پہاڑوں پر ڈانڈیاں یا تام جھام استعمال ہوتے تھے۔ تام جھام تو ایک چوکھونٹی مسہری دار پلنگ کی طرح ہوتا تھا جس میں دھوپ اور بارش سے بچنے کے لئے پردے لگے ہوتے تھے۔ اگرچہ یہ سواری بیٹھنے والے کے لئے آرام دہ ہوتی تھی، لیکن قلیوں کی کمر اس سے بالکل ٹوٹ جایا کرتی تھی۔ اور ڈانڈی جو بالکل ایک تختہ کے مانند ہوتی تھی وہ اس سے بھی بُری ہوتی تھی کیونکہ اس سے قلیوں کے کندھے بالکل چھل جاتے تھے۔

لیکن ان سب باتوں سے قطع نظر، دراصل بیٹھنے والوں ہی کی پسند کے مطابق ان سواریوں کو تبدیل کیا گیا۔ تام جھام میں لیٹ کر چار آدمیوں کے کندھوں پر سوار چلنا، بالکل جنازے کے مترادف معلوم ہوتا تھا اور ڈانڈی میں اگر اوپر کی چڑھائی میں قلی زیادہ محتاط نہیں رہتے تھے تو پیچھے کو نیم قلابازی سی کھانی پڑتی تھی، باوجود کافی احتیاط کے اگر سواری بخوبی پوری ہو بھی جاتی تب بھی بیٹھنے والے کو خدا کسر شان ہی لگتی تھی۔

ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں سینٹ مارک کے گرجے کے ایک پادری ریورنڈ جے فورڈ ایس اپنے وعظ کے حاضرین میں سے اکثر کو اس طرح اپنی جان اور شان کے خطرے میں رہنے کی شکایت کرتے سنا کرتے تھے۔ اور چونکہ انھیں اس بات کا بہت خیال تھا کہ ان کے پیروؤں کی روحیں جسمانی تکالیف کے بدولت کہیں بھٹک نہ جائیں۔ لہٰذا انھوں نے اپنی تمام تر توجہ اس بات پر لگادی کہ کوئی ایسی سواری ایجاد کی جائے جو لوگوں کو اپنے اپنے بنگلوں سے گرجے تک لائے اور لے جائے۔ چنانچہ انھوں نے رکشا ایجاد کیا۔ قلیوں کو گھوڑوں کی طرح دوڑنے کی تربیت دینا کون مشکل تھا۔ چنانچہ تام جھام اور ڈانڈی لدگئیں اور رکشا نے ان کی جگہ لے لی۔ ریورنڈ فورڈ ایس کے مرنے کے

بعد پھر مغربی عقل و دانش نے، جو کام کو مکمل اور پختہ کرنے پر ہمیشہ مصر رہتی ہے، رکشے کو بہت بہتر بنا دیا۔ کہتے ہیں پہلے رکشا میں لوہے کے پہیے لگے ہوتے تھے اور غضب کا ہلتا اور اچھلتا تھا۔ اگر کوئی ٹیڑا پتھر وغیرہ ہوتا تھا تو سینکڑوں رکشاؤں کی گڑگڑاہٹ رات رات بھر سارے شملے کا سونا مشکل کر دیتی تھی۔ ۱۸۹۸ء میں ربڑ کے پہیے استعمال کئے جانے لگے اور ۱۹۰۴ء میں میونسپلٹی نے یہ ضروری قرار دے دیا کہ لائسنس صرف اُسی رکشا کو مل سکتا ہے جس میں ربڑ کے ٹائر ہوں کیونکہ لوہے کے پہیوں سے سڑک کھد کھد جایا کرتی تھی۔ اور خراب ہو جاتی تھی۔ پھر ہوا کے ٹائر لگنے لگے اب ان ٹائروں، اور گدوں وغیرہ کی عمدگی کی بدولت تو رکشا میں بیٹھنا امیروں کے لئے مسرت کا ایک ذریعہ بن گیا ہے، خاص کر اس وجہ سے بھی کہ رات رات بھر واویلا مچا دے کر جب وہ پلٹتے ہیں تو شملہ کے لوگوں کی نیند نہیں خراب ہوتی۔ گاندھی جی نے رکشا میں چلنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ انسانوں کی کھینچی ہوئی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے انھیں روحانی تکلیف ہوتی تھی۔ شملے کے لوگوں کا خیال تھا کہ تاریخ میں ایسا آدمی کبھی نہ پیدا ہوا تھا۔

شملہ کے رکشاؤں کی لمبائی نو فٹ اور چوڑائی تقریباً چار فٹ ہوتی ہے، وزن دو سو ساٹھ پاؤنڈ سے لے کر تین سو ساٹھ پاؤنڈ تک یعنی اس میں ان مردوں یا عورتوں کا وزن شامل نہیں ہے جو اس میں بیٹھتے ہیں۔ اکثر جب اونچائی پر چڑھنا ہوتا ہے تو تلی رکشوں کے اس وزن کو دل ہی دل میں خوب کوستے ہیں۔ خاص کر اگر کوئی بھاری بھرکم جناب عالی اس میں تشریف رکھتے ہوں، اور ہانپ ہانپ کر توازن قائم رکھتے ہیں لیکن یہ سب باتیں بیٹھنے والوں کو کبھی نظر نہیں آتیں کیونکہ وہ تو پیچھے کی طرف لدکر

لیٹ جاتے ہیں اب قلی کھینچا کریں، دھکا دیا کریں۔

آج پہلے دن جو منو نے رکشا کھینچا تو اُسے بڑی مشکل اور دقت محسوس ہوئی۔ کیونکہ اگرچہ مسز مینو رنگا کے خیال میں رکشا کھینچنے کے لئے کسی خاص مشق کی ضرورت نہ تھی لیکن منو کو ایسا لگ رہا تھا کہ بغیر مشق کے رکشا چلانا نہیں آسکتا۔

ایک نوجوان قلی موہن نے منو کو بتایا کہ رکشا چلانا بھی ایک فن ہے۔ جو اس نے خود بھی حال ہی میں سیکھا ہے، اور بغیر کافی مشق کے اس میں مہارت حاصل نہیں ہوسکتی۔

اس نے کہا تھا کہ اس میں ہوا کا رخ دیکھنے کی مہارت ہونی چاہئے رکشے کا توازن قائم رکھنا سیکھنا چاہیے، قدم جمے اور تلے پڑنے چاہئیں اور موڑ پر مڑنے اور چڑھائی پر چڑھنے کا انداز بھی ہونا چاہیے۔ منو نے ان تمام مشوروں کو یونہی ٹال دیا تھا۔ لیکن اب اُسے محسوس ہونے لگا تھا کہ موہن ٹھیک کہتا تھا۔

جب وہ زیادہ ہانپنے لگا اور سانس پھولنے لگی تو اور قلیوں نے اس کا دل بڑھانا شروع کیا "شاباش۔ شاباش"

اور جب انھوں نے دیکھا کہ پہاڑ بہت سیدھا ہے چڑھائی سخت ہے اور اس پر بہت زور پڑ رہا ہے، تو انھوں نے خوب زور سے کھینچنا اور دھکا دینا شروع کیا اور منو پر ترس کھا کر رکشے کا سب بوجھ اپنے اوپر سنبھال لیا۔ اب رکشا فوجی بارکوں کے پاس سے گذرا جہاں وائسرائے کے باڈی گارڈ کے کیمپ موسم بھر کے لئے ڈال دیئے گئے تھے اور ریلوے بورڈ کے دفتروں کی چھدار سڑک پر سے ہوتا ہوا آمل کی طرف روانہ ہوگیا۔

اب قلیوں کے لئے رکشے کا کھینچنا کسی قدر آسان ہو گیا تھا کیونکہ مال کی چڑھائی بتدریج ہے۔ اور جب رکشا نئے پوسٹ آفس پر پہنچ گیا جہاں اوپر کا انگریزی بازار اور نیچے کا ہندستانی بازار پھٹ کر الگ الگ ہو جاتے ہیں تو منو کو اپنے کام میں کافی جوش پیدا ہونے لگا کیونکہ انگریزی دوکانوں کے ستھرے پن اور خوبصورتی پر تو ہمیشہ سے خدا تھا اور یہاں وہ متعدد انگریزی دوکانوں کے درمیان سے رکشا کھینچ کر لے جا رہا تھا، وھائٹ وے لیڈلا کی چمکتی کھڑکیاں، لارنس اینڈ مینو، صاحب سنگھ اینڈ کمپنی کیمسٹ، دی ماڈرن بک شاپ، جونس اینڈ جونس جوہری اور چاندی کے سامان والے محمد گل سمور والا، ہوانگ چینی شومیکر اور انگریزی مذاق کی دوسری چیزوں کی دوکانیں سبھی تھیں۔

ایک مرتبہ پورے مال پر سے اس طرح لدے ہوئے گذر جانے کے بعد مسز مینورنگ کو اطمینان ہو گیا کہ اب ہر شخص نے انھیں دیکھ لیا ہو گا، لہذا انھوں نے قلیوں کو حکم دیا کہ ڈے ویکو کے ہوٹل کے دروازے پر رکشا روک دیں۔

یہاں انھوں نے مسز اسٹوارٹ کو شام کی چائے کی دعوت دی تھی۔ قلیوں نے ان کو اتار کر رکشا وائی ڈبلیو سی اے کے سائبان میں کھڑا کر دیا کہ جب ضرورت ہو تو بلا لیا جائے۔ منو کو یہ جاننے کا بے حد اشتیاق لگا تھا کہ انگریز لوگ آپس میں کس طرح ملتے ہیں۔ لہذا وہ وہیں سے بیٹھا بیٹھا ہوٹل کے اندر جھانکتا رہا جہاں بڑے بڑے شیشوں کے کمبوں میں مٹھائیاں سجی رکھی تھیں اور چھوٹی چھوٹی بید کی کرسیاں اور میزیں دوسری طرف لگی تھیں۔

"دیکھو ممی! دیکھو ہمارے قلی رو رہے ہیں" ننھی سرسی چلانے لگی اور مسز ہیتورنگ نے جن اسی وقت متمدن سوسائٹی میں تعارف حاصل کیا تھا۔

وجود جو گندے چیتھڑوں میں ملبوس، رائیں کھولے، وحشی قسم کے قلی جن میں سے کچھ چلم پی رہے تھے اور کچھ سڑک کے کنارے پائین کے سائبان پر لیٹے تھے، ڈنڈے دیکو میں مزے مزے میں چائے پیتے ہوئے امیروں کی کاہل الوجودی کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن منو ایسے دو چار نو واردوں کو چھوڑ کر، باقی تمام قلیوں کو تو پرواہ بھی نہ تھی اور وہ ہر طرح جتنی بھی جگہ ملی ہوئی تھی اس میں آڑے، سیدھے، اُلٹے، خاموش ساکت پڑے تھے جیسے دم ہی نہ ہو۔

جب منو پہلے دن رکشا قلی کا کام ختم کر کے گھر پہنچا تو اُسے بخار تھا۔ واپس آتے وقت تمام راستے اُسے اپنی پنڈلیاں ٹوٹتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھیں اور گھر پہونچتے پہونچتے وہ بالکل ہلکان ہو گیا تھا۔ جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ پاؤں تانے بھی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ حلق بالکل سوکھ گیا تھا اس نے ایک لوٹا پانی بھی پیا مگر ہاتھ بالکل شل ہوئے جا رہے تھے اور ٹانگیں جواب دیئے دیتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ہڈیاں چور چور ہو گئی ہیں اور خون کھول رہا ہے۔ وہ زمین میں لیٹ گیا اور کنڈلی مار کر آگ کے نزدیک سرک گیا، کیونکہ اب اس کو کپکپی بھی ہونے لگی تھی۔

الہ داد رات کو بازار سے گھوم گھام کر واپس آیا تو اندھیرے میں منو کے جسم سے ٹھوکر کھا کر دھڑام سے گرا ہی ہوتا۔

"ارے کون ہے رے"

اس نے پوچھا اور جواب میں صرف منو کی دھیمی کراہ اور ہاتھ پیر

پٹکنے کی آواز سنی۔ وہ سمجھ گیا کہ اُسے بخار چڑھ گیا ہے اور دوڑا ہوا میم صاحبہ کو اس آفت کی اطلاع دینے پہونچا۔ مسز مینورنگ بڑی پریشان ہوئیں۔ آخر کو وہ بھی ماں تھیں اور اس وقت انھیں منو کی طرف سے ویسی ہی پریشانی ہوئی جیسے اپنے رالف کی بیماری میں ہوتی تھی۔ انھوں نے اُسے اوپر بنگلے میں اٹھوا بلایا اور "بے بی" کے کمرے میں لٹایا حالانکہ منو نے بہت کچھ کہا کہ میں آخر نوکر ہوں۔ اوپر کیسے سو سکتا ہوں۔ اور یہی نہیں بلکہ فوراً ڈاکٹر کو بلوایا اور ڈاکٹر بھی کون کہ میجر مارچنٹ جو شملے کے ہیلتھ آفیسر تھے اور اسٹنڈیل کے پاس ہی رہتے تھے۔ میجر مارچنٹ آئے۔ انھوں نے منو کا ٹمپریچر لیا، کچھ اسپرین تجویز کی، اور منو سے یہ کہہ کر کہ تم جلدی اچھے ہو جاؤ گے خود مسز مینورنگ کے حالات دریافت کرنے میں مشغول ہو گئے۔ کیونکہ انھیں یہ سانولی عورت عجیب سی لگ رہی تھی کہ اپنے نوکر کو اپنے فلیٹ میں سلانے لے آئی۔

یہ مارچنٹ دراصل دیسی عیسائی تھے اور جس طرح کہ عام طور پر ہندستانی عیسائی ہوتے ہیں وہ بھی ایک موچی کے بیٹے تھے۔ ایک انگریزی مشن نے انھیں بچپن میں لے کر پال لیا تھا اور تعلیم دی تھی۔ پادریوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے دوران میں دل ہی دل میں انگریزوں کے پہلو بہ پہلو رہنے کے منتظر اور مشتاق تھے۔

جب وہ ولایت گئے اور وہاں ان سے برابری سے انگریزوں سے ملاقات ہوئی تو اپنے تئیں بالکل انگریز ہی سمجھنے لگے۔ صاف ستھرا زبان بولنے، ایک تھیٹر میں کام کرنے والی انگریز لڑکی سے شادی کر لینے اور یورپین ماحول میں بالکل گھل مل جانے سے یہ عقیدہ اور بھی پختہ ہو گیا۔ انھوں نے اپنا نام بھی "موچی" سے بدل کر مارچنٹ رکھ لیا۔ اب وہ اپنے آپ کو صرف ایک

کامیاب آئی۔ ایم۔ ایس کا افسر سمجھتے تھے اور یہ بالکل بھول چکے تھے کہ وہ ایک پنچ ذات کے لاوارث لڑکے تھے جسے مشن نے پالا تھا۔

البتہ انھیں اس پنچ سے اوپنچ تک پہونچنے کی ایک قیمت ضرور ادا کرنی پڑتی تھی اور وہ یہ کہ ہر ماہ اپنی آدھی تنخواہ اپنی انگریز بیوی کو بھیجتے تھے جس نے انگلستان ہی میں رہنے کو ترجیح دی تھی اور چونکہ وہ بچپن میں کافی غریب رہ چکے تھے لہٰذا سات سو روپیہ ماہواریوں صاف نکل جانے سے انھیں بڑی کوفت ہوتی تھی۔ وہ بڑے کنجوس تھے اور اپنی ذات پر بہت ہی کم روپیہ خرچ کرتے تھے، شملے کے ہیلتھ آفیسر ہونے کی وجہ سے ہر جگہ ان کی دعوتیں ہوتی تھیں لیکن روپیہ کی بربادی کی اس مستقل کھٹک کے علاوہ جس کی بنا پر وہ کبھی کبھی اس ناچنے والی لڑکی سے طلاق لینے کو سوچتے اور کبھی دوسروں کی بیویوں کے پاس گھستے پھرتے، وہ اپنے آپ سے کافی مطمئن تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ مسز مینورنگ کا رنگ بھی تقریباً ان کی ہی طرح ہے، ایسا گندمی رنگ جس کو تولیہ سے رگڑ رگڑ کر گالوں پر سرخ چمکایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے سوچا کہ یہ ضرور یورپیشین ہوں گی اور ہندستانی عیسائی کے لئے معمولی دیسی لوگوں یا خالص انگریزوں کے بہ نسبت یورپیشنوں سے ملنا زیادہ آسان ہے۔

"یہ لڑکا کون ہے مسز مینورنگ"

"نوکر ہے۔ اسے میں بمبئی سے اٹھا لائی تھی"۔ مسز مینورنگ نے جواب دیا اور بات جاری رکھی "اور ہاں میرا نام مینورنگ ہے، مسز مینورنگ"

"اوہ معاف کیجئے! خانساماں نے کچھ مینا، مینا، سا کہا تھا تو میں نے سوچا کہ غالباً مینگ ہوگا"

"نہیں۔ مینورنگ ہے" وہ بولیں "اس کا تلفظ ذرا مشکل ہے نا"

"ہاں نام تو ذرا مشکل ہے مگر مجھے تو اس کی خوشی ہے کہ آپ مشکل انسان نہیں ہیں۔ شملے میں بعض بعض انگلو انڈین تو بس حد ہیں"

"جی ہاں" مسز مینورنگ نے کہا۔ لیکن وہ اپنے طبقہ پر کتہ چینی نہیں کرنا چاہتی تھیں لہٰذا خاموش ہو رہیں۔ ویسے تو مارچنٹ صاحب بھی کچھ اپنوں میں یا انگریزوں میں تفریق ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے صرف ذرا گفتگو کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔

"آپ یہاں کب سے ہیں مسز مینورنگ؟" مارچنٹ نے پوچھا۔

"میں تو ابھی چند دن ہوئے گھر سے آئی ہوں"

"اچھا! سچ مچ" مارچنٹ نے کہا

"آیئے بیٹھئے نا ڈاکٹر صاحب! ایک پیگ لیجئے" مسز مینورنگ نے میجر صاحب کی نظروں میں تحسین کی جھلک دیکھ کر کہا۔

"شکریہ شکریہ" ڈاکٹر صاحب بڑے اشتیاق سے بیٹھ گئے۔

"اچھا اب مجھے گھر کے سب حالات بتایئے"

اور پھر وہ دونوں بیٹھ کر گھر کی باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ مسز مینورنگ کو نیچے مسز اسٹوارٹ کے یہاں کھانے کے لئے جانے کا وقت آگیا۔ بھلا پانچ گھنٹے میں اتنی سب باتیں کیسے ہو چکتیں جتنی انھیں ایک دوسرے سے کہنی تھیں۔ لہٰذا مسز مینورنگ نے دوسرے دن اپنی بیماری کے متعلق پوچھنے کے بہانے سے میجر صاحب کو چائے پر آنے کو کہا۔ اور میجر

مارچنٹ نے نہایت خوشی اور گرمجوشی سے قبول کر لیا۔

اس درمیان منو بنگلے میں سونے کی مسہری میں نہایت خوش خوش لیٹا تھا۔ حالانکہ اس کی کنپٹیاں بخار سے جل رہی تھیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں یہ خوشی بھی ٹھنڈی پڑنے لگی کیونکہ اسپرین کے زور سے اُسے پسینہ آنے لگا۔ پاؤں من من بھر کے معلوم ہونے لگے اور وہ بستر میں ادھر اُدھر تڑپ کر کروٹیں بدلنے اور اپنی ماں کو یاد کرنے لگا۔

مسز مینورنگ نے کھانے سے واپس آکر اس کے ماتھے پر اوڈی کلون ملا۔ یہاں تک کہ اس کا جسم بھی دبایا۔ وہ اس سے بڑی مہربانی سے پیش آرہی تھیں۔

جب خوب پسینہ آکر منو کا بخار اتر گیا اور وہ ٹھیک ہو گیا تو اسے پھر وہی ملازم لڑکے اور رکشا قلی کی جگہ واپس ہو جانا پڑا۔ اور وہ بہت خوشی سے چلا بھی گیا۔ کیونکہ میم صاب چاہے کتنی بھی مہربان رہی ہوں لیکن بڑے لوگوں کے مقابلے میں جو بنگلوں میں رہتے اور انگریزی کپڑے پہنتے تھے، منو کے دل میں جو احساس کمتری تھا وہ کبھی ختم نہ ہوا تھا۔

وہ روزانہ مسز مینورنگ کی خدمت میں حاضر رہتا اور جب وہ شملے میں دادِ عیش دیتی ہوتیں تو ان کی خدمت کو موجود رہتا۔ بنگلے کو جھاڑنے پونچھنے اور میم صاحب اور خانساماں کے حکم پر ادھر ادھر دوڑنے کے علاوہ جب کبھی میم صاحب خریداری کرنے یا ہوا کھانے باہر نکلتیں تو وہ ان کے رکشا کے لئے چوتھے قلی کا بھی کام دیتا۔

مسز مینورنگ کو اب یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سفید فام یا انگریز عورت کے لئے تو ہندستان جنت ہے۔ آخر انھوں نے اتنے دن جو انگلستان

میں اپنی چمڑی کو سفید کرنے کی کوشش میں صرف کئے تھے وہ بیکار نہیں گئے۔ اب ان کے پاس کافی وقت تھا۔ کیونکہ ہندستان ہی دنیا میں ایک ایسی جگہ تھی جہاں نوکر اب تک نوکر ہی تھے اور انسان مزے سے صبح کو اونگھ سکتا تھا۔ دن کو سو سکتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ مطمئن بھی رہ سکتا تھا کہ خانساماں اور بوائے مل کر بریکفاسٹ، لنچ، چائے اور ڈنر سب کچھ حاضر کر دیں گے۔

آنریبل میں ایک گھوڑا صبح بھر گھومنے کے لئے ایک شلنگ سے کم میں مل سکتا تھا۔

چار پنس فی گھنٹہ کے حساب سے رکشا مل سکتا تھا۔

انڈے چھ پنس کے ایک درجن ملتے تھے۔

ایک فارونگ فی کپڑے کے حساب سے نہایت عمدہ کپڑا دھلتا تھا۔ بڑی بڑی دوکانوں میں پیرس کے تازہ ترین فیشن کے مطابق کپڑے ملتے تھے۔

شان دار ہوٹل، ناچ گھر، نائٹ کلب اور سینما تھے جہاں ہالی وڈ کے تازہ ترین فلم لندن سے بھی پہلے آجاتے تھے۔ ہاں بے شک یہاں مشرق کے سستے داموں مغرب کا تمام آرام اور تمام تفریح نصیب ہو جاتی تھی۔ جبھی تو بیواٹرا اور نائس برج کے وہ تمام پنشن یافتہ لوگ جنھوں نے سلطنتِ انگلشیہ کو تخلیق کیا تھا، گھر، پر بڑبڑایا کرتے تھے، اور فرسودہ انگلستان کی کیموں پر سر ہلا ہلا کر ہندستان کی موئی مرغی کے لئے آہیں بھرا کرتے تھے۔ یہ بات تو سچ تھی کہ مسز مینور نگ ان تمام عیش و آرام کے سامان سے بخوبی اور مکمل طور پر لطف اندوز نہ ہو سکتی تھیں کیونکہ انھیں یونین جیک کلب میں داخلہ نہیں ملا تھا اور اس بات نے پھر سے ان کو اپنے سانولے رنگ

کا احساس کرا دیا تھا۔ ویسے بھی لوگ ان کے متعلق کافی افواہیں اڑاتے رہتے تھے۔ پھر بھی، اپنی روح پر یہ بوجھ اور پریشانی محسوس کرتے ہوئے بھی، وہ برابر گھومنے نکلا کرتی تھیں اور جہاں کہیں عیش و تفریح کا موقعہ ملتا وہ حاصل کرنے سے کبھی نہ چوکتی تھیں۔ قبل اس کے کہ اینگلو انڈین طبقہ یہ طے کر سکے کہ انھیں قبول کرے یا دھتکار دے ـــــ اور اس طرح ان کی زندگی کافی رنگین اور پر لطف تھی۔ منو بھی اس درمیان اسی زندگی میں سمو گیا تھا اور اُسے پسند بھی کرنے لگا تھا۔

مثلاً اُسے یہ بہت اچھا لگتا تھا کہ وہ مال پر گھٹنے جا رہا ہے، اس کی مالکہ قیمتی اور خوبصورت کپڑے پہنے اس میں بیٹھی، سفنی سری کو مختلف مشہور انگریز اور ہندستانی لوگوں کے نام بتا رہی ہے جو اپنے اپنے رکشاؤں پر بیٹھے، عمدہ لباس پہنے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے ہیں۔

"میجر جنرل سر کلاڈ ہیگنگٹن"، وہ سری کے بار بار کے سوالات پر کہتیں "سر جیجی بھائی اسمٰعیل، پریسیڈنٹ چیمبر آف کامرس۔ سر چارلس ایڈہوم منسٹر، لیڈی رفیع، وائسرائے کی کونسل کے ممبر سر رفیع کی بیوی، پنڈت دیوار کا ناتھ کانگریس لیڈر۔ ہماری آف کبڈی"۔۔۔

لیکن سری اتنی چھوٹی تھی کہ وہ کچھ سمجھتی ہی نہیں تھی، منو البتہ سب باتیں یاد رکھتا۔

اور جب میم صاحب نے دوکانوں کے پاس سے ذرا آہستہ آہستہ چلنے کو کہا، کیونکہ وہ بنارسی کپڑوں کی دوکان میں قیمتی ریشم، عجائبات کی دوکان کے عجیب عجیب ہار اور گلوبند، مسز پرکن کے یہاں کا چاندی کا سامان دیکھ کر اپنی آنکھیں سینکنا چاہتی تھیں، تو منو بھی دوکانوں میں سجی ہوئی

ان چیزوں کو دیکھ کر خوش ہونے لگا۔

اور سب قلی ان چیزوں سے قطعی لاپرواہ تھے۔ بلکہ منو اس بات پر کچھ چڑھ بھی گیا کہ مغربی شان و شوکت کے اس ماحول سے وہ اس قدر بے نیاز کیسے رہ سکتے تھے۔

جب منو کی مالکہ نے آگے والے قلی کو حکم دیا کہ صاحب سنگھ اینڈ کمپنی کے آگے رکشا روک دیا جائے اور خود اتر کر اس سیاہ داڑھی والے سکھ سے مسکرا مسکرا کر بات کرنے لگیں جو بہترین قسم کا انگریزی سوٹ پہنے تھا اور انگریزی میں گٹ پٹ گٹ پٹ کر سکتا تھا، تو منو کو ذرا حسد ہونے لگا۔ کاش کہ وہ خود بھی اس سکھ کی طرح ہوتا، تقریباً انگریز۔ اور وہ تو بلکہ اس سے زیادہ ہی انگریز لگتا، کیونکہ ہندو ہونے کے باعث اس کے داڑھی تو ہوتی ہی نہیں کہ انگریزی سوٹ کی بھی وقعت کم ہو جاتی۔ تب تو اس کی مالکہ ضرور اسے زیادہ چاہتی۔ اور اس نے کالکا میں، زرد بخار کے دوران میں منو کے جو چٹکیاں بھری تھیں ان کے یقیناً کچھ اور معنی ہوتے۔

لیکن اس نے اپنے دل میں سوچا۔ ایسی مزے دار باتیں سوچنے سے کیا فائدہ جب کہ میری حیثیت تو صرف ایک ملازم چھوکرے، ایک قلی کی ہے۔ اور یہ سردار جی تو غالباً کوئی امیر آدمی اور کسی اونچے طبقے کے ہوں گے۔ شاید بی اے پاس ہوں یا شاید فیل ہوں ـــــ اور میم صاب پھر آخر میم صاحب ہی تھیں۔ اب یہ اور بات تھی کہ ان کا رنگ اور میموں کا سا نہ تھا۔

"بوائے! آؤ یہ چیزیں اٹھاؤ"، منو کی مالکہ نے پکارا، اور منو جلدی سے دواخانہ میں چیزیں لینے گھس گیا، اُسے ان پیاری پیاری بلوری

شیشیوں کو ہاتھ لگا کر خوشی ہو رہی تھی اور زیادہ خوشی تو اس کی کہ اور لڑکیوں کے مقابلے میں میم صاحب نے یہ نازک چیزیں اس کے حوالے کی تھیں۔

اور پھر وہ بڑی شان اور بڑی مستعدی سے رکشے کو کھینچتا گیا بلکہ اپنے جوش میں ایسا اندھا ہوا کہ دوسرے لڑکوں سے اصرار کرنے لگا کہ مجھکو روڈ اور رکشاؤں سے ریس کریں اور آگے نکل جائیں۔ کبھی ایسے مزے میں آجاتا کہ اپنے اور ساتھیوں سے زبردستی یا خوشامد کر کے پہاڑی گیت گواتا۔ کیونکہ پہاڑی گانے سن کر اس کے ہاتھ پاؤں میں پھرتی آجاتی تھی اور دل میں مسرت کے سوتے پھوٹنے لگتے تھے۔

لیکن جب اس رنگین شام کی وہ سیر کر کے واپس آیا تو اس کا دل کچھ پژمردہ ہو گیا اور وہ بڑی تنہائی محسوس کرنے لگا۔ اس کی پیٹھ بالکل اکڑ گئی تھی اس طرح کہ نہ کھڑا ہو سکتا تھا نہ بیٹھ سکتا تھا اور سب سے عجیب بات تو اس کو یہ لگتی تھی کہ آج کل جب کبھی وہ تھوکتا تو اس میں خون کی سرخی ہوتی تھی۔ لیکن اس نے اس کا کچھ خیال نہ کیا اور الہ داد کو کھلانے میں مدد دینے لگا کیونکہ ادھر کچھ دن سے مسز مینورنگ برابر رات کے کھانے پر میجر مارچنٹ کو مدعو کرنے لگی تھیں۔

اور جب پھر مسٹر مینورنگ کچھ دن کی چھٹی لے کر صوبہ سرحد سے آگئے تب تو منو پر کام کا کافی بوجھ پڑ گیا۔ منو کو "صاحب" بہت پسند آئے کیونکہ وہ بڑے کمسن اور بھولے بھالے لگتے تھے اور واقعی یہ تھا کہ کپتان مینورنگ کے حسین نازک چہرے، سنہرے بال اور نیلی آنکھوں نے منو کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا۔ ان کی طبیعت بھی بڑی خاکسار اور سیدھی سادی اور لبوں پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔

اب تک منو کو انگریزوں کے متعلق جتنا تجربہ ہوا تھا وہ نہایت ہی برا تھا، اور اس نے اپنے دل میں انگریزوں کو مثل بھوتوں کے تصور کر رکھا تھا جو ہمیشہ منہ بنائے، تیوری چڑھائے رہتے تھے۔ ویسے تو اس نے اُپر بازار، میں کچھ انگریزوں کو مسکراتے ضرور دیکھا تھا مگر یہ مسکراہٹ بہت ہی دبی دبی سی ہوتی تھی اور بہرحال اپنے ہی طبقہ کے لئے ہوتی تھی۔ ابھی تک منو کو دیکھ کر کبھی کوئی انگریز مسکرایا نہ تھا کیونکہ وہ نوکر تھا، قلی تھا، اور اس حیثیت سے اس قابل ہی نہ تھا کہ اس سے مخاطب ہوا جائے۔ منو بھی اس احساس کمتری کی روشنی میں جو اس میں سمائی ہوئی تھی، اسی نقطۂ نظر کو صحیح سمجھتا تھا لیکن مینورنگ صاحب بڑے اچھے تھے، سب صاحب لوگ ایسے کیوں نہیں ہوتے! اگر وہ اپنے نوکروں سے کبھی کبھی مسکرا کر بات کر لیا کریں تو ان کا کیا چلا جائے، کیونکہ مینورنگ صاحب کا بھی تو آخر کچھ نہیں گیا۔ ایسے صاحب کے لئے وہ کیا کچھ نہ کر سکتا تھا اور وہ بھی اس لئے نہیں کہ صاحب نے اللہ داد کو حکم دیا تھا کہ پشاور سے چودہ گھڑے کے برابر برابر تین سردے لائے تھے ان میں سے ایک کا آدھا منو کو دیا جائے، بلکہ ان کی مہربان اور سیدھی سادی طبیعت کی وجہ سے۔ اگر صاحب رکشا میں بیٹھتے تو منو تمام جھکور روڈ پر رکشا کو دوڑائے دوڑائے پھرتا لیکن وہ بیٹھتے ہی کب تھے، میم صاحب رکشے میں بیٹھتیں اور وہ پیدل ساتھ ساتھ چلتے رہتے۔ پھر بھی منو نے کافی دل و جان سے بنگلے کا کام کیا صاحب کی مہربانی کا عوض کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے موقعہ ہی کہاں ملا۔ کیونکہ صاحب صرف ایک ہی ہفتہ ٹھہرے۔

منو کبھی کبھی سوچتا کہ اس نے صاحب کی مہربانی پر جو کام اور محنت کی ہے وہ صاحب نے بھی دیکھی یا نہیں، صاحب نے یہ بھی دیکھا

کہ وہ دل و جان سے اس کی خدمت میں لگا ہے، کیونکہ چھٹیوں کے آخری تین دن میں صاحب کا منہ کافی اتر گیا تھا اور وہ اتنے چپ چپ رہنے لگے تھے کہ دیکھ کر قلق ہوتا تھا۔ بہرحال جب صاحب نے جاتے وقت ریلوے اسٹیشن پر منو کو پانچ روپے کا ایک نوٹ دیا تو منو سمجھ گیا کہ صاحب نے اس کو ضرور پسند کیا ہوگا۔

بینرجی صاحب کو دیکھنے کے بعد، منو کو مارچنٹ صاحب بڑے کمینے اور قابل نفرت لگنے لگے تھے کیونکہ وہ روز روز میم صاحب کے یہاں ڈنر اڑانے تو آموجود ہوتے تھے لیکن منو کو یا الہ داد کو انعام دینا تو کیا خود میم صاحب کے لئے بھی کبھی کوئی تحفہ یا ڈالی نہیں لائے۔ بڑا ہی خودغرض تھا یہ صاحب! منو کو تو اس سے نفرت ہوگئی تھی خاص کر اس وجہ سے اور بھی کہ جہاں وہ آیا کہ منو اگر اس پاس کہیں مس صاب سے کھیلتا ہوتا تو اُسے فوراً حکم دیتا کہ گول کمرے سے باہر نکل جائے۔ پھر اس ہی نے میم صاحب سے کہہ کہہ کر مس صاحب کو بورڈنگ اسکول میں بھجوا دیا۔ اور تو اور ہمیشہ میم صاحب کو بھڑکاتا رہتا تھا کہ نوکروں سے خوب مشکل کام لیا جائے۔ منو سے کہتا کہ گھوڑوں کے پیچھے پیچھے ساری جھکو روڈ پر سے دوڑتا ہوا آئے تاکہ جب وہ خود اور میم صاحب آبشار دیکھنے نیچے جائیں تو منو گھوڑوں کی لگام پکڑے کھڑا رہے۔ اور اب کی اس نے اتوار کے دن رکھنے کو مشوبرے لے جا کو کہا تھا۔ ویسے تو منو کو خود بھی مشوبرہ دیکھنے کا شوق تھا، لیکن یہ جگہ دس میل دور تھی اور اگر پانچ قلی نہ ہوتے تھے تو پھر منو کو چوتھا قلی بننا پڑتا۔

بہرحال جب اتوار آیا تو منو صبح کی خنکی میں مشوبرہ جانے کی تیاریوں سے کافی خوش نظر آرہا تھا۔ میم صاحب نے چار قلی اور منگوائے تھے لہذا منو

کو فالتو رکھا گیا اور اُسے ایسا ہی معلوم ہوا جیسے وہ خود بھی چھٹی منانے کے لئے سیر کرنے جا رہا ہے۔

جب رکشا روانہ ہوگیا اور مختلف راستوں پر سے گذرنے لگا، تو منو کو مختلف مناظر دیکھنے میں بڑا لطف آنے لگا۔ کرائسٹ چرچ کے پاس سے ہو کر یہ لکڑ بازار سے گذرے، جہاں کے صنعت گر ہمالیہ کی چھڑیاں اور لکڑی کے کھلونے بنانے میں کمال رکھتے ہیں۔ پھر اسنوڈاؤن کے پاس سے گذرے جہاں کا ٹنڈا یخیف رہتا ہے۔ یتیم خانہ کے اسکول سے ہوتے ہوئے سبزولی بازار سے گذرے جہاں سارہ وہ بلاق اور منٹھ بناتے ہیں۔ جو پہاڑی عورتوں کے لبوں کو چومتی رہتی ہے، اور نوجی ہیڈ کوارٹر کے بالوجھپ کر جمع ہوتے اور انگریزی راج کو برباد کرنے کی ترکیبیں سوچتے ہیں، پھر ایک لمبی سی ٹنل آتی جہاں مچھروں کی گردنوں میں پڑی ہوئی نیلی موتیوں کی ڈوری اور سر پر لگی ہوئی لکڑی کی کاٹھیوں میں لٹکی ہوئی گھنٹیوں سے ایک عجیب جادو بھری موسیقی نکل رہی تھی۔ پھر نواب مالیر کوٹلہ کا محل آیا، پانی کا خزانہ آیا اور دیودار کا ایک گھنا لامتناہی جنگل، جو لدرائی پیچدار سڑک کو ہر طرف سے ڈھانپے ہوئے ہے۔ وائسرائے کا گولف کا میدان، ریاست بھجی کے گرم پانی کے چشمے جو ستلج کے کنارے سے پھر آگے تبت تک چلے گئے ہیں۔

پہاڑ کی خنک فرحناک ہوا منو کے جسم پر ٹھنڈے پانی کی طرح لگ رہی تھی، وہ اور قلیوں کے ساتھ تیز تیز دوڑتا جا رہا تھا۔ درختوں کی بھیگی نم فضا بڑی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ چونکہ میجر صاحب اپنے گھوڑے کو دلکی چال چلا رہے تھے، اور رکشا کو بھی ان کے ساتھ ہی رہنا تھا لہٰذا مشورہ پہنچتے پہنچتے منو اور قلیوں سے زیادہ ہانپ گیا۔ لیکن میم صاحب تو میجر صاحب سے

باتیں کرنے میں اتنی مصروف تھیں کہ جب یہ لوگ منزل پر پہنچ گئے تو رکشا سے اترنا ہی بھول گئیں۔

ٹفن پر منو کو صاحب اور میم صاب کو کھانا کھلانے کے لئے حاضر رہنا پڑا۔ سب قلیوں کو چھٹی ملی کہ جا کر رکشا اسٹینڈ پر آرام کریں تا وقتیکہ ان کی پھر ضرورت ہو، تو منو کا دل بالکل بیٹھا جا رہا تھا، لیکن اس نے اپنی صورت پر اداسی اور تھکن نہ ظاہر ہونے دی۔ ویسے بھی وہ اپنے آپ کو اور قلیوں سے برتر سمجھ رہا تھا کیونکہ آخر تو وہ میم صاب کا نجی نوکر تھا۔ اور جب اسے کھانے کے لئے مرغ کی ایک پدی ٹانگ اور ڈبل روٹی اور لنچ کا سب بچا کھچا ملا تو یہ احساس اور بھی بڑھ گیا۔ اس نے نل پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور پھر رکشا اسٹینڈ پر آ پہنچا کہ شاید صاحب یا میم صاحب کو ضرورت ہو۔ اس کے آتے ہی سب اسے بنانے لگے "تمہاری میم صاحب بھی کوئی میم صاحب ہے؟ شملہ کا کوئی صاحب اور کوئی میم اس کے یہاں اپنا کارڈ نہیں چھوڑتا" ایک قلی بولا۔

"تو مجھے اس سے کیا؟ مگر تم تو شاید اس لئے جل گئے ہو کہ مشوبرے آتے ہوئے وہ ایک دفعہ بھی رکشا سے نہیں اتری" منو نے جواب دیا۔

"نہیں تو۔ ہم تو تمہارے بھلے کے لئے کہتے ہیں۔ تمہیں اس کی نوکری چھوڑ دینی چاہیئے۔ تم اس کی نجی خدمت بھی کرتے ہو اور رکشا بھی کھینچتے ہو"

منو چپ رہا۔

"ہاں جی یہ رکشا قلی کیوں نہ بن جائے۔ پھر اسے اس کی خدمت نہ کرنی پڑے گی" ایک دوسرے نے پوچھا۔

"اس لئے کہ یہ سل سے مر رہا ہے" موہن نے کہا "دیکھو تو ذرا

اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں اور زرد پچکے گال!"

"لا منو ذرا اپنی نبض تو مجھے دکھا" ایک قلی نے ہنستے ہوئے کہا

"چلو بھی۔ میں تمھاری باتوں میں نہیں آتا۔ لاؤ ایک سرگٹ دو"

اس روز وہ تمام رات کھانستا رہا اور الہ داد کی بھی نیند خراب کی۔

"یہ میں نے وہ ذرا مشوبرے میں ایک بیڑی پی لی تھی۔ اسی کا یہ فساد ہے"۔ اس نے بوڑھے الہ داد کے چڑچڑانے پر کہا۔

دوسرے دن جب وہ اپنے دانت صاف کر رہا تھا اور غرارہ کر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ خون کی لکیر سی منھ سے بہہ رہی ہے اور لوتھڑے بھی نکلے، اس نے جلدی سے مٹھی بھر راکھ اس پر ڈال دی کہ الہ داد کی اور خود کی نظروں سے چھپ جائے۔ لیکن اس نے کتنی ہی کوشش کی کہ کام میں اس خیال کو بھول جائے لیکن چونکہ پہلی مرتبہ اتنا جریانِ خون ہوا تھا لہٰذا اس کے تصور کو جو صدمہ پہنچا تھا اس پر قابو پانا آسان نہ تھا۔ "کیا موہن کا کہنا صحیح تھا"، وہ بار بار اپنے دل سے پوچھتا "کیا میں سچ مچ مر جاؤں گا"۔ اُسے کچھ معلوم نہ تھا کہ سل کسے کہتے ہیں، لیکن سینے کا یہ درد جو اُسے کئی دن سے تھا اور یہ خون تھوکنا شاید یہی وہ بیماری ہو"، ضرور یہی بات ہوگی۔ پھر اس نے دل ہی دل میں اسے جھٹلایا۔ "نہیں یہ کیسے ہو سکتی ہے۔ اصل میں میرا گلا دُکھنے آگیا ہے۔ کیونکہ اگرچہ پچھلے تین سال میں اس نے کئی مرتبہ اپنے مرنے کی دعائیں مانگی تھیں، لیکن اب جب موت کا امکان اور زندگی کا خاتمہ اس کے ذہن کے آگے منڈلا رہا تھا تو وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔

اتنے شکوک رفع کرنے اور دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اس

نے رتن کو خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ اُسے بڑی تنہائی محسوس ہو رہی تھی اور وہ کچھ نہ کچھ کر بیٹھنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اپنے پرانے دوست کو جسے وہ مرا ہوا مان چکا تھا، اس وقت خط لکھنا بھی کیسی غیر معمولی بات تھی۔ کیونکہ اگر رتن مر چکا ہے تو پھر اس کے خود کے بھی مرنے میں مضائقہ نہ تھا لیکن اگر وہ زندہ ہے تو پھر آخر وہ پہلوان ٹھہرا۔ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکالے گا اور اس کی مدد کرے گا۔ خوش قسمتی سے اس دن صبح ہی صبح میم صاحب بھی بڑی خوش خوش پھر رہی تھیں، کیونکہ خانساماں نے منو کو بتایا تھا کہ وہ لاٹ صاحب کے یہاں ناچ میں جانے والی ہیں، اور انھوں نے منو کو اپنے درزیوں کے یہاں، ہوا نگ چینی شومیکر کے یہاں اور میجر مارچنٹ کے یہاں بھیجا۔ مال جاتے ہوئے منو ریلوے بورڈ کے دفتر کے سامنے والے چھوٹے پوسٹ آفس میں ٹھہر گیا اور رتن کو ایک پوسٹ کارڈ لکھا جس میں مختصراً بیان کیا کہ کس طرح وہ ایک میم کا نوکر ہو کر شملے آ گیا تھا، تنہائی کی وجہ سے بہت ملول اور رنجیدہ رہتا تھا اور یہ کہ اس کا بہت دل چاہتا تھا کہ یا تو رتن شملے آ جائے یا پھر اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہ خود بمبئی واپس چلا جائے۔

اور میجر مارچنٹ نے منو کو ایک خط دیا کہ مسٹر داس کو دے آئے جو فارن اینڈ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں تھے۔ منو جب فارن اور پولیٹیکل کے دفتر پہنچا، جو ہیلتھ آفس سے کوئی تین میل پر تھا تو اُسے معلوم ہوا کہ مسٹر داس کھانا کھانے گھر گئے ہیں۔ منو پھر دو میل چلا، وہ کھانا کھا ہی رہے تھے کہ پہنچ گیا۔

"یہ کیا ہے آخر" بیوی نے پوچھا۔ "یہ سرکار ہمیں کھانا بھی چین سے نہیں کھانے دے گی۔"

"ارے بھئی یہ سرکار کی بات نہیں ہے" بابو جی بولے "یہ تو اوپر کے لوگوں کی ہے۔ آج صبح میرے پاس بارہ آدمیوں کے پاس سے درخواستیں آئی ہیں کہ وائسرائے کے ناچ کا ٹکٹ دلوا دوں اور یہ تیرھویں میجر مارچنٹ جو ہیلتھ آفیسر ہیں ان کی ہے۔ دو ٹکٹ مانگے ہیں۔ ایک اپنے لئے اور ایک اس پردہ نشین عورت کے لئے جس سے ان کا معاشقہ آج کل چل رہا ہے۔ ہمارا بچہ جو بیمار تھا انھوں نے علاج کیا تھا، لہذا میں چاہے کسی اور کا کام کروں یا نہ کروں ان کا تو کرنا ہی ہوگا۔ اچھا بھائے! صاحب کو ہمارا سلام دو"

منو جب واپس ہوا تو موں سون کے بادل ٹیلے کی اونچی چوٹیوں پر اکٹھے ہو رہے تھے۔ بنگلے سے کوئی سو گز کے فاصلے پر، دو انڈیل کے حسین مناظر میں کھویا ہوا چلا آ رہا تھا کہ بجلی کے کڑکنے اور بادل کے گرجنے کی آواز سنائی دینے لگی اور سارا آسمان سیاہ ہو گیا۔

جیسے ہی اس نے بنگلے کے برآمدے میں قدم رکھا بادلوں نے اپنے منہ کھول دیئے گھنٹوں تک بارش جاری رہی بیچ بیچ میں بجلی بھی چمک جاتی تھی اور چاروں طرف کی سبزی پر چھائے ہوئے کٹھرے کو ایک عجیب غیر قدرتی جلال کے ساتھ نمایاں کر دیتی تھی۔

پھر ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی جو بادلوں کو اڑا کر میدانوں کی طرف لے گئی اور تیج کا پانی سیلاب آ کر ایسا چمکنے لگا جیسے کوئی روپہلی سمندر ہو۔

بیچ بیچ میں دو چار گھنٹوں کے وقفہ سے ایسا ہی موسم برابر تین دن تک چلتا رہا۔ جب سیاہ بادل چھا جاتے اور دن کی روشنی چھپ جاتی تو منو بیٹھا بیٹھا اپنی بڑھتی ہوئی کمزوری پر دل ہی دل میں کڑھا کرتا۔ کبھی کبھی میم صاب

اُسے دندی یا شومیکر کے یہاں بھیج دیتیں۔

ایک دن شام کو وہ رکشا والوں کی بستی میں گیا کہ موہن سے مل کر کچھ تسلی حاصل کرے۔ لوئر بازار کے بھی نیچے لکڑی کے جھونپڑوں کا ایک جھنڈ تھا جو بیل گاڑی والی سڑک کو جاتے ہوئے پڑتا تھا۔ اور ان جھونپڑوں کے پاس سے گندہ کائی جما ہوا نالہ بہتا تھا جس کے ذریعہ غالباً بازاروں کی گندگی کھڈ میں گرتی تھی۔ منو کو معلوم نہ تھا کہ موہن کا کون سا جھونپڑا ہے۔ کیونکہ ہر جھونپڑے میں کئی کئی قلی جمع تھے اور چلم پی رہے تھے۔ روشنی کچھ بھی نہیں سوائے اس کے کہ مٹی کے ٹمٹماتے ہوئے دیے جل رہے تھے اُسے ان قلیوں سے مل کر بڑی گھبراہٹ سی ہوتی تھی کیونکہ اگرچہ اُن میں سے زیادہ تر شملہ پہاڑیا کانگڑا ہی کے رہنے والے تھے، مگر آپس میں بالکل مختلف تھے۔ ایک جھونپڑے میں کچھ قلی ایک ڈھولکی لئے بیٹھا کر کوئی پہاڑی گیت گا رہے تھے۔ منو کا دل بے اختیار اس طرف کھنچنے لگا۔ لیکن جب وہاں پہونچا تو دیکھا کہ تمام کوٹھری دھوئیں سے بھری ہے اور ایک قلی بیٹھا، اینٹوں کے چولھے پر پوئے پکا رہا ہے۔ تمام قلیوں کے سروں پر دھواں پھیلا ہوا تھا جیسے چھت سے بڑے بڑے سانپ اژدہا لٹک رہے ہوں کیونکہ جھونپڑے میں کوئی روشن دان یا کھڑکی نہیں تھی منو، گانے کی کشش سے کچھ دیر ٹھہرا، لیکن دھواں اس کے پھیپھڑوں میں گھس گیا، اور جب نرخرے میں خوب تکلیف ہونے لگی تو وہ کھانستا ہوا گلا پکڑے باہر نکل آیا۔

آخر کار اس نے موہن کو ڈھونڈ ہی نکالا۔ ایک جھونپڑی کے برآمدے میں وہ ابھی ابھی کھانا کھانے بیٹھا تھا، اور قلیوں سے ذرا علیحدہ، اور کوئی دس بارہ آدمی اور تھے، کچھ کھا رہے تھے، کچھ لیٹے تھے، کچھ فرش پر سو رہے تھے

"آؤ۔ آؤ۔ خوش آمدید۔ خوب آئے"، ان میں سے دو بولے جو اُسے پہچانتے تھے۔ موہن خاموشی سے اٹھا اور ایک بوری لاکر منو کے بیٹھنے کو بچھا دی۔ بڈھے قلی سب منو کی طرف غور سے دیکھنے لگے اور منو کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس کی کمسنی کو تنقید کی نگاہ سے دیکھ رہے ہوں،

"یہ آج سب لوگ پوئے کیوں کھا رہے ہیں"، منو نے موہن سے پوچھا۔

"واہ بھئی واہ"، موہن کے جواب دینے سے قبل ایک اور قلی بول اٹھا "تم میم کے نوکر کیا ہو گئے کہ اپنے بار تہوار بھی بھول گئے۔ ہم چوماسا منا رہے ہیں"

"تم ان لوگوں کی باتوں کا کچھ خیال نہ کرنا"، موہن نے کہا "یہ یہاں دو موسم آتے رہتے ہیں اور انھیں خود بھی اپنے تہواروں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے یونہی سنائی اڑاتے رہتے ہیں یہ بے وقوف کہیں کے، ہمیشہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر خوبصورت رکشاؤں میں جتا کرتے ہیں۔ جاہل اور خشکلی دھنی تو ہیں ہی اور پھر پہاڑ پر اوپر نیچے رکشا چلاتے چلاتے بالکل بے حس ہو گئے ہیں۔ پھر ان کے پاس دوسروں کا مذاق اڑانے کے سوا رہ ہی کیا جاتا ہے"

"اچھا بھئی قابل صاحب! آپ ذرا سے مذاق پر بگڑتے کیوں ہیں اور وہاں مجھے سورج نکلنے سے پہلے ذرا اٹھا دینا بخولی جانا ہے"، اس قلی نے کہا جو پہلے بولا تھا۔

"اچھا"، موہن نے جواب دیا، اور بیڑی سلگانے لگا۔

"اور ہاں وہ میری شادی کے لئے چودھری سے قرضے کے

لئے کہنے کو مت بھولنا ،، وہ قلی ذرا مٹک کر کہنے لگا۔

" وہ میں ضرور بھولوں گا ،، موہن نے جواب دیا " تم ہمیشہ کے لئے اس موٹے ، تاکے داغوں والے چودھری کے جنگل میں پھنس جاؤ گے اور پھر شادی کر کے بھی اگر تم درموسم یہاں ہی آیا کئے تو شادی کرنے کا نتیجہ ہی کیا ؟ تمہارا دل پہلے ہی کمزور ہے کسی دن ٹیں ہو جاؤ گے ،،

" اور سچی وہ تو آپ نے کہہ ہی دیا ہے ،، ایک اور قلی بولا " کہ اس میں کچھ دم تو ہے نہیں تو پھر شادی کس پر تے پر کر رہا ہے " سب ہنس پڑے۔

" تو پھر میں کروں کیا ،، اس قلی نے پھر کہا۔

" اپنی زمین پر واپس چلے جاؤ بھلے آدمی۔ میری تو تم کو یہی صلاح ہے۔ جاؤ اپنی کھیتی باڑی دیکھو ،، موہن نے کہا۔

" میری زمین تو رہن ہو چکی ہے ،، قلی نے جواب دیا

" تو پھر میرے ساتھ چلو۔ ہم تم مل کر ایک دن زمیندار کا خاتمہ کر دیں۔ تمہیں تمہاری زمین مل جائے ،، موہن نے کہا " میرا تو مقصد یہی ہے کہ تم لوگوں کو یہ بات سمجھاؤں کہ جب تم محنت کرتے ہو ، چوٹی کا پسینہ ایڑی تک بہاتے ہو تو اس گاڑھی کمائی میں تمہارا بھی حصہ ہونا چاہئے ،،

" اونہہ اب تم اپنی یہ ہوائی باتیں رہنے دو۔ میں تو یوں ہی اچھا ہوں ، یہاں رہتا ہوں ، حقہ پیتا ہوں ، محنت کرتا ہوں ، کبھی کبھی تاش کھیل لیتا ہوں ، اور جو بھی مزدوری ملتی ہے کرنے سے کبھی نہیں چوکتا ،،

" ارے ہاں احمق ،، موہن کو غصہ آگیا " دو اپنی جانیں ! خوب ان لوگوں کو اپنی جانیں مارنے دو۔ تم سب گدھے ، جاہل غلام جو ٹھہرے ،

تمہارے دماغ میں عقل کیسے ٹھونسی جائے"

"اچھا تو پھر کل سے سبق شروع کریں گے" اس قلی نے مزاحیہ لہجے میں کہا اور سر سے پاؤں تک کمبل اوڑھ کر سوتا بن گیا۔

"میں ابھی ایک منٹ میں آیا" موہن نے منو سے کہا اور سڑک کی طرف چلدیا۔

اس کے جاتے ہی منو کو ایسا لگا جیسے اس جھونپڑی کی دنیا سے اس کا تعلق یکایک ٹوٹ گیا۔ موہن کی طرف سے منو کو کچھ ایسی خاموش ہمدردی محسوس ہوتی تھی کہ

جو قلی سونے کے لئے لیٹ گیا تھا اس نے بڑے زوروں سے اپنا سر اٹھایا اور کہا "اچھا استاد موہن یہ تو بتاؤ کہ ... ... لیکن چاروں طرف دیکھا تو موہن تھا ہی نہیں "اچھا تو چلے گئے وہ۔ عجب آدمی ہے بھئی یہ پڑھا لکھا آدمی، ولایت جا کے آیا ہے اور پھر یہاں ہم لوگوں کے ساتھ رہتا اور رکشا کھینچتا ہے۔ عجیب ہے بھئی"

"یہ شخص دراصل ایک بڑے خاندان کا ہے" ایک بوڑھا قلی حقہ پیتے ہوئے بولا "بچپن اور جوانی بڑے آرام سے گذری۔ اور اب یہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے قسم کے لوگوں میں مل جل نہیں سکتا تھا اور بہت تنہائی محسوس کرتا تھا۔ اور انسانوں میں رہ کر انسان بننا چاہتا تھا"

"پچ پچ" منو حیرت میں رہ گیا "کیسا عجیب ہے"

"بڑا ہی پُراسرار ہے" لیٹے ہوئے قلی نے کہا۔

"ہاں اور کیا، لیکن اگر یہ یہاں نہ ہوتا تو جیل خانے میں ہوتا۔ جو کام یہ کرتا ہے ویسا کام اگر کوئی کرے تو سرکار اُسے پکڑ کر جیل بھیج دیتی ہے۔ کیا تم لوگوں کو اس نے کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں تو" اس قلی نے حیرت زدہ اور کچھ خوفزدہ ہو کر کہا۔

"ایک نہ ایک دن تمھیں ضرور بتا دے گا ——" اتنے میں موہن ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پیکٹ لئے آ پہونچا۔

"اے منو۔ یہ لو تمھارے لئے کچھ پھل لایا ہوں۔ یہاں ہم تمھاری کچھ خاطر تو کر نہیں سکتے۔ دوکانوں میں بھی کیا ملتا ہے۔ مٹھائیاں تو بڑی زہریلی چیز ہوتی ہیں۔ تم پھل خوب کھایا کرو اور آدھ سیر دودھ روز پیا کرو۔ بڑے دبلے لگ رہے ہو۔ اور اب جاؤ تمھیں آرام کرنا چاہئے۔ پانی رک گیا۔ گھر پہنچ کر جلدی سے سو جانا"

منو نے سب قلیوں سے "جے دیوا" کہی اور جلدی سے باہر نکل آیا۔ وہ موہن کا مشکور تو ضرور تھا مگر اس سے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ ان دونوں قلیوں کی بات اس نے غور سے سنی تھی۔ اور بڈھے قلی کی باتوں سے جو ماحول پیدا ہو گیا تھا وہاں سے اس کا ذہن بمبئی کی اس شام پر پہونچ گیا تھا جب رتن کو فیکٹری سے جواب مل گیا تھا اور تین صاحب لوگ قلیوں سے بات چیت کرنے آئے تھے۔ اور وہ سوچنے لگا کہ کیا موہن بھی اسی قسم کا کوئی صاحب تھا؟ گھر جاتے وقت تمام راستے اُسے موہن کی ملاقات سے ایک خاصی گرمجوشی محسوس ہوتی رہی۔

جمعہ کے دن، جو ناچ کا دن تھا، منو پر بھی اپنی مالکہ کے اشتیاق اور خوشی کا کافی اثر تھا۔ خوشی کے مارے وہ زمین پر پاؤں نہیں رکھ رہا تھا، بارش

کے بعد کھلی ہوئی دھوپ میں دیودار کی خوشبو سونگھ کر اور گرتے ہوئے آبشاروں کا نغمہ سن کر وہ جیسے مست ہوا جا رہا تھا۔

اور آخر کار جب اس کی مالکہ بہت طویل عرصہ تک خوب سنگار پیار کرنے کے بعد باہر رکشا میں بیٹھنے نکلی کہ سیسل ہوٹل جا کر میجر صاحب کو ساتھ لیں، تو منو کو بہت ہی خوشی اور فخر محسوس ہوا خاص کر اس وجہ سے بھی کہ مسز مینورنگ نے خوشی سے اتنا کر بڑے بھولپن سے اس سے پوچھا کہ۔

"میں خوب صورت لگتی ہوں؟" اس کے گال میں چٹکی بھی لی اور جب منو نے کہا "ہاں میم صاحب! بہت ہی اچھی" تو وہ کھی کھی کر کے ہنس پڑیں۔

منو نے نئے سرے سے زور لگا کر رکشا کھینچا، اور جب کھانا تک ڈنر ہوتا رہا وہ بڑی بے صبری سے دوسرے قلیوں کے ساتھ بیٹھا اپنے کپڑے سکھاتا رہا جو پسینہ سے بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئے تھے۔ پہاڑ کی جھلملاتی روشنیوں کے پاس سے جب وہ رکشا کھینچتا دوڑتا جا رہا تھا تو اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سیسل ہوٹل سے وائسرائے کا محل بہت دور نہ تھا کیونکہ اسے میم صاحب کی گرما گرم صحبت بھی تو حاصل تھی۔

اور جب وہ سینکڑوں اور قلیوں کے ساتھ بیٹھا شملہ کی حسین اور خوش نصیب عورتوں کو رکشاؤں میں آتے اور کھلے ہوئے دروازوں سے اندر سجے ہوئے کمروں میں جاتے اور شاندار وسیع برآمدوں میں سے ہو کر وائسرائے کے لان میں جاتے دیکھ رہا تھا تب تو اس کا اشتیاق اور گرمجوشی اور بھی بڑھ گئی۔ جتنی میمیں تھیں وہ سب باریک ریشمی لباس پہنے تھیں، جن کے نیچے کے دامن ان کی ایڑیوں سے بھی نیچے لٹک کر زمین پر جھاڑو دے رہے تھے

انھوں نے جو چادریں یا سمور اوڑھ رکھے تھے ان سے بھی ان کی گردنیں اور کندھے نہ تو سردی سے محفوظ تھے نہ قلیوں کے گھورنے سے۔ لیکن صاحب لوگ ضرورت سے زیادہ کپڑے پہنے تھے، لمبے لمبے کالے کوٹ، مومی کالر اور قمیصیں اور تمغوں کی قطاریں!۔

اور بعض تو عجیب ہی کپڑے پہنے تھے، منو کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ یہ کپڑے ان لوگوں نے آخر پہنے کیسے ہوں گے، کیونکہ ریشم کے برجیس اس بڑی طرح ان کی پنڈلیوں میں چپکے ہوئے تھے اور درودزی کی صدریوں کا گلا اتنا اونچا اور سخت لگتا تھا۔ کبھی کبھی ہمارے بھی ہیرے جواہرات ٹکی ہوئی پوشاکیں پہنے آتے اور منو کو ان کے لڑکوں کو دیکھ دیکھ کر بڑی حسد ہوتی کہ وہ کتنی عمدہ اچکنیں اور چوڑی دار پاجامے پہن کر ناچ میں آئے تھے۔

چند پادریوں کی آمد پر قلیوں میں کافی مذاق رہا کیونکہ وہ تو کبھی سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ یہ لمبی لمبی عباؤں اور ڈاڑھیوں والے آخر ناچ میں کیا کرنے آئے تھے۔

ابھی داخل ہی ہو رہے تھے کہ بینڈ نے "گاڈ سیو دی کنگ" بجا دیا۔

"یہ ناچ کیا ہی بہادر ہوتے ہیں" ایک قلی بولا

"ہاں" دوسرے نے جواب دیا "اور اس میں ان لوگوں کا روپیہ بھی کافی خرچ ہوتا ہے۔ ہمارے صاحب نے دو ہزار روپیہ خرچ کئے جب کہیں کاشانی فرغل، مخمل کا کوٹ اور ساٹن کے برجیس تیار ہوئے"

"میری میم صاحب نے اپنی فراک پر تین سو روپے خرچ کئے" منو نے بڑے فخر اور گرمجوشی سے کہا۔

"اور پھر ٹکٹ لینے کی مصیبت اوپر سے ہے"، موہن بولا۔
"ایسا لگتا ہے تمھیں یہ سب تماشہ پسند نہیں آتا"، پہلے قلی نے کہا۔
"ہاں میں ان لوگوں کو جانتا جو ہوں اسی لئے نہیں پسند آتا"، موہن نے جواب دیا۔ "اب دیکھو نا یہ لوگ اتنا روپیہ خرچ کر کے ایسی جگہ جاتے ہیں اور ایسے لوگوں سے ملتے ہیں جن سے ملنے کو دراصل ان کا جی نہیں چاہتا۔ کیونکہ ان لوگوں میں جو ذات پات کا فرق ہے وہ ہم لوگوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ اگر کسی انگریز عورت کا میاں بارہ سو کماتا ہوگا تو وہ کسی ایسی عورت کے یہاں کارڈ نہ چھوڑے گی جس کا میاں پانچسو کماتا ہوگا۔ اور پانچسو کمانے والے کی بیوی تین سو کمانے والے کی بیوی کو حقارت سے دیکھے گی۔ امیروں میں محبت اور مروت کہاں! یہ لوگ دل سے ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملتے۔ یہ تو محض ایک رسمی چیز ہے جو ٹنڈے لاٹ نے کی ہے تاکہ ہم پر حکومت کرنے والوں کی شان و شوکت ظاہر ہو۔ یہ عورتیں سب پسینے میں تر ہوں گی، ان کے اندر کے کپڑے سب شرابور ہوں گے۔ مرد الگ ان چست پاجاموں سے عاجز دوسروں کی بیویوں سے معاشقہ کرتے پھرتے ہوں گے۔ اور پھر بعد میں کہیں گے کہ ناچ بڑا ہی اچھا تھا اور ڈیوکو میرا چائے پیتے جائیں گے اور تم لوگ اسی طرح بھوکے جھک مارتے رہو گے"۔
"یہ سب بات تم کیسے کہہ سکتے ہو"، پہلا قلی بولا "تمھیں صاحب لوگوں کی زندگی کا حال کیا معلوم!"
"کیسے کہہ سکتا ہوں؟ صاحب لوگوں کی زندگی کا حال مجھے

کیا معلوم؟" موہن نے جواب دیا "میں ایک بیرے کو جانتا تھا جو ایک کرنل کی بیوی کا ملازم تھا۔ یہ کرنل فوجی ہیڈ کوارٹر جاکھو میں رہتا تھا۔ اس کی عمر کوئی پچیس سال کی ہوگی، سنہرے بال چھوٹے سے قد، بڑی پیاری سی لڑکی تھی۔ اور وہ کرنل پچپن برس سے بھی زیادہ کا تھا۔ اس عورت نے صرف کرنل کے روپے اور پوزیشن کی وجہ سے اس سے شادی کر لی تھی۔ کیونکہ یہ بیرا غلام کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا کہ جب وہ کرنل اُسے ہاتھ لگاتا تو وہ پیچھے ہٹ جاتی۔ وہ موٹا سا ادھیڑ عمر کا آدمی، بڑا سا تھوبڑا ایسا منہ، ویسے تو نیک تھا، مگر میم کو اس سے نفرت تھی۔

"تو بھئی پھر وہ اس کے ساتھ بڑی رنجیدہ رہا کرتی تھی۔ اور جیسے ہی وہ صبح دفتر چلا جاتا بس شراب پینا شروع کر دیتی تھی، پھر وہ گول کمرے میں آجاتی اور غلام کو کام کرتے دیکھا کرتی، بس ایسے دیکھا کرتی کہ وہ گھبرا جاتا کیونکہ وہ تقریباً ننگی بھی ہوتی تھی۔ بالکل برہنہ جسم پر بس صرف ایک ڈریسنگ گاؤن پہنے رہتی تھی۔ اور اس سے عجیب عجیب سوال کرتی کہ تمھیں عورتیں پسند ہیں، تمھاری شادی ہوگئی ہے اور اور کچھ کچھ پوچھا کرتی۔ غلام نے اُسے بتایا کہ وہ اپنے گاؤں میں ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا لیکن اس کے ماں باپ نے اس کی شادی غلام سے نہیں ہونے دی تھی۔ لیکن اُسے ابھی تک امید تھی کہ کبھی نہ کبھی وہ ضرور گاؤں جائے گا اور اس سے شادی کر کے اس کے ساتھ زندگی بسر کرے گا۔ ایک دن وہ میم خوب شراب پیئے گول کمرے میں آگئی اور یکایک غلام کو پکڑ کر کہنے لگی "میں اس عورت سے اچھی ہوں جو تمھارے گاؤں کی ہے، جسے تم چاہتے ہو، دیکھو میں تو سفید فام عورت ہوں اور پھر کرنل کی بیوی بھی ہوں میں کبھی ایک شاعر سے محبت کرتی تھی اور وہ بھی مجھے چاہتا تھا، مگر میں نے

اس سے شادی نہیں کی کیونکہ اس کے پاس دولت کی بڑی کمی تھی۔ اب میں پچھتاتی ہوں، لیکن تم مجھے لے سکتے ہو۔ مجھے تمھاری ضرورت ہے"

"مجھے کیا ہے، چاہے آپ کرنل کی بیوی ہوں چاہے کوئی ہوں میم صاحب!" غلام نے کہا "مجھے آپ پر ترس ضرور آتا ہے، مگر مجھے آپ سے محبت نہیں ہے"۔ اور یہ کہہ کر اس نے اُسے دھکیل دیا۔

"پھر اُسے ڈر لگا کہ کہیں یہ میم کوئی جھوٹا الزام لگا کر پکڑوا نہ دے اگر اس کی بات نہ مانی۔ لیکن اس نے پھر بھی دل مضبوط کیا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ وہ اس کے پیچھے روتی ہوئی دوڑی "ارے جاؤ نہیں۔ ارے مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ آجاؤ۔ آجاؤ واپس" لیکن وہ بھاگا تو بس پھر بھاگ ہی گیا اس وقت سے غلام پر ان امیروں کی شان و شوکت کا ذرا رعب نہیں پڑتا جو خواہ مخواہ اپنے آپ کو دھوکا دیتے رہتے ہیں کہ ہم بڑے خوش ہیں۔ اور میں نے بھی اپنے یورپ کے تجربے سے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ امیر لوگ صرف لہو و لعب، عیش و عشرت کے پجاری ہوتے ہیں"

"یہ ان کا ناچ کیسا عجیب ہوتا ہے" پہلے قلی نے موہن کا قصہ سن کر کہا "آخر کسی عورت کو لے کر ادھر ادھر دھکیلنے سے کیا مطلب؟"

"یہ ایک قسم کا معاشقہ ہے۔ لیکن اب تو اس میں صرف کھیل تماشہ باقی رہ گیا ہے اور محبت کا خیال نہیں کیا جاتا۔ سوائے اس کے کہ ایسا کرنے سے ان لوگوں کی ٹھنڈی طبیعتوں اور مردہ دلوں میں کسی قدر گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر آپس میں پیار ہونے لگتا ہے۔ کونوں کھدروں میں جا کر باتیں ہونے لگتی ہیں اور یا تو شادی کی صلاح ہو جاتی ہے یا یوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ سوتے ہیں۔ البتہ تمھارے ایسے بنگلیوں کے واسطے

عورتوں کے ساتھ سونے کو پہلے ان کے ساتھ ناچنا ضروری نہیں ہے۔ تم ان راجاؤں، مہاراجاؤں اور کرنلوں سے کہیں اونچے ہو لیکن پھر بھی تم رکشا کھینچتے رہتے ہو۔"

"تو تم بھی تو کھینچتے ہو،" ایک قلی بولا۔

"نہ کھینچوں تو تم جیسے لوگوں سے بات کا موقعہ کہاں ملے،"

"دیکھو وہ سب جوڑے جوڑے مل کر باغ میں ٹہل رہے ہیں" منو بولا۔

"ہاں،" موہن نے کہا "مگر باغ کی طرف زیادہ غور سے مت دیکھنا ورنہ کچھ ایسی بات دکھائے دے گی کہ تمہیں اچھی نہ لگے گی۔"

"ارے تو مجھے کیا ہے وہ کچھ ہی کرتی ہے۔ میں تو خالی اس کا نوکر ہوں،" منو نے بھولے پن سے کہا اور پھر نیچے دیکھنے لگا جہاں سولن کی ریشمیں جگمگا رہی تھیں۔ وائسرائے کے محل کے سازوں کی چھنا چھن سنتے سنتے اسے ذرا تھکن سی محسوس ہونے لگی اور اس نے جمائی لی۔ موہن نے اپنا سوتی شال اس کو اڑھا دیا اور کہا "تمہاری طبیعت اچھی نہیں لگتی۔ ذرا سو جاؤ۔"

"نہیں نہیں میں ٹھیک ہوں،" منو نے کہا لیکن یکلخت اس کے گلے میں آنکھ گیا۔ زور سے وہ ہچکی کے ساتھ کھانسی آنے لگی اور پھر خون کی کلیاں کرنے لگا۔

"ارے بے وقوف! ارے احمق!" موہن اس پر برسنے لگا "میں نے تجھ سے مشورے ہی میں کہا تھا کہ تو بیمار ہے یہ پہلی دفعہ آیا ہے خون؟"

منو نے سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔

"تو پھر تو نے اپنی میم سے کہا کیوں نہیں کہ تو رکشا نہیں چلا سکتا"

تو نے اس سے کہا کہ تو خون تھوک رہا ہے ؟ "

منو چپ رہا

موہن کی متفکر آواز سن کر بہت سے قلی اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر منو کے چاروں طرف جمع ہو گئے ۔ وائسرائگل لاج کے دروازہ پر جو سپاہی پہرہ دے رہا تھا، اس نے دیکھا کہ کچھ گڑبڑ ہے ۔ وہ لفٹ رائٹ کرتا آگے بڑھا اور سخت لہجے میں پوچھا " کون ہے ؟ "

" ایک لڑکا بیمار ہو گیا ہے سرکار " ایک قلی نے اطلاع دی

" فوراً لے جاؤ اُسے ۔ ورنہ ایڈی کانگ صاحب یہاں پہونچ جائیں گے " سپاہی نے حکم دیا ۔ موہن نے جلدی سے منو کو اپنی پیٹھ پر لادا اور اپنے ساتھیوں سے یہ کہہ کر کہ جاتے وقت اُتار دیں گے تم لوگوں کو ہماری ضرورت نہ ہوگی " وہ اُسے لئے ہوئے گھر پہونچ گیا ۔

جب مسٹر مینورنگ میجر مارچنٹ کے ساتھ ناچ سے نکلیں تو انھیں یہ معلوم کر کے بڑی پریشانی ہوئی کہ منو کو گھر لے جایا جانا پڑا کیونکہ وہ خون تھوک رہا تھا ۔ ناچ میں بھی ان کو کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی تھی، سوسائٹی میں اوپر پہنچنے کی کوشش ناکامیاب رہی تھی، انھیں ہندستانی مجمع کے ساتھ بھیڑ دیا گیا تھا اور صرف ایک انگریز فوجی افسران کے ساتھ ناچا تھا ۔ چنانچہ انھوں نے سوچا تھا کہ میجر صاحب کو ساتھ لے کر گھر آئیں اور برانڈی کی ایک بوتل کے سہارے ناچ کی اس مایوسی کو بھلا دیں گی ۔ لیکن اب تو وہ بڑی ہی رنجیدہ اور پریشان ہوئیں اور جب میجر صاحب نے منو کا معائنہ کیا اور نہایت مایوسانہ رائے دی تب تو وہ رونے ہی لگیں ۔

ہیلتھ آفیسر کے حکم کے مطابق دوسرے دن منو کو ایک تین

کمروں والے چھوٹے سے جھونپڑے میں علیحدہ کر دیا گیا جو چھوٹے ٹیلے کے ڈھلوان حصے پر بنا ہوا تھا۔ یہاں اور بھی دو قلی تھے جن کو سل ہی تھی۔ موہن اس کی نگہداشت کرنے آیا کرتا تھا۔ منو سے بالکل آرام کرنے کو کہا گیا تھا اور کچھ دن کھانسی آنے اور خون تھوکنے کے بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ مشکل یہ تھی کہ وہ ذرا سا کھڑا ہوتا یا چلتا یا کچھ بھی محنت کرتا تو تھک جاتا تھا چنانچہ وہ دن بھر ایک نیچے سے پلنگ پر موٹا کمبل اوڑھے پڑا رہتا تھا۔

پہلے چند دن مسز مینور نگ اس کو دیکھنے آیا کرتی تھیں اور پھولوں اور پھلوں کے تحفے بھی لایا کرتی تھیں۔ اور ذرا بناوٹ لگاوٹ سے اس کی دیکھ بھال بھی کرتیں کہ اس کا دل بڑھ جائے "تم اچھے ہو جاؤ گے۔ تمھیں کوئی بیماری نہیں ہے۔ صرف کمزوری ہے"، کبھی کبھی ان کا ضمیر ان کو ملامت کرتا تھا کہ ناحق اس سے اتنا کام لیا اس لئے بھی وہ اور مہربان تھیں۔ لیکن انھیں مہربان ہونے کون دیتا تھا۔ میجر نے ان کو جھونپڑے میں جانے سے قطعی روک دیا، بلکہ یہاں تک دھمکی دی کہ اگر انھوں نے نوکر سے زیادہ میل ملاپ رکھا تو وہ ان کو بھی الگ کرنے پر مجبور ہوں گے۔ چنانچہ وہ بالکل چھوٹ گئیں اور دل ہی دل میں کڑھتی رہیں، مسز مینور نگ اور میجر مارچنٹ سے دوستی کے آخری ایام میں منو کو میم صاحب کی طرف سے بڑا رنج اور شکایت ہو گئی تھی۔ اور جب وہ خون تھوکنے لگا اور موت اس کے سامنے نظر آنے لگی تب تو وہ اُن سے نفرت ہی کرنے لگا تھا۔ لیکن اب جب کہ وہ موت اور زندگی کے درمیان، بستر پر پڑا تھا تو مسز مینور نگ کی طرف سے اس کا دل صاف اور نرم ہو گیا۔ اور یہی حالت اوروں کے ساتھ بھی ہوئی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جسم کے اعصاب نے، اب کمزوری کے

عالم میں اس حقارت کو قبول کر لیا تھا جسے وہ اپنی طاقتور اور چلتی ہوئی حالت میں کبھی نہ مانا تھا۔

اب منو بڑی ہی حیرت انگیز طور پر نرم اور محبتی لگتا تھا، اس کا چہرہ اندر دھنس کر رہ گیا تھا، آنکھیں سیاہ گہرے گڑھوں میں سے باہر نکلی پڑتی تھیں اور مضمحل نظروں سے پہاڑ کی گہرائیوں کو دیکھا کرتی تھیں اس کے پورے جسم کو اس بات کا احساس تھا کہ زندگی کے دن پورے ہوئے، دن ڈھل گیا اور رات نزدیک ہے۔ جب کبھی اُسے زیادہ خون آجاتا تو وہ بے حد ڈر جاتا، مگر جب دھوپ چمکتی اور سانس کسی قدر اچھی طرح آنے لگتی تو وہ اپنے آپ میں گم ہو جاتا۔ وہ اچھا ہو جانا چاہتا تھا۔ اور جب اُسے نہ صرف سانس اچھی طرح آتی بلکہ کھانسی بھی نہ آتی تب اس کا دل چاہتا کہ اور بھی اچھا ہو جائے۔

دل ہی دل میں وہ طرح طرح کے منصوبے گڑھا کرتا۔ رتن نے اُسے لکھا تھا کہ بمبئی آجائے۔ ٹریڈ یونین میں ایک چھوٹی سی جگہ معمولی تنخواہ کی تھی جس کے ذریعہ سے پٹھان سود خوروں فورمین اور فیکٹری والوں سے لڑا جائے گا۔ منو کا دل چاہتا تھا کہ چلا جائے۔ اور چونکہ کسی قدر گرمی ہو گئی تھی پھر اور کبھی بہت ستاتے نہیں تھے لہٰذا وہ دن بدن بہتر ہونے لگا اور اس دن کا انتظار کرنے لگا جب وہ پیدل بمبئی جا کر اپنی طاقت آزمائے۔

لیکن ایک دن پھر بہت سا خون آگیا۔ اور وہ بستر سے اٹھ بھی نہ سکا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگے۔ اس مرتبہ خون آنے کے بعد ذرا سی کھانسی آنے سے وہ مایوس ہو جاتا تھا۔ اب تو اس کی ساری کوشش یہ تھی کہ حالت اس سے بدتر نہ ہو۔ بیماری اور تکلیف چلتی ہی

گئی۔ کبھی کبھی بہتر ہو جاتی تھی۔ ایک گھنٹہ دھوپ نصیب ہو جاتی تھی تو نعمت معلوم ہوتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب ہر ہفتہ دیکھنے آتے تھے۔ لیکن ان کے بشرے سے کچھ اطمینان ظاہر نہ ہوتا تھا۔ منو کو میجر مارچنٹ کے افسردہ چہرے کے باوجود معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ لہٰذا آج کل اپنے وجود اور اپنی پرانی یادوں کے سوا اس کے لئے دنیا میں اور کچھ نہ تھا موہن سے البتہ کچھ تسکین ملتی تھی کیونکہ وہ آتا، پلنگ پر بیٹھتا اور شام کو سر بھی دبا دیا کرتا تھا۔ پھر بارش ہونے لگی اور آس پاس کے پہاڑوں میں بادل دھمکی دینے کے انداز میں منڈلانے لگے۔

پھر مطلع صاف ہو گیا۔ اور منو لیٹا ہوا نیچے وادی میں اگی ہوئی جَو کی فصل کو دیکھا۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ ماضی کے اوراق اس کے ذہن میں کھلتے چلے جاتے، یادیں تازی ہو جاتیں، عجیب اتر بتر بکھری سی یادیں جیسے کوئی خواب ہو۔

سہ پہر کی خنک ہلکی ہوا اکثر طوفان میں تبدیل ہو جاتی۔ منو کا سینہ زیادہ جکڑتا جاتا۔

پھر مرض میں کسی قدر افاقہ ہو گیا۔ چند دن اچھے گذر گئے۔

"آخر میں نہیں مروں گا" وہ اپنے آپ کو اطمینان دلاتا۔

پانی برسنے لگا اور منو کو پھر شک ہوا کہ میں اچھا بھی ہوں گا یا نہیں۔ وہ تھکن سے چور چور، ہلکان و پریشان، وادی کی تصویر بنا، اپنی جھوٹی آنکھوں سے موہن کو تکتا رہا، جیسے اپنے دوست کے زندہ جسم کو چھو کر وہ زندگی کی حرارت پا سکے گا۔

"ٹھیک ہے منو بھیا۔ گھبراؤ مت۔ تم تو بڑے بہادر لڑکے ہو"

موہن اُسے تسلی دیتا رہا۔

منو نے موہن کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنی رگوں کے خون کو ایسا محسوس کرنے لگا جیسے وہ کوئی لہر ہو جو اتنی دور پہونچ جانا چاہتی ہو جتنی اب تک کبھی نہ پہونچی تھی۔

لیکن ایک رات کو پچھلے پہر وہ چل بسا، زندگی کی لہر اب اتنی پیچھے ہٹ گئی تھی کہ آگے آنا ممکن نہ تھا۔ (زندگی کی ابھرتی ہوئی لہر گہرائی میں دفن ہو چکی تھی)۔۔۔